فہرست مضامین۔ مجموعہ تقاریر حصہ چہارم

مجموعہ تقاریر

الحاج سید العلماء سرکار علامہ سید علی نقی النقوی لکھنوی مدظلہ العالی



دیباچہ

گذشتہ تین سال میں راقم الحروف نے سید العلما علامہ سید علی نقی النقوی لکھنوی کی تقاریر دل پذیر کے تین مجموعے مرتب کیے جنکو جناب شیخ راحت علی صاحب مالک امامیہ کتب خانہ لاہور نے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ اس مرتبہ پبلشر موصوف کی فرمائش تھی کہ ۲ دو مجموعے مرتب ہوں تاکہ گذشتہ پانچ سال میں علامہ صاحب کی جو تقریریں لاہور میں ہوئی ہیں ان سب کی طباعت کا شرف انہیں حاصل ہو جائے۔ راقم الحروف نے اپنے معاشی مشاغل کے باوجود اس مرحلہ کو طے کرنے میں بفضلِ ایزدی و بتائید چہاردہ معصومین علیہم السلام کامیابی حاصل کر لی۔ بحمد اللہ اس محرم پر تقاریر کے دو مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آرہے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ تقاریر میں بارہ مجلسیں ہیں جن میں مختلف آیات کے ماتحت متعدد اہم دینی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر مجلسیں حسب سابق عزاخانہ زینبیہ لٹن روڈ۔ گلستان زہرا ایبٹ روڈ۔ اور ماڈل ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوئیں کچھ مجلسیں انفرادی طور پر مختلف مقامات پر ہوئیں۔ بہر کیف اثنا عشر مجالس کا یہ مجموعہ صاحبانِ ذوق کی تواضع علمی کیلئے حاضر ہے۔ سرکار سید العلما کے اندازِ تکلم کی دل نشینی اور معیارِ سخن کی بلندی کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ آپکے بیانات میں مفاہیم کی گیرائی و گہرائی گفتگو کی سادگی و پُرکاری منطقی گرفت کی مضبوطی۔ علم کلام کی فنکارانہ چابکدستی معقولات کی فراوانی اور استدلال کے استحکام کا ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے دقیق سے دقیق پیچیدہ سے پیچیدہ اور باریک سے باریک علمی مسئلہ کو نہایت سادہ عام فہم اور دل نشین انداز میں پیش کرنا یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ پروردگار عالم بتصدق آئمہ معصومین علیہم السلام سرکار موصوف کو تا دیر صحیح و سلامت رکھے۔ اور ہمیں ان سے استفادۂ علمی کے بیش از بیش مواقع عنایت فرمائے۔ آمین

(مولوی) سید افسر عباس زیدی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ
عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ اَبِى الْقَاسِمِ
مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ
الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ
اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِىْ كِتَابِ الْمُبِيْنِ وَهُوَ اَصْدَقُ
الصَّادِقِيْنَ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۔

مجلس اوّل

اقسامِ انسان حیثیتِ انسان مقصدِ زندگی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

مختصر سورہ ہے قرآن مجید کا اس میں بسم اللہ کے بعد ارشاد ہو رہا ہے قسم ہے عصر خاص کی کہ یقیناً انسان نقصان میں ہے مگر وہ جو ایمان لائیں نیک اعمال کریں اور ایک دوسرے کو حق کی ہدایت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی دعوت دیں ۔ عام طور سے ہم جب کسی بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں تو اس بات کو بقسم کہتے ہیں مگر یہ کلام اس کا ہے کہ جو اُسے مانتا ہے وہ سوا سچائی کے کوئی دوسرا تصوّر اس کے بارے میں کر ہی نہیں سکتا لہٰذا اُسے یقین دلانے کے لئے قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ پھر قرآن مجید میں جا بجا کیوں قسمیں کھائی جاتی ہیں تو میں سمجھتا ہوں اور آپ غور کیجئے تو یہی ذہن نشین پہلو ہے کہ اس بات کی اہمیّت ظاہر کرنے کے لئے کہ جو کہنی ہے قسمیں کھائی جاتی ہیں ۔ یعنی بات روا روی میں کہنے کی نہیں ۔ مگر جناب والا ایک مجبوری ہے اور مجبوری کبھی بسبب نقص ہوتی ہے کبھی بسبب کمال ہوتی ہے ۔ مثلاً خالق مجسّم ہو کر کبھی سامنے نہیں آسکتا ۔ یہ مجبوری کسی نقص کی بنا پر نہیں ہے بلکہ

کمال کی بنا پر ہے۔ ویسے ہی یہ جو میں نے کہاکہ مجبوری ہے تو ایسی ہی مجبوری ہے وُہ مجبوری یہ ہے کہ عموماً جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے وہ قسم کھانے والے سے کچھ اُونچا درجہ رکھتی ہے جیسے آپ معصومین کی قسم کھاتے ہیں حضرت ابوالفضل العباسؑ کی قسم کھاتے ہیں اور جو قسم شرعی ہے یعنی احکامی قسم۔ کفارہ وغیرہ جس پر جاری ہے وہ اللہ کی قسم ہے۔ تو جو چیز اپنی نظر میں اپنے سے بالاتر ہوتی ہے اس کی قسم کھائی جاتی ہے مگر یہاں متکلم وہ ہے جس سے بالا تر کوئی ہے ہی نہیں تو وہ ایسے کو تو نہیں لاسکتا جو اس سے بالا تر ہو۔ وہی تو میں نے مجبوری کہی تھی۔ اس سے بالاتر عالم تصوّر میں کوئی چیز ہے ہی نہیں تو اب یہ جز محفوظ نہیں رہ سکتا مگر جس چیز کی قسم کھائی جائے وہ اپنی جنس میں امتیازی چیز ہونی چاہیئے یعنی جس طرح اُس بات کی اہمیّت ثابت ہوتی ہے قسم کھانے سے اسی طرح جس کی قسم کھائے اسکی بھی اہمیت ظاہر ہوتی ہے اور اب ان قسموں سے ایک اور تصوّر ختم ہوتا ہے۔ وُہ ایک مکتبِ خیال کا تصوّر ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا بھی شرک ہے۔ جہاں بہت سی باتوں پہ شرک کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اسی طرح یہ بھی ہے کہ اللہ کے سوا کسی دُوسرے کی قسم کھانا۔ یہ شرک ہے۔ لیکن اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا اگر شرک ہو تو پھر اللہ کے کلام میں تو اللہ کے سوا کسی کی قسم نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ جو چیز ہمارے لئے شرک ہو اللہ خود اسکو کیسے گوارہ کر سکتا ہے۔ تو قسمیں جو کھائی جاتی ہیں وُہ کبھی اس شے کی عظمت کے اظہار کے لئے اور کبھی بنظر محبوبیت بھی قسم کھائی جاتی ہے۔ جیسے تمہارے سر کی قسم۔ یہ آپ کی زبان پر جاری ہے قسم یا نہیں۔ آپ کے سر کی قسم۔ تو مجھے قرآن مجید میں اس کی بھی نظیر ملتی ہے۔ خالق نے رسولؐ سے خطاب کرکے کہا ہے سورہ حجر چودھواں پارہ

لعمرك ۔ قسم آپ کی جان کی یہ گُمراہ لوگ اپنی گمراہی کے ایک عجیب نشے میں مبتلا ہیں ۔ یہ خالق نے قسم کیوں کھائی ہے ۔ لعمرک ۔ خود رسول سے خطاب کر کے بالکل محبتانہ انداز ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ محب حبیب سے بات کر رہا ہے ۔ صلوٰۃ ۔

تو اب اگر خالق ایسے کی قسم کھا سکتا ہے جو اُسے محبوب ہے تو ہم بھی ان کی قسم کھا سکتے ہیں جو ہمیں اس کے حکم سے محبوب ہیں ۔ تو اب ایک قسم تو بنظر محبت قسم کی ہے جو لعمرک میں ہے ۔ رسولؐ سے خطاب ۔ اس کے علاوہ وہی ۔ جو شے اپنی جنس میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہو مخلوقاتِ الٰہیہ میں آفتاب و ماہتاب کو قسم کھانے کے لئے منتخب کیا گیا وَالشَّمْسِ وَ ضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۔ بے شک سُورج اور چاند اپنی جنس میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں مگر کبھی چھوٹا بھی اعزاز میں بڑوں کے برابر ہو جاتا ہے کسی خاص خصوصیّت کی بنا پر چُنانچہ ارشاد ہوا وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ۔ مگر کب جب وہ کسی آستانے کی طرف جُھک رہا تھا ۔ صلوٰۃ

تو جس طرح بہت سی چیزوں کو یہ شرف دیا گیا کہ ان کی قسم کھائی جائے اسی طرح ظرف مکان کو اس شرف سے محروم نہیں کیا گیا مگر ہر مکان نہیں ۔ مکان خاص ۔ وَهٰذَا الْبَلَدُ الْاَمِیْنِ ۔ قسم ہے اس شہر کی جو محل امن و امان ہو ۔ یعنی امن اُسے اتنا پسند ہے کہ جو محل امن ہو اسکی قسم کھاتا ہے ۔ مگر دُوسری جگہ بتا دیا کہ یہ مکان کو شرف بہ اعتبار مکین ملا ہے ۔ ارشاد فرمایا ۔ لااقسم بهٰذا البلد وانت حلّ بهٰذا البلد ۔ اس شہر کی یونہی قسم نہیں ہے بلکہ اسلیئے کہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں ۔ صَلوٰۃ ۔

اب جسطرح ظرف مکان کو یہ عزّت عطا ہوئی اسی طرح ظرف زمان کو

بھی اس شرف سے محروم نہیں رکھا گیا۔ مگر جیسے مکان ہر مکان نہیں بلکہ وُہ مکان جو اس کے حبیب خاص سے تعلق رکھتا ہو۔ اسی طرح عصر جس کے معنی زمانے کے بھی ہیں۔ اور دن کے ایک خاص حصّہ کا بھی نام ہے عصر۔ اب قرآن میں تو لفظ عصر ہے۔ اپنی طرف سے کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ ہے یا یہ ہے۔ بہرحال عصر جو بھی ہو لیکن ہر عصر نہیں بلکہ عصر خاص اسی لئے ترجمہ میں مَیں نے یہی کہا کہ قسم ہے عصر خاص کی۔ کوئی کہے یہ خاص کے معنی کس لفظ سے پیدا ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ لفظ عصر پر جو یہ الف لام داخل ہے۔ عصر کوئی سا زمانہ اور العصر عصر خاص۔ کوئی کہے اسکی نظیر۔ تو نظیر آپ کی جانی پہچانی ہوئی ہے۔ یوم کوئی سا دن اور الیوم۔ کیا الیوم کے لئے یاد دلانے کی ضرورت ہے۔ الیوم اکملت لکم دینکم۔ تو یہ کیا ترجمہ ہوتا ہے کہ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا ہے۔ اب ہر مکتبِ خیال کا انسان غور کرے کہ کتنا ہی حفظ کر لیجئے ان الفاظ کو آج۔ الیوم اکملت لکم دینکم۔ اس کو حفظ کر لیجئے ترجمہ بھی حفظ کر لیجئے آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ لیکن اگر تاریخ نہ دیکھئے کہ وہ آج کونسا ہے۔ تو کیا قرآن سے سمجھ میں آئے گا۔ بتائیے کوئی قرآن کو کافی سمجھنے والا۔ صلوٰۃ۔ قرآن کہہ رہا ہے۔ الیوم اکملت۔ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا ہے۔ اگر معلوم نہ ہو کہ وُہ آج کونسا دن ہے تو بتائیے قرآن سے کیا سمجھ میں آئے گا۔ میں کہتا ہوں کہ کاش قرآن کے سمجھنے ہی کی خاطر اس دن کو یاد رکھتے۔ تو بس جیسے یوم کوئی سا دن۔ اور یہ الف لام اشارہ کے لئے ہوتا ہے۔ کسی فرد خاص کی طرف۔ اسی سے معنی پیدا ہوئے کہ آج کا دن۔ اسی طرح عصر کوئی سا عصر اور جب کہا والعصر تو وہ عصر خاص ہوا۔ تو اب یہ عصر خاص وہی ہو سکتا ہے جو اس کے حبیب خاص سے تعلق خاص رکھتا ہو۔ خواہ کوئی زمانہ ان سے تعلق خاص رکھتا ہو خواہ کوئی . . . .

وقتِ عصر تعلق خاص رکھتا ہو۔ اب میں نے کہا کہ قسم کھائی جاتی ہے اس بات کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے جو کہی جارہی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ بات کیا ہے وہ ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ میں نے ترجمہ یہ کیا کہ انسان نقصان میں ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ نقصان کونسا ہے۔ ایک نقص تو وہ ہے کہ جو ممکنات کی ہر شے میں ہے۔ سوائے اللہ کے باقی ہر چیز کمال ذاتی سے محروم ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جب وجود اپنا نہیں ہے تو یہ غیر ہے اور جب وجود ہی غیر ہے تو پھر کون کمال اپنا ہوگا۔ وجود سرچشمۂ کمال ہے۔ جب وجود اللہ کا عطا کردہ ہے تو ہر کمال بھی اللہ کا عطا کردہ ہے۔ تو اس بنا پر کائنات کی ہر شے میں یہ نقص ہے یعنی وہ کامل بالذات نہیں ہے۔ تو اگر یہ نقص ہے تو پھر انسان کی کیا خصوصیت۔ جو کہا گیا کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ یقیناً انسان گھاٹے میں ہے اور پھر اگر یہ نقص ہوتا امکانی نقص تو استثنا کی گنجائش نہیں تھی کہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سوا ان کے۔ وہ ایمان بھی لے آئے عمل صالح بھی کئے۔ پھر خدا تھوڑی ہوں گے رہیں گے تو مخلوق ہی۔ تو اگر وہ نقص امکانی ہوتا تو اس میں یہ استثنا کیسا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقص امکانی نہیں ہے۔ پھر یہ کیا ہے۔ حقیقت میں قرآن مجید میں تو نقص کی لفظ ہے ہی نہیں۔ ذرا غور فرمایئے میں نے ترجمہ میں وہاں نقص کہا اور اب بھی بے جھجک قرآن مجید میں جو لفظ ہے وہ نہیں کہوں گا کیونکہ وہ لفظ ہمارے ہاں تو ایک رشتہ کا نام ہے۔ خ س ر۔ اسکا جو مجموعہ ہوتا ہے وہ ہمارے ہاں ایک خاص رشتہ کا نام ہے تو اسی لئے جب آیت پڑھتا ہوں تو بھی وقف نہیں کرتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کہہ رہا ہوں تاکہ ہمارے اردو والے لفظ سے شباہت نہ ہوجائے۔ تو حقیقت میں وہاں نقص نہیں ہے وہاں تو خ س اور ر ہے۔ اب اس لفظ

کے جو خصوصیات ہوں ان کو دیکھنا چاہیئے۔ تو جب اس لفظ کی خصوصیت پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت میں کاروباری اصطلاح ہے۔ تجارت کی۔ اور مجمع میں ضرور ماشاءاللہ تجارت کرنے والے افراد بھی ہیں۔ تو ایک حقیقت ہے ان کو خوش کرنے کے لئے نہیں ہے کہ تجارت کچھ ایسی اللہ کو محبوب ہے کہ اس نے شروع سے آخر تک قرآن میں تجارتی اصطلاحیں صرف کی ہیں۔ یہاں تک کہ ایمان کا پیام دیا تو یہ کہا کہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ کیوں صاحبان ایمان کیا میں تمہیں بتاؤں ایسی تجارت جو تمہیں عذابِ الہیٰ سے بچائے وُہ یہ ہے کہ ایمان لاؤ۔ یہ کیا ہے یہ اس لئے ہے یعنی ان سے کہہ رہا ہے کہ کیا تمہیں ایسی تجارت بتاؤں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی قوم سے خطاب نہیں ہے جو بیکار رہنے کی عادی ہو بلکہ وُہ قوم ہے جو ذوق تجارت رکھتی ہے۔ ان سے انہی کی زبان میں بات کی جارہی ہے۔ تو اب یہ لفظ جو ہے یہی ر ب ح اور ر جسے میں اُردو میں نہیں کہہ رہا ہوں یہ لفظ حقیقت میں تجارت کی اصطلاح ہے۔ جب آپ تجارت کرتے ہیں تو شروع میں پیسہ ہوتا ہے جو تجارت میں لگاتے ہیں اسکو عربی میں راس المال کہتے ہیں اور فارسی میں اُسے سرمایہ کہتے ہیں اور ہمارے ہاں اصل پُونجی۔ جس سے کہ تجارت شروع کی جاتی ہے۔ اب کچھ دِن کے کاروبار کے بعد ایک صورت یہ کہ اس میں اضافہ ہو گیا۔ بڑھ گئی رقم۔ مثلاً ہزار روپیہ لگائے تھے اب مالیت اسکی ہو گئی دس ہزار روپیہ۔ اسے عربی میں کہتے ہیں رِبح۔ بڑی ح سے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ سب وہی تجارت کی زبان میں بات ہو رہی ہے۔ ان کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ تو عربی میں اسے ربح کہیں گے۔ فارسی میں اِسے

سُود کہیں گے ۔ ہم تو بیاج کو سُود کہنے لگے اُردو میں ۔ تو بیاج کو سود نہیں کہتے۔ اصل میں وُہ تجارت کا نفع ہے جسے سُود کہتے ہیں فارسی میں ۔ اور ہم اسے تجارت کا نفع کہتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی نفع تو دوا کا بھی ہوتا ہے ۔ یہ کوئی مفرد لفظ ہوئی۔ اس کے معنی ہیں کہ ہمارے پاس کوئی مفرد لفظ نہیں ہے اس معنی کو ادا کرنے کے لیئے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جب اضافہ ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کچھ دن میں جتنا تھا اس سے کم ہو گیا یا ختم ہی ہو گیا تو اسے کہیں گے گھاٹا اور فارسی میں کہیں گے زیاں۔ بر تراز اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی۔ سود جب اضافہ ہو۔ زیاں جب نقصان ہو۔ اس نقصان کو عربی میں کہتے ہیں خ س اور ر ۔ اور یہ ایک ایسی لفظ ہے جسے کہتے ہوئے میں ڈر رہا ہوں ایک ذرا سے فرق میں وہ ہماری جانی پہچانی لفظ ہو جائے گی یعنی اس کے بیچ میں ایک عدد الف لے آیئے اور آخر میں ہ لگا دیجئے تو ہو جائے گا خسارہ۔ اب یہ خسارہ ہم بھی سمجھ لیں گے حالانکہ وہ خ س اور ر اسمیں بھی ہے اب راز سمجھ میں آتا ہے کہ انسان ہی کو کیوں کہا گیا کہ انسان خسارہ میں ہے ۔ بات یہ ہے خسارہ وہیں ہو گا جہاں کوئی چیز ایسی ہو جس میں اضافہ کا بھی امکان ہو کمی کا بھی امکان ہو ۔ وُہ بجائے بڑھنے کے گھٹ جائے تو وہ ہو گا خسارہ۔ انسان کے علاوہ کائنات میں اور جتنی چیزیں ہیں وُہ یا اتنی پست ہیں کہ بلند نہیں ہو سکتیں یا اتنی بلند ہیں کہ پست نہیں ہو سکتیں ۔ ایک طرف ہیں جمادات، نباتات، حیوانات ۔ یہ سب نقص کے کچھ دائروں میں اسیر ہیں کہ اس سے اُبھر نہیں سکتے ۔ بلکہ یہ نام ان کے اسی نقص کے پہلو کے ہیں۔ یعنی جمادات کسے کہتے ہیں ۔ ایک چیز ہے اس میں جمیت ہے ۔ اپنے اجزائے وجود کو سمیٹے رہنا ۔ اگر اس کا نام جمادات ہوتا تو پودے بھی جمادات

ہوتے کیونکہ ان میں بھی جسمیت ہے پھر حیوان بھی جمادات میں ہے۔ ان میں بھی جسمیت ہے انسان بھی جمادات ہے اس میں بھی جسمیت ہے۔ پھر جمادات کون۔ جس میں بس جسمیت ہے اور کچھ نہیں۔ جسمیت ہے اور بس۔ یعنی نشوونما نہیں ہے احساس وارادہ نہیں ہے۔ اس نقص کے پہلو کا نام ہے جمادات۔ اس کے بعد نباتات کون۔ جن میں نشوونما کی قوت ہو۔ جسم بھی ہیں اور نشوونما بھی رکھتے ہیں۔ جسمانی طور پر بڑھنے کی قوّت۔ جیسے پودے کا پھبکنا کہتے ہیں۔ اب اگر اس کا نام ہوتا نباتات تو حیوان بھی نباتات میں ہوتا۔ اِنسان بھی نباتات میں ہوتا لیکن یہ تو الگ ہے دوُسری نوع ہے تو ماننا پڑے گا کہ نباتات اس کا نام نہیں ہے کہ نشوونما رکھتا ہو اس کا نام ہے کہ نشوو نما رکھتا ہو اور بس۔ بس کے معنی یہ ہیں کہ احساس وحرکت کا جوہر نہیں ہے بس اس نقص کے پہلو کا نام نباتات ہے۔ یہ کمال کے پہلو کا نام نہیں ہے۔ نباتات کِسے کہتے ہیں جس میں نشو ونما ہو۔ اگر نشوونما ہونے سے نباتات ہوتا تو پھر حیوان بھی نباتات میں ہے اور انسان بھی نباتات میں ہے۔ پھر نباتات الگ کیوں ہیں۔ نباتات اس لئے الگ ہیں کہ نباتات میں بس نشو ونما ہے اور کچھ نہیں ہے یعنی احساس وحرکت ارادی نہیں ہے۔ اب حیوان مگر وہ ارسطو والا حیوان نہیں۔ اس کے نزدیک اِنسان بھی حیوان ہے۔ میں عام اُردو میں یہ کہوں کہ حیوان جانور کے معنی میں جاندار کے معنی میں نہیں۔ وہی تو ہے جو انسان سے پست ہے۔ جو انسان سے پست ہے وہی حیوان۔ اس کا ذکر ہے۔ تو وہ حیوان ایک جوہر رکھتا ہے یعنی حیات۔ احساس وحرکت ارادی۔ لیکن احساس وحرکت ارادی کا نام حیوان ہوتا تو پھر وہی یعنی انسان بھی حیوان ہوتا۔ مگر حیوان انسان سے پست ہے تو کیا معنی۔ وُہ حیوان کون ہے جو انسان سے

پست ہے یعنی احساس وحرکت ارادی رکھتا ہے بس۔ بس کے معنی ہیں کہ وُہ عقل وشعورِ خیر وشر نہیں رکھتا۔ اچھائی اور بُرائی کا احساس نہیں رکھتا۔ تو اس نقص کے پہلو کا نام حیوان ہے۔ تو یہ سب نقص کے دائرہ وں میں گرفتار ہیں کہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکتے تو کوئی سرمایہ ہی نہیں تو خسارہ کیا ہوگا۔ جب بڑھنے کی صلاحیت نہیں تو جتنے ہیں وہی رہیں گے۔ خسارہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک طرف ہیں جمادات، نباتات، حیوانات۔ دُوسری طرف ہیں فرشتے۔ ان کے بلند ہونے میں کوئی شک نہیں۔ جوار قدس کے رہنے والے۔ عالم بالا کے مکین معصوم بے ضرر ہستیاں۔ بے گناہ ہستیاں۔ تو ان کی بلندی میں کوئی شک نہیں مگر ان کی بلندی خود اختیاری نہیں ہے۔ پیدا کئے گئے ہیں بلند لہٰذا بلند ہیں۔ ان کی صفاتی بلندی ایسی ہے جیسے جسمانی بلندی ہے آفتاب کی۔ جیسے جسمانی بلندی آفتاب کی کہ پیدا کیا ہی گیا ہے بلند ویسے ہی انکی بلندی اوصاف والی۔ بے شک بڑی اچھی مخلوق۔ بے گناہ ہے۔ مگر بے گناہ ہے بایں معنی کہ وُہ دل نہیں جسمیں اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ جذبات نہیں۔ وہ تقاضے نہیں جو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ لہٰذا معصوم ہیں۔ عصمت انکی صفت ہے قابلِ مدح۔ کارنامہ نہیں ہے قابلِ شکریہ۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بڑی اچھی مخلوق ہے کسی کو ستاتی نہیں کسی کو آزار نہیں پہنچاتی۔ ہمہ تن اطاعت پروردگار ہے۔ بڑی اچھی مخلوق مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ بڑا کام کرتے ہیں جو اطاعت کرتے ہیں۔ بڑا کام کرتے ہیں جو گُنّا ہوں سے بچے رہتے ہیں۔ کارنامہ نہیں ہے یہ۔ ماشاء اللہ ذوق ادب رکھنے والے تو بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ دوسرے افراد بھی میرے بیان کے پس منظر سے سمجھ ہی لیں گے کہ اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے مگر کتنا ہے اتنا ہی ہے اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا یعنی مایہ دار ہیں سرمایہ دار نہیں ہیں صلوٰۃ

توجب بڑھنے کا امکان نہیں تو پھر خسارہ بھی کیا ہوگا۔ نہ گھٹنے کا تصور نہ بڑھنے کا امکان۔ جتنا اللہ نے دیا۔ جو جوہر۔ اتنا ہی ہے اس سے آگے نہیں ہے۔ اب انسان۔ اِنسان کی خاصیت ہے کہ یہ طاعت ومعیت کے دوراہے پر پیدا کیا گیا ہے۔ لچک دار مخلوق۔ یہ گھٹتا ہے تو بدبخت حیوانوں سے بدتر ہوجاتا ہے اسی لئے قرآن مجید میں کہا گیا اولئِٰک کالانعام بل ھم اضل سبیلا یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں۔ میں اگر اس طرح کی بات کہوں یہ جُملہ اس طرح کا میں کہوں تو تو سمجھ میں آئے گا کہ مَیں نے پہلے کہہ دیا مثل چوپایوں کے اور پھر چونک کر کہا بلکہ بدتر۔ مگر یہ کلام اس کا ہے جس کے ہاں سہو ونسیان کی گنجائش نہیں اس لئے کہ سہو ونسیان بھی ایک طرح کا جہل ہے وہ جہل عارضی سہی۔ جو عالم بالذات ہے اس کے ہاں سہو ونسیان کا سوال نہیں۔ ارے ہم اس کے اُونچے بندوں کو سہو ونسیان سے بری جانتے ہیں۔ تو اللہ کا کیا ذکر۔ صلوٰۃ۔ اس کے ہاں بدل الغلط کا امکان نہیں ہے۔ ماننا پڑیگا کہ حکمت کلام متقاضی ہے کہ یوں بات کہی جائے۔ تو اب میری نظر میں اور نظیریں بھی ہیں۔ اب آپ کا بہت دل پسند موضوع۔ مگر ابھی سے کہدوں کہ اس موضوع کو پیش نہیں کرنا ہے۔ دَنیٰ فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ قریب ہوئے اور قریب ہوئے یہاں تک کہ دو کمان یا اس سے کچھ کم۔ وہی بات کہ اگر میرا جملہ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ بھئی صحیح طور سے ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یعنی متکلم کو شک ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ دو کمان یا اس سے کچھ کم۔ ٹھیک ٹھیک ہم نہیں بتا سکتے۔ مگر وُہ۔ جو مِثْقَالَ کُلِّ ذَرَّۃٍ سے واقف۔ اس کے ہاں معاذاللہ اندازے کی غلطی کا کیا سوال۔ تو وہی ماننا پڑے گا کہ حکمت کلام متقاضی ہے کہ یوں کہا جائے۔ اب وہ ایک ہی

حکمت ہے دونوں میں۔ اور وہ ایک ہی چیز ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ اگر بَل کے معنوں میں ہے۔ دو کمان بلکہ اس سے کم تر تو اب اوؔ بَل کے معنوں میں ہو گیا۔ تو بالکل نظیر اسی کی ہو گئی۔ مثل چوپایوں کے بلکہ اس سے بد تر۔ مَیں کہتا ہوں وہ پستی کی تعبیر بھی یہ بلندی کی تعبیر ہے۔ ایک ہی انداز میں ہے۔ وُہ مثل چوپایوں کے بلکہ بدتر۔ یہاں کہا جا رہا ہے۔ وہ اتنے قریب کہ دو کمان بلکہ اس سے کم تر۔ تو اب اَوْ اور بَل ایک ہی قبیل کی چیزیں ہو گئیں۔ تو اب جو حکمت کلام ہے اپنے فہم کے مطابق عرض کروں گا وُہ دونوں جگہ جاری ہو گی۔ کبھی متکلّم کا حکیمانہ تصوّر یہ محسوس کرتا ہے کہ ایک دم سے حقیقت کہی جائے تو ممکن ہے نذرِ تغافل ہو جائے لہٰذا حقیقت کو ایک ایک گھونٹ کر کے پلاؤ۔ جرعہ بہ جرعہ۔ تدریجاً۔ تو اگر شروع میں۔ اگر ذرا متوجہ نہیں بھی ہے تو رفتارِ کلام کے آگے بڑھنے کے ساتھ متوجّہ ہو جائے گا۔ مگر اب جب کلام اسکا ہے جو اصدق الصادقین ہے تو جو پہلا جز کہا وُہ بھی اپنی جگہ صحیح ہونا چاہیے اور پھر اس پر مزید اضافہ جو ہے وُہ اپنی جگہ صحیح ہونا چاہیئے تو اب اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ یہ چونکہ اصل موضوع سے متعلق ہے لہٰذا اسے بعد میں عرض کرونگا پہلے اسی کو جسے بطور نظیر پیش کیا تھا۔ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ چونکہ رفعت کا اظہار لفظوں میں ہو نہیں سکتا لہٰذا خالق محسوسات کی مدد دیکے ذہن کو اس درجہ تقرّب تک پہنچانا چاہتا ہے اس لئے لفظوں کے سہارے سے ایک قریب ترین نکتے تک۔ پیمانے تک جو دو کمانوں کا ہے اسکو پہنچا دیا گیا۔ اب گویا خالق کہنا چاہتا ہے کہ دیکھو اتنا ہی نہ سمجھنا یعنی اگر دو کمان کہہ کر خاموش ہو جاتے تو رفعت محمدی پر حد قائم ہو جائے۔ تو حضور والا اب الفاظ کا سہارہ دے کر دو کمانوں تک پہنچا یا گیا تو اس پر خاموش ہو جائے

تو انکی رفعت پر حد قائم ہو جائے لہٰذا آگے بڑھتا ہے اور متکلّم جسم و جسمانیات سے بری ہے مگر یہ کہ جو حقیقت ہے وہ بغیر جسم و جسمانیات کے لفظوں کے ادا کیونکر ہو کیونکہ لفظیں وہاں کے لئے بنی ہی نہیں ہیں۔ آپ دیکھ لیجئے قرآن میں قاب قوسین کے اوپر کوئی وقف نہیں ہے یہاں تک کہ ج بھی نہیں ہے جس کے معنی ہیں وقف جائز۔ کسی طرح کا وقف نہیں ہے۔ وقف کا معیار یہ ہے کہ جہاں سانس لی جائے وہاں وقف۔ جہاں سانس نہ لی جائے آگے بڑھ جایا جائے وہ ہے غیر وقف تو ہمیں وقف کرنے سے منع کیا گیا ہے یعنی وہاں وقف نہیں ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ متکلّم نے بغیر سانس لئے ہوئے آگے بات بڑھائی ہے اب ہمیں قبل والے جملے سے نتیجہ نکالنے کا حق نہیں ہے۔ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ جب بات مکمل نہیں ہوئی تو تمہیں رائے قائم کرنے کا کیا حق۔ اب کہہ دیا کہ اَوْ اَدْنٰی۔ یعنی اس سے کم تر۔ ماشاءاللہ صاحبان فہم ہیں۔ صاحبان نظر ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اب کم تر کی حد نہیں بتائی کہ کتنا کم۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جتنا وہم و فہم و تخیّل میں گنجائش ہو اتنا آگے بڑھ جاؤ تو خدا خدا رہے بندہ بندہ رہے۔ یہ تو روشن پہلو ہے جسے میں نے نظر میں پیش کیا۔ اصل میرا موضوع وہ ہے کہ انسان گرتا ہے تو اولٰئک کالانعام بل ھم اضل سبیلا۔ یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ اس سے بد تر ہیں تو جب کہا مثل چوپایوں کے تو یہ بھی صحیح ہونا چاہیئے۔ کسی حیثیت سے انہیں مثل چوپایوں کے ہونا چاہیئے۔ جب کہا بد تر تو کسی حیثیت سے انہیں بد تر ہونا چاہیئے اور پھر نتیجۃً بد تر ہی ہونگے تو میں جب غور کرتا ہوں کہ انسان کردار کے اعتبار سے جب گرتا ہے تو عملاً ہوتا ہے مثل چوپایوں کے۔ حضور چوپائے ہوتے ہیں دو قسم کے کچھ چرندے کچھ درندے۔ چرندے کون

چرنے والے گائے بھینس وغیرہ۔ جنہیں آپ مویشی کہتے ہیں۔ درندے کون شیر بھیڑیے جن کا نام سُن کر ہَول آئے۔ تو چرندے جو ہیں ان بے چاروں کا مقصد پیٹ بھرنا ہے۔ کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر جائے۔ جو سبزہ زار سامنے آتے چر جائیں اس سے بحث نہیں کہ مالک راضی ہے یا ناراض ہے۔ غذا جس طرح ملے کھالیں اس سے بحث نہیں بہ عزت مل رہی ہے یا بہ ذلت اگر انسان ایسا ہی ہوگیا کہ اسے پیٹ بھرنے کے مقصد میں شکم پُری کی راہ میں حلال و حرام کا امتیاز نہ رہا جائز و ناجائز کا امتیاز نہ ہو صحیح و غلط کا امتیاز نہ ہو تو پھر اس میں اور چرندے میں فرق کیا ہوا۔ اور اب دیکھ لیجئے کہ ۹۰ فیصدی اور ممکن ہے ۹۵ فیصدی اور ممکن ہے ۹۸ فیصدی یہ سب اسی قسم میں داخل ہیں یا نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ مجمع میں ماشاء اللہ تاجر بھی ہوں گے۔ تجارت ایک پیشہ تو ہے ہی۔ حضور پیشہ ور وہی ہوتے ہیں جو کاسب ہیں تاجر ہیں۔ تو اس کے لئے ایک مقولہ تراش لیا۔ نظریہ۔ کہ یہ تو ہمارا پیشہ ہے یعنی جب یہ کہیئے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے جواب یہ ملے گا کہ ہمیں اس سے کیا مطلب یہ تو ہمارا پیشہ ہے گویا پروانہ صحت مل گیا۔ فرض کیجئے ایک صاحب ہیں کہ جو جھوٹا مقدمہ لڑ رہے ہیں آپ انہیں جانتے ہیں۔ اتفاق سے آپ کو بھی کسی کام سے کچہری جانا پڑ گیا۔ آپ نے ایک ٹیکسی والے کو روکا آپ نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی والا آپ ہی کے محلہ کا ہے اور وہ انہیں کچہری لے جا رہا ہے آپ نے ٹیکسی والے سے علیحدگی میں کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ صاحب جھوٹا مقدمہ لڑ رہے ہیں تو تم انہیں اپنی ٹیکسی میں لئے جاتے ہو۔ وہ فوراً جواب میں کہے گا کہ جناب مجھے اس سے کیا مطلب کہ سچا مقدمہ لڑنے جا رہے ہیں یا جھوٹا لڑ رہے ہیں۔ میرا تو پیشہ یہی ہے۔ اب چپکے سے آپ قائل ہو جائیے تو بہتر ہے ورنہ اگر

راہ گیر جمع ہو گئے تو سب اس ٹیکسی والے کی طرف ہوں گے آپ کی طرف کوئی نہیں ہوگا بلکہ گھر پر جا کہ وہ گھر والوں سے یا عزیزوں دوستوں سے کہیں گے کہ آج ایک سنکی ملا تھا۔ ہمیشہ صاحبانِ عقل کو دیوانہ کہا گیا ہے۔ ایک سنکی ملا تھا وہ ٹیکسی والے سے جھگڑا کر رہا تھا کہ تم جھوٹا مقدمہ لڑنے والی سواری کو کیوں کچہری لئے جا رہے ہو سب ہنسیں گے کہ واقعی دیوانہ تھا واقعی سنکی تھا سب اس کی طرف ہوں گے اس کے معنی یہ ہیں کہ آج انسانیت نے بیعت کر لی ہے حیوانیت کے ہاتھ پر۔ یہ میں نے ٹیکسی والے کی مثال دی جتنی چاہیں مثالیں لے لیجئے خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع کرنے کو دل چاہے تو میں چاہے جتنی مثالیں دیدوں۔ بہرحال ایک اور سہی۔ فرض کیجئے کسی کا پریس ہے اور وہاں سے ایک مخربِ اخلاق پوسٹر شائع ہوا ہے اور آپ نے جا کر اس پریس والے سے کہا کہ تم نے ایسا مخربِ اخلاق پوسٹر کیوں اپنے ہاں سے شائع کیا ہے وہ کہے گا کہ ہم کوئی دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ سائز کتنا ہے عبارت کتنی ہے اس کا ناپ جو مقرر ہے وہ دیکھا اجرت بتائی کہ اتنے میں لکھا جائے گا اتنے میں چھپے گا اس نے وہ سب دینے کا اقرار کیا ہم نے چھاپ دیا ہمیں اس سے کیا مطلب کہ اس کے اندر کیا ہے یہ مخرب اخلاق ہے یا مصلح اخلاق ہے۔ ہمیں اس سے کیا مطلب وہ یہی جواب دے گا۔ اور ایسا ہی جسکا جو پیشہ ہے۔ علی گڑھ میں ایک صوفی صورت آدمی۔ معلوم ہوا ان کے مُرید بھی ہیں۔ ان کی پان کی دوکان ہے۔ ماہِ رمضان میں ایک نوجوان نے آکر ان سے پان مانگا انہوں نے پان بنا کر اُسے دیدیا چونکہ وُہ صورت سے مجھے صوفی صافی نظر آ رہے تھے لہٰذا نوجوان کے جانے کے بعد میں نے کہا کہ ماہِ رمضان میں آپ پان بنا بنا کر نہ دیا کیجئے وُہ بڑے چیں بہ جبیں ہوئے فرمانے لگے صاحب ہماری دوکان ہے ہمیں اس سے کیا بحث۔

ہمارا کام یہ ہے کہ ہم خود روزہ رکھیں لیکن اگر کوئی آکر ہمارے ہاں سے پان خریدنا چاہے اور ہم اُسے پان نہ دیں تو پھر ہماری دو کان ہی ختم ہو جائے گی۔ تو یہ سب وہی ہے کہ پیشہ میں جائز و ناجائز کا سوال نہیں۔ اسی کو ایک جماعت نے پورا روٹی کا فلسفہ بنا دیا کہ گویا زمین و آسمان پیٹ بھرنے سے قائم ہیں۔ روٹی ہی سب کچھ ہے تو میں کہتا ہوں کہ جیتے جی روٹی کی اہمیت سے انکار کیوں کر کر سکتا ہوں۔ یقیناً روٹی کی اہمیت ہے مگر بس طے کرنا یہ ہے کہ روٹی کی اہمیت کس حد تک ہے۔ ذریعہ حیات کی حد تک یا مقصد حیات تک۔ اگر ذریعہ حیات کی حد تک آپ کہتے تو میں بھی آپ کے ساتھ متفق ہوں کہ زندگی کے لئے روٹی ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر زندگی کاہے کے لئے ہے۔ روٹی تو برائے زندگی مگر زندگی برائے چہ۔ یاد رکھئے ہر ذریعہ سے مقصد اہم ہوتا ہے لہٰذا اب تین درجہ قائم ہوں گے۔ جسطرح ریاضی میں سکھایا جاتا ہے۔ ا ب ج۔ تو الف روٹی اور ب اس سے اوپر خود زندگی۔ اور ج اس سے اوپر مقصد زندگی تو جب زندگی کی خاطر ہے روٹی تو وہ روٹی جو زندگی کو نقصان پہنچائے۔ کیا وہ حاصل کرنے کے قابل ہے اُردو زبان میں کہوں کہ جسے کھا کر ہیضہ ہو۔ کیا وُہ بھی حاصل کرنے کے قابل ہے۔ یہاں سب عقلائے زمانہ روٹی کے نظام والے بھی۔ میرے ساتھ ہل کر یہی کہیں گے کہ نہیں اس روٹی کو چھوڑ دیجئے۔ پھینک دیجئے کسی کو دے دیجئے بہرحال اس روٹی کو استعمال نہ کیجئے تو اب اگر وہ روٹی چھوڑنے کے قابل ہے جو زندگی کو نقصان پہنچائے تو وہ روٹی بھی چھوڑنے کے قابل ہے جو مقصد زندگی کو نقصان پہنچائے۔ وُہ روٹی جسے کھا کر لینے کو ہیضہ ہو وہ اس لئے چھوڑنے کے قابل کہ زندگی کو نقصان پہنچاتی ہے اور وہ روٹی جو یتیم کا گلا کاٹ کر ملے اور وہ روٹی جو فساد

کر کے ملے اور وہ روٹی جو خلق خدا کو گمراہ کر کے ملے وہ روٹی جو خونریزی کر کے ملے وہ اس لیئے کھانے کے قابل نہیں کہ مقصد زندگی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اب اگر یہاں تک کوئی روٹی کے نظام والا میرے ساتھ آگیا تو اس کے معنی ہیں کہ یہیں سے رزق میں حلال و حرام کی تفریق ہوگی۔ یہیں سے دیکھنا پڑے گا کہ کون جائز ہے کون ناجائز ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو وہی حیوانیت ہے جسے فلسفہ کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ جسکو ایک بڑا نظریہ بنا کر پیش کر دیا گیا ہے۔ اب دیکھ لیجئے کہ فیصدی کتنے ہیں جن کا نصب العین صرف پیٹ بھرنا ہے۔ اور اب معاف کریں مجھکو جوان اور نوجوان۔ ماشاءاللہ یہ بہت بڑا انقلاب ہے۔ کہ ایک وقت میں مجلس میں زیادہ تر بوڑھے ہوا کرتے تھے۔ نوجوان تو منتظر رہتے تھے کہ جب ماتم ہوگا تو چلیں گے مگر الحمدللہ مجھے ہر جگہ یہ خوشگوار تبدیلی محسوس ہوئی ہے کہ جوان اور نوجوان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ غور سے سُنتے ہیں اور اس سے نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اب اس وقت انہی کو۔ کیونکہ بوڑھے اس منزل سے گذر چکے ہیں سابقہ نوجوانوں ہی سے ہے۔ نوجوانوں ہی سے گفتگو ہے۔ اب انہوں نے جس دن سے ڈگری لی ہے۔ جس دن سے تعلیم میں حد کمال تک پہنچے۔ اس وقت سے اخباروں پر نظر ہے کہ کونسی جگہ کہاں خالی ہے۔ کس جگہ کا اشتہار نکلا ہے۔ اشتہار پڑھا تنخواہ کی مقدار دیکھی اور ترقی کا سکیل دیکھا کہ اس میں امکانات کہاں تک آگے جانے کے ہیں اور بس درخواست بھیج دی۔ اس سے مطلب نہیں کہ کام کیا کرنا ہے۔ وُہ کام صحیح ہے یا غلط ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کبھی جانچ کی ہی نہیں جاتی۔ ادھر تصور جاتا ہی نہیں اس لیئے کہ یہ گویا خارج از بحث چیز ہے۔ ہمیں پیٹ بھرنا ہے، ہمیں یہ کیا دیکھنا ہے۔ ہمیں تو تنخواہ کی مقدار دیکھنی ہے۔ تو یہ جناب

وہی فلسفہ حیوانی ہے۔ تو اگر انسان اسی راستہ پہ گامزن ہو گیا تو اس میں اور چرندوں میں کیا فرق رہا۔ یہ تو ہیں چرندے اس کے بعد ہیں درندے۔ درندے کون ہیں درندے وُہ ہیں جن کے افعال بتقاضائے غضب ہوں۔ جو ان کے غصّہ کی زد پر آئے شکار ہو جائے اس سے مطلب نہیں کہ جوان ہے یا بوڑھا ہے یا بچّہ ہے اس سے مطلب نہیں کہ گناہ گار ہے یا بے گناہ ہے اگر انسان بھی ایسا ہی ہو جائے کہ جب جذبہ انتقام پیدا ہو تو اس سے مطلب نہیں کہ فریق مخالف کا یہ بچّہ ہے یا فریق مخالف کا یہ جوان ہے یا فریق مخالف کا بوڑھا ہے یا قصور وار ہے یا بے قصور ہے۔ اس سے مطلب ہی نہ رہے تو پھر انسان میں اور اس درندے میں کیا فرق ہوا۔ اب یہ دیکھ لیجئے کہ عام نوع انسانی تقسیم ہے انہی دو حِصّوں میں یا نہیں۔ کچھ چرندے اور کچھ درندے اور میں کہتا ہوں کہ یہ بے چارہ قِسم کے جو لوگ ہیں۔ بقدر ہمّت۔ وُہ چرندے ہوتے ہیں اور جو اولوالعزم لوگ ہیں وُہ درندے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انسان گرتا ہے تو مثل چوپایوں کے ہوتا ہے اور نتیجۃً چوپایوں سے بدتر ہوتا ہے۔ کیوں۔ اس لئے کہ چوپائے اگر پستیٔ کردار میں مبتلا تھے تو ان کے پاس وہ شعور نہیں ہے جو حق و باطل کا امتیاز کر سکے۔ جس کا نام عقل ہے وہ تمیز نہیں کہ جائز و ناجائز میں فرق محسوس کر سکے۔ اب انسان عقل رکھتے ہوئے شعور رکھتے ہوئے صحیح و غلط کے پہچاننے کی صلاحیّت رکھتے ہوئے پھر بھی عملاً حیوان بنتا ہے تو یہ اس سے زیادہ مورد سزا ہے یعنی یہ حیوان بھی ہے اور مستحق ملامت بھی ہے۔ جیسے وہاں میں نے کہا تھا فرشتوں میں کہ عصمت انکی صفت ہے قابل مدح لیکن کارنامہ نہیں ہے قابلِ شکریہ ویسے ہی یہاں ہے کہ جتنی بُرائیاں ہیں وُہ بُرائیاں صفتیں ہیں قابل مذمّت لیکن کردار نہیں ہیں قابل

ملامت۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اے بکری تو نے یہ مالِ غیر کیوں کھا لیا۔ ان کو ملامت نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں طریقہ کھانے کا یہی معلوم ہے۔ کہنے والے نے کہہ دیا نیش عقرب نہ از پئے کین است۔ مقتضائے طبیعتش این است۔ بچھو کا ڈنگ مارنا کوئی عداوت کی وجہ سے تھوڑی ہے یہ تو اسکی طبیعت کا تقاضا ہے۔ عربی کورس میں ادب کی ایک کتاب تھی۔ بچوں کو پڑھائی جاتی تھی سُلّمُ الادب۔ اس میں شروع میں کچھ حکایتیں تھیں اور آخر میں کچھ مختصر سے قطعے تھے۔ اشعار تھے جو نصیحت آمیز تھے ان میں سے دو اشعار کا مضمون یہ ہے کہ میں نے ایک بچھّو کو دیکھا کہ وہ پتھر پر ڈنگ مار رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تیرا ڈنگ ہے نرم اور یہ پتھر ہے سخت۔ تیرے ڈنگ کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ اس نے کہا مجھے اس سے کیا مطلب کہ اس پر اثر ہوگا یا نہیں ہوگا۔ میں تو یہ ثابت کر رہا ہوں کہ میں بچھّو ہوں۔ تو ان کے افعال بتقاضائے طبیعت ہوتے ہیں لہٰذا موردِ مذمّت ہیں موردِ ملامت نہیں۔ لیکن یہ بدبخت انسان جب جُرم کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اندر سے کوئی کہتا ہوتا ہے کہ غلط ہے کہ ایسا نہ کرو لیکن یہ اس کی آواز کو سُنا ان سُنا بنا دیتا ہے۔ ضمیر کے فیصلہ پر عمل نہیں کرتا دوسری دفعہ اُسکی آواز ذرا دھیمی ہو جاتی ہے کیونکہ پہلی مرتبہ اُس کی دِل شکنی ہو گئی۔ اگر توجہ کر لی ہوتی تو پھر اور قوت اس میں پیدا ہو جاتی لیکن جب توجّہ نہیں کی تو دوسری مرتبہ اسکی آواز کمزور پڑ گئی۔ یہاں تک کہ تیسری منزل وہ آگئی کہ جب پھر بھی توجّہ نہیں کی تو اس نے صدا دینی چھوڑ دی۔ یہ وہ منزل ہے جسے قرآن نے کہا ہے کہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ۔ اصلاح سے یہ نا اُمیدی اپنے ہاتھوں پیدا ہوئی ہے لہٰذا جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔ تو باوجود ضمیر کی طاقت رکھنے کے باوجود بُرے اور اچھے کے احساس

کے پھر بھی یہ عملاً چوپایہ رہے تو نتیجۃً چوپایوں سے بدتر ہیں اسی لئے دوزخ ان چوپایوں کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ دوزخ انہی انسانوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے جو ان سے بدتر ہیں یہ مُوردِ سزا بھی ہیں موردِ ملامت بھی ہیں۔ یہ تو اس وقت ہے جب انسان گھٹتا ہے۔ اور جب بڑھتا ہے تو جو انسان بلندی پر ہوتا ہے وہ عملاً تو ہوتا ہے فرشتے کا مثل۔ اس لئے کہ فرشتہ بھی بے گناہ یہ انسان بھی بے گناہ۔ بے گناہ کے معنی ہیں زیرو۔ زیرو میں درجے نہیں ہوتے۔ یہاں بھی نفی گناہ وہاں بھی نفی گناہ۔ یہ انسان جو ہے اسمیں بھی گناہ نہیں۔ تو عملاً تو فرشتوں کی مثل ہوتا ہے مگر نتیجۃً فرشتوں سے بہتر ہوتا ہے اس دلیل سے جس دلیل سے گرنے میں مثل چوپایوں کے ہوا تھا اور نتیجۃً چوپایوں سے بدتر ہوا تھا۔ کیوں۔ اس لئے کہ یہ عقل رکھتے ہوئے چوپایہ رہا۔ ویسے ہی بڑھنے میں اسی دلیل سے فرشتہ نہیں ہوتا ہے۔ کیوں۔ اس لئے کہ فرشتے اگر معصوم ہیں تو کمال کیا ہے۔ اور یہ جذبات رکھتے ہوئے بھوک پیاس رکھتے ہوئے تکلیف کا احساس رکھتے ہوئے پھر بھی عملاً فرشتہ رہا تو یہ فرشتوں سے بالاتر ہے یعنی ملک عصمت جو فرشتوں کے لئے عطیہ خسروانہ تھا وہ اسکا قوتِ بازو سے فتح کیا ہوا ملک ہے اسی لئے جب یہ عصمت اختیاری کے قدموں سے بلند ہوتا ہے تو اتنا بلند ہوتا ہے اتنا بلند ہوتا ہے کہ ملک کو لرزنے کے ساتھ چھوڑنا پڑتا ہے اور اب اسکا کردار اس منزل پر آجاتا ہے۔ کہ ملک حیران ہو جاتا ہے۔ یاد رکھئے حیرت اسی چیز پر ہوتی ہے جس کی مثال پہلے سامنے نہ آئی ہو۔ عمر ملک دیکھئے یعنی اسکی خلقت ظاہری قبل آدم ابوالبشر۔ مدتوں پہلے۔ جس کی پیمائش ہم اپنے پیمانوں سے کر بھی نہیں سکتے کہ کتنا پہلے۔ تو کتنی عمر اسکی ہے۔ اور نوعِ انسانی کی ابتدا بھی مجھے نہیں معلوم۔

بعض تاریخوں میں آتا رہتا ہے کہ آدمؑ سے اب تک لتنے ہزار برس۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ تو عمر انسانی کی مدّت بھی نہیں معلوم۔ مگر جتنے کردار ہیں وہ سب مَلَک کی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ آدم سے لے کر تا خاتم۔ ہر ایک کا کردار اسکی نظروں کے سامنے آیا ہے۔ اب اس کے بعد اگر کبھی اس کو حیرت ہو جائے تو وہ مجموعی حیثیت سے افضل ہستیاں۔ یقیناً میں مانتا ہوں عقیدتاً۔ جزوِ دین ہے بالاتر ہستیوں کا ماننا اس کے قبل۔ لیکن یہ کہ کسی شعبہ کردار میں نمونہ ایسا سامنے آیا ہے جسکی مثال اسکو اس وقت تک نظر نہیں آئی تھی۔ آدم سے لیکر تا این دم۔ کوئی مثال اسکی آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اب مجھے معصوم کی زبان کا ایک جُملہ یاد آ رہا ہے جو سیّدالشہدا کو مخاطب کر کے آپ نے کہا ہے۔ عَجِبَتْ مِنْ صَبْرِكَ مَلٰئِكَةُ الْمُقَرَّبِيْن۔ اے حسینؑ آپ کے صبر سے ملائکہ مقرّبین ششدر رہ گئے۔ یعنی ان کے تصوّر سے بالاتر نمونہ صبر کا ان کے سامنے آیا۔ اب صرف حدیث۔ جو زیارتیں معصومین نے بتائی ہیں وہ بھی ایک قسم کی حدیث ہیں۔ تو وہ جملہ تو بس اتنا ہی ہے۔ مگر اب مجھے تلاش ہوئی ہے کہ وہ کربلا کے مرقع کا کونسا موقع ہوگا۔ وہ کونسا زاویہ ہوگا جہاں فرشتوں کو حیرت ہوئی ہوگی۔ اور میرے سامنے کردار کربلا کے جو مرقع آ رہے ہیں۔ تو بخدا شاعر نے تو کسی اور مرقع کے لئے کہا تھا مگر میں اسے یہاں صرف کر رہا ہوں کہ۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است۔ مرقع کا ہر گوشہ مجھے ایسا ہی نظر آ رہا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ فرشتے کو یہیں حیرت ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس پر بھی حیرت ہوئی ہو۔ پھر حیرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہو۔ تو اب کتنے مرقع آئے سامنے میں راستے ہی سے شروع کر رہا ہوں ورنہ پھر مصائب کے لئے بھی کافی وقت درکار ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ بھی ایک موقع ہے جب

یتیم بھتیجا جا رہا ہے۔ کون قاسم بن حسن۔ مثل مشہور ہے کہ اپنے ماں باپ کو تو اپنا بدصورت بچہ بھی خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن یہ قاسم کیا چیز ہیں کہ جب فوج دشمن کی طرف جا رہے ہیں ارشاد شیخ مفید کی روایت ہے۔ شیخ مفید اعلی اللہ مقامہ، جنہیں امام نے الشیخ معتمدی کہا ہے۔ وہ ارشاد میں لکھ رہے ہیں کہ جب فوج دشمن کی طرف جا رہے تھے تو دشمن کے فوج کے سپاہی نے بعد میں جب روداد سُنائی ہے تو اس نے کہا خرج غلام کان وجھہ۔ القمر۔ ارے ایک بچہ ایسا نکلا جیسے چاند کا ٹکڑا ہو۔ وہ چچا کی نگاہ میں کیا تھا۔ وہ پھوپھی کی نظر میں کیا تھا وہ بیوہ ماں کی نظر میں کیا تھا تو یہیں سے ممکن ہے ملک کی حیرت شروع ہوتی ہو۔ اس کے بعد جب ایسا بھائی جُدا ہوا کہ حسینؑ نے کمر تھام لی۔ اور ہر ایک کی ایک انفرادیت ہے۔ کیا کہوں کب کمر تھامی۔ جب عباس کی آواز آئی۔ مولا خبر لیجئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے۔ جب آخر وقت ہوا تو ہر ایک نے صدا دی۔ جب گھوڑے سے گرنے لگا آواز دی۔ لفظیں بدلتی گئیں۔ اصحاب نے سب نے کہا یا مولاہ ادرکنی۔ اے مولا میری خبر لیجئے۔ عزیزوں کی باری آئی جس کا جو رشتہ تھا۔ بھانجوں نے کہا ماموں خبر لیجئے۔ بھتیجے نے کہا چچا خبر لیجئے۔ اب ممکن ہے کسی کے ذہن میں ہو۔ یا سُنا بھی ہو کسی سے کہ عباس نے بھائی کہا ارباب عزا میں تو واقعہ یہ دیکھ رہا ہوں کہ عباس نے پکارا ہی نہیں۔ میرے کہنے سے نہ مانیئے۔ غور کر لیجئے۔ ارے کیا انہوں نے پکارا۔ پکارتے کیونکہ مشک کا دستہ تو دانتوں میں تھا۔ مولا تو جیسے منتظر رہے کہ عباس کی صدا آئے مگر عباس کی صدا ہی نہیں آئی۔ بس علم گرا اور حسین نے کمر تھامی الان انکسر ظھری اب میری کمر شکستہ ہو گئی مگر یاد رکھئے کمر شکستہ ہوئی ہے۔ ہمت شکستہ نہیں ہوئی۔ یہی

منزل ہے جہاں ملک کو ششدر ہو جانا چاہیئے۔ اس منزل پر بھی اور اہلِ عزا اب وہ منزل آئی جب شبابِ محمدی جُدا ہو رہا ہے۔ اور اس مجاہد کی بھی خصوصیت ہے جو کوئی مجاہد میدان میں گیا ہے مولا نے کہا ہے ہاں اجازت ہے۔ علی اکبر نے اجازت طلب کی تو امام سہی مگر باپ بھی تو ہیں۔ مجھے تو یہی لفظیں ملتی ہیں۔ دُنیائے فطرتِ انسان میں کہ جس نے کہا اجازت دیجئے کہا اجازت ہے علی اکبر نے کہا مجھے اجازت دیجئے۔ اب مولا سے جیسے یہ نہیں کہا جاتا کہ اجازت ہے۔ کہتے نہیں اجازت ہے ہاتھ اُٹھا دیتے ہیں بارگاہِ الٰہی میں اَللّٰھُمَّ اَشْھَدْ عَلٰی ھٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ فَقَدْ بَرَزَ اِلَیْھِمْ غُلَامٌ پروردگارا تو گواہ رہنا کہ اب وُہ جا رہا ہے۔ علی اکبر سمجھ گئے کہ اجازت ہے۔ وُہ جا رہا ہے جو صورت، سیرت اور رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے اور اس کے بعد علی اکبر کی یہ خصوصیت ہے کہ جو گیا بس اُسے رُخصت کر دیا لیکن علی اکبر کو رخصت تو کر دیا مگر مولا اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکے دُور تک علی اکبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ اب مناجاتِ حسینی کی روشنی میں مجھے اس فیصلہ کا حق نہیں ہے کہ یہ علی اکبر کی محبت تھی یا شبیہہ رسول کی عزت تھی۔ جب اسکی آواز آئی۔ مگر کیا آواز آئی۔ یہ ان کی انفرادیت ہے۔ وہ عباس کی انفرادیت تھی کہ انہوں نے صدا ہی نہیں دی مجبور تھے۔ یہ علی اکبر کی انفرادیت ہے کہ جو کہتا تھا یہ کہتا تھا مولا میری خبر لیجئے۔ چچا میری خبر لیجئے یہ کہہ سکتے تھے یا ابتاہ ادرکنی بابا میری خبر لیجئے مگر انہوں نے یہ نہیں کہا ارے کیوں نہیں کہا۔ ایک تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ تصوّر ہو گا کہ جو پکارتا تھا بابا آتے تھے تو کم از کم میں ساتھ ہوتا تھا اب میں پکاروں تو کون ہے جو ساتھ آئے اور ایک دُوسرا پہلو جو میرے ذہن میں ہے۔ اس کے لئے

ماشاء اللہ جو جوان ہوں انہی کو مخاطب کر رہا ہوں کہ شاید ننگ شجاعت محسوس ہوتا تھا کہ جوان بیٹا بوڑھے باپ کو مدد کے لئے پکارے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ بابا خبر لیجئے بلکہ کیا کہا یا ابتاہ علیك منی السّلام۔ یعنی بابا زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرا اسلام قبول کر لیجئے۔ بس اب ملک کی حیرت انتہا کو پہنچ جائے گی کہ ارے ایسا بیٹا جدا ہو گیا مگر حسینؑ کی ہمّت قربانی ختم نہیں ہوئی۔ اس لئے گہوارے سے ڈھونڈتے ہوئے ایک اور نشانہ لے آئے کہ تمہارا ظلم ابھی ختم نہیں ہوا تو میرا صبر بھی ابھی ختم نہیں ہوا۔

مجلس دوم

دین اور سائنس۔ بشارت و انذار امر بالمعروف و نہی عن المنکر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۔

قسم ہے عصر خاص کی کہ یقیناً انسان خسارہ میں ہے اگر بات اتنے پر ختم ہو جاتی تو اسکا مطلب یہ تھا کہ سبھی خسارے میں ہیں۔ چاہے انبیاء ہوں چاہے اصفیا ہوں چاہے اولیا ہوں معصومین ہوں سبھی خسارے میں ہیں لیکن کلام الٰہی اتنے پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس سے آگے بڑھا کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۔ سب خسارے میں ہیں مگر جو ایمان لائیں نیک اعمال کریں اور ایک دوسرے کو حق کی ہدایت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں اب جب اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ کہنے کے بعد بلا فاصلہ یہ جملہ آگیا اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا۔ تو ہمیں اس اِلَّا کی خصوصیت بہت شروع سے معلوم ہے کہ یہ اِلَّا کی لفظ عربی میں کیا کام کرتی ہے وہ یہ کام کرتی ہے کہ زمین نفی و اثبات میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے یعنی اگر قبل میں نفی ہے تو بعد میں ثبوت ہو جاتا ہے اور اگر قبل میں ثبوت ہے تو بعد میں نفی ہو جائے گی۔ شروع سے میں نے کہا۔ کیوں۔ دین کی پہلی

منزل۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ ۔اب اگر بات اتنے پر ختم ہو جائے مادیین کا کلمہ ہو
دہریوں کا کلمہ ہو وہ خاص الخاص سات سمندر پار کے کمیونسٹوں کا کلمہ ہو اور
یہ قیدیں اتنی کیوں لگائیں اس لئے کہ وہ ہیں خاص الخاص کمیونسٹ اور باقی اور
جگہ جو ہوتے ہیں وہ بر بنائے فیشن ہوتے ہیں یعنی ایک وضع اب چلی ہوئی
ہے گویا ترقی پسندی کی علامت ہے تو اس بنا پر اصل منکر خدا تو وہی ہوتے
ہیں جو وہاں ہیں خاص الخاص۔ تو ان سب کا یہ کلمہ ہوتا مگر جب اس کے
ساتھ آگیا اِلَّا اللہ تو اب نفی ثبوت سے بدل گئی اور معنی یہ ہو گئے کہ خدا ہے
اور وُہ کون ہے اللہ ہے اور آگے بڑھئے وما ارسلنٰک اِلَّا رحمۃ للعالمین
اگر بات اتنے پر ختم ہو جائے تو نفی رسالت ہو جائے۔جس کا کام نبیوں کا بھیجنا
ہے وہ کہتا ہے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہی نہیں ہے لیکن جب اس کے ساتھ
آگیا اِلَّا رَحمۃ لِلعالمین۔ نہیں بھیجا ہے ہم نے آپ کو مگر رحمت بنا کر
تمام جہانوں کے لئے تو معلوم ہوا کہ بھیجا بھی ہے اور ہمہ گیر رحمت بنا کر بھیجا
ہے۔اس کے بعد اب آگے بڑھئے لا اسئلکم علیہ اجرًا۔ میں تم سے
کوئی اجر چاہتا ہی نہیں تو اگر بات اتنے پر ختم ہو جائے تو بس کوئی اجر نہیں
چاہیئے۔ مگر جب آگیا الاّ المودۃ فی القربیٰ۔سوائے صاحبانِ قرابت کی
محبّت کے تو معلوم ہوا کہ اجر چاہتے ہیں مگر خود نہیں بحکمِ خدا۔ مگر وہ ہے کیا۔
صاحبانِ قرابت کی محبّت ۔ تو اب ایک ہی ساخت کے تینوں جملے آپ کے
سامنے آگئے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کلمہ توحید۔اسمیں بھی نفی کے بعد الاّ کے
ساتھ ثبوت وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ کلمہ رسالت۔اس میں
بھی نفی کے بعد اِلَّا کے ساتھ ثبوت لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا۔ کلمہ ولایت۔
اس میں بھی نفی کے بعد اِلَّا کے ساتھ ثبوت ۔ اب ان سب میں تو پہلے نفی تھی

تو اِلّا کے ذریعہ ہوگیا ثبوت۔ یہاں پہلے ثبوت ہے۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ بے شک انسان خسارہ میں ہے تو اب اِلّا آیا تو اگر آگے کُچھ بھی نہیں تو پتہ چل گیا کہ کچھ تو ہیں جو خسارے میں نہیں ہیں ورنہ اِلّا آتا ہی نہیں۔ اب وہ کون ہیں وہ یہ ہیں۔ تو اس اِلّا کا قاعدہ ہوتا ہے کہ یہ آجائے تو نتیجہ پورے جملے سے نکالا جائے تو ہدایت ہوتی ہے اور اِلّا کے پہلے سے نکالا جائے تو ضلالت ہوتی ہے۔ اِلّا کے پہلے بات ختم ہوجائے تو کفر ہوتا ہے اِلّا کے بعد والی بات ملائی جائے تو ایمان ہوتا ہے تو اب یہاں بھی نتیجہ قبل والے سے نہیں نکالا جاسکتا کہ انسان خسارے میں ہے جب تک اس کے ساتھ اِلّا نہ رکھا جائے۔ تو اب اِلّا کے بعد نتیجہ یہ ہے کہ تمام نوع انسانی دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ کچھ وہ ہیں جو خسارے میں ہیں کچھ وُہ ہیں جو خسارے میں نہیں ہیں۔ خسارے میں وہ ہیں کہ جو اِلّا کے بعد والے لوگوں کے علاوہ ہوں اور جو اِلّا کے بعد ہیں وہ خسارے میں نہیں ہیں۔ تو اب جب دو قسم کے لوگ ہیں تو ذہن یہ کہتا ہے تو پھر یوں کیوں ہوا کہ خسارہ میں ہیں مگر وہ جو ایمان لائیں نیک اعمال کریں وغیرہ وغیرہ۔ یوں ہوجاتا کہ سب انسان نفع میں ہیں سوائے ان کے جو کافر ہوں جو بداعمال ہوں جو باطل کی طرف لے جائیں جو بے صبری کی دعوت دیں۔ کوئی کہے جب بات ایک ہی ہے دونوں کا مطلب ایک ہے تو دل یہ کیوں چاہ رہا ہے کہ یوں ہوتا۔ یعنی کچھ خواہش ہے کہ یوں ہوتا جبھی تو یہ تصوّر پیدا ہوا۔ تو یہ آخر دل کیوں چاہ رہا ہے کہ یوں ہوتا۔ تو اب یاد رکھئے کہ ذرا سی تبدیلی میں کلام کا نفسیاتی اثر بہت بدل جاتا ہے۔ اگر اس طرح ہوتا کہ سب نفع میں ہیں سوا ان کے جو باطل کی طرف لے جائیں اور بداعمال ہوں تو اصل کلام ہوتا بشارت۔ جونہی ہم سُنتے کہ سب نفع میں ہیں دِل خوش ہو

جاتا طبیعت کھِل جاتی اور بالیدہ ہوجاتے۔ اب آیا کرتا کہ وہ جو کافر ہیں اور بداعمال ہیں تو ہم اسے غور سے سُنتے بھی نہیں کہ وُہ کوئی ہوں گے۔ ہم سے کیا مطلب۔ لیکن جب یہ ہوا کہ سب انسان خسارے میں ہیں تو طبیعت بُجھ گئی دل افسردہ ہوگیا ذہن پریشان ہوگیا۔ اب بعد میں آرہا ہے کہ مگر جو ایمان لائیں نیک اعمال کریں جو حق کی ہدایت کریں جو صبر کی تلقین کریں۔ وہ سب بعد میں آگیا تو وہ جو افسردگی پیدا ہوئی وہ جو پژمردگی چھاگئی وہ جو غم کے بادل اُمڈ آئے وہ ایک دم کہاں دُور ہوئے۔ کہنے والے نے کہہ دیا۔ تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو۔ رونا ہے کوئی ہنسی نہیں ہے۔ ہنسی تو ایک دم سے ختم ہوجاتی ہے مگر رونا جو ہے وہ ایک دم سے ختم نہیں ہوتا تو اب جو غم طبیعت پر چھا گیا تو بعد میں استثنا ہوا بھی تو کیا۔ تو آخر وہ کیوں نہ ہوا۔ تو جو انسان کا دل چاہتا ہے اس کے لئے دلیلیں بھی اس کے ذہن میں آجاتی ہیں۔ اب قرآن کی ایک آیت بھی جیسے ہمت بڑھا رہی ہے کہ ہاں اگر یوں ہوتا تو جیسے زیادہ مناسب تھا۔ کیوں۔ اس لئے کہ قرآن میں ہے سبقت رحمتہ غضبہ۔ اس کی رحمت غضب سے آگے ہے۔ تو جو تقاضائے رحمت ہے وہ پہلے بیان ہونا چاہیئے اور جو تقاضائے غضب ہے وہ بعد میں بیان ہونا چاہیئے۔ مگر صاحب اب کیا کیا جائے کہ یوں نہیں ہے۔ اسی طرح ہے۔ کلام اسکا ہے جس کے بارے میں یہ کہہ نہیں سکتے کہ معاذ اللہ غلط ہے۔ ارے بھئی انبیاء کی منزل تک ترکِ اولیٰ بھی ہوسکتا ہے۔ خدا کے ہاں ترکِ اولیٰ کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ صلوٰۃ۔ تو جو ہے وہی سب سے بہتر ہے۔ یہ سوچنا ہی غلط ہے اور یہ تو عرف عام میں کچھ جملے ہیں تو یاد رکھیئے وہ اگر سمجھ کر کہے جائیں۔ ارادۃً۔ تو وُہ کفر بن جائیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بطور تکیہ کلام ہے۔

یہ جیسے ایک محاورے کے طور پر ہے۔ بے سمجھے ہے اس لئے کوئی فتویٰ جاری نہیں ہوتا۔ مثلاً بہت سی باتوں کو کہہ دیتے ہیں کہ کیا بے وقت یہ چیز ہوئی ہے کسی کی موت کو کہہ دیا کیا بے وقت یہ موت ہوئی ہے۔ بارش کو کہہ دیا کہ یہ بے وقت بارش ہوئی ہے۔ یاد رکھئے یہ بے وقت اور باوقت کا جائزہ ہمارا کام نہیں ہے۔ جو فاعل حکیم ہے اور اُسے باوقت سمجھ رہا ہے اسے ہمیں بے وقت سمجھنے کا کیا حق ہے۔ صَلوٰۃ۔

تو اب یہ تصوّر نہیں ہو سکتا۔ کلام الٰہی سمجھنے کے بعد یہ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں ہے اب یقیناً پھر کوئی بات ہے کہ اس طرح نہ کہا اور اُس طرح کہا۔ تو اب جو میں نے سوچا تو سمجھ میں آیا کہ جو کہا گیا ہے وہ بالکل عام اُصول کے مطابق ہے۔ عام اُصول یہ ہے کہ جو اکثریت کے لئے بات ہو وہ بطور عموم بیان ہوتی ہے جو اقلیّت کے لئے ہو وہ بطور استثنٰی بیان ہوتی ہے اگر یہ ہوتا کہ کفر کے مقابلے میں ایمان زیادہ اور بد اعمالی کے مقابلے میں حسنِ عمل زیادہ اور باطل کے مقابلے میں حق زیادہ اور بے صبری کے مقابلے میں صبر کے نمونے زیادہ ہوتے تو اس طرح ہوتا۔ لیکن اس طرح اس لئے نہیں ہوا کہ۔ کفر کے مقابلے میں ایمان کم۔ بد اعمالی کے مقابلے میں حسن عمل کے نمونے کم۔ باطل کے مقابلے میں حق کم اور بے صبری کے مقابلے میں صبر کم۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اکثریت دلیل حقانیت نہیں ہے کیونکہ اگر اکثریت دلیل حقانیت ہو تو ایمان کے مقابلے میں کفر حق۔ حسن عمل کے مقابلے میں بداعمالی حق۔ حق کے مقابلے میں باطل حق اور صبر کے مقابلے میں بے صبری حق۔ ہاں غلط فہمی نہ ہو۔ یہ میں نہیں کہنا چاہتا کہ اقلیّت دلیل حقانیت ہے کہ کوئی ایسا باطل جسے اتفاق سے ماننے والے کم ملے وہ اسے اپنی دلیل بنالے۔

ہیں کہتا ہوں حق حق ہے چاہے ماننے والے زیادہ ہوں چاہے کم ہوں - یہ اکثریت اور اقلیت تو ہوا کے جھونکوں کی طرح بدلتی ہے - ایک دفعہ جسے زیادہ رائیں ملتی ہیں دوسری دفعہ اسی کو کم ملتی ہیں - یا اس دفعہ اکثریت غلطی پر تھی یا اس دفعہ غلطی پر ہے - تو یہ تو ہوا کے جھونکوں کی طرح بدلتی ہیں اور حق وہ شے ہے جسمیں تبدیلی نہیں ہے - تو یاد رکھیئے کہ جو بدلنے والی چیز ہے اسکا معیار وہ ہونا چاہیئے جو برقرار ہو - جو برقرار چیز ہے اسکا معیار بدلتی ہوئی چیز نہیں ہو سکتی - صَلوٰۃ -

اسی لیئے یہ تصوّر غلط ہوگا کہ بہت سے لوگ دینی تعلیمات کو سائنس کی کسوٹی پر کستے ہیں - اور بعض حامیان دین، دین کی خدمت یہی سمجھتے ہیں کہ جو سائنس کا نظریہ ہو ثابت کرو کہ دین بھی یہی کہہ رہا ہے - مگر یہ بالکل غلط ہے اس لیئے کہ ہر سائنس داں کو معلوم ہے کہ سائنس کتنی کروٹیں بدلتی ہے - سائنس میں کتنی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں - ایک وقت اگر قرآن نے اس وقت کی سائنس کی تائید میں آپ کے ثابت کرنے سے سمجھا کہ وہ اس کے حق میں ہے تو جب وہ نظریہ بدل جائے گا تو اب آپ کو قرآن بدلنا پڑے گا - اور قرآن وہ ثابت حقیقت ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں اور سائنس وہ چیز ہے جو بدلتی رہتی ہے - لہٰذا جو بدلنے والی چیز ہے اسکو ثابت حق کی کسوٹی پر کسیئے - صَلوٰۃ

یہ انداز بیان قرآنی خود ہی بتلا رہا تھا کہ یہ جماعت کتنی کم ہے کہ اسکا بیان بطور استثنیٰ ہوتا ہے اور اب اس کے بعد عربی میں دو حرف عطف ہیں - ہیں تو بہت سے مگر مجھے جن سے مطلب ہے وہ دو ہیں ایک اَوْ - اور ایک واؤ - بغیر الف کے - ان دونوں کے معنی کیا - اَوْ معنی یا - یا یہ یا یہ - واؤ کے معنی اور - آپ کے ہاں بھی بہت مثالیں ہیں - تو ان میں اگر کسی صورت

سے یوں ہوتا۔ وہاں دل چاہ رہا تھا اس طرح۔ اب یہاں دل چاہ رہا ہے کہ اس طرح ہوتا کہ [اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اَوۡ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَوۡ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ اَوۡ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ۔ سب خسارے میں ہیں سوا ان کے جو ایمان لائیں یا نیک اعمال کریں یا حق کی ہدایت کریں یا صبر کی تلقین کریں۔ تو یوں ہوتا تو پھر بھی اتنی اقلیت نہ رہتی دوسری لفظوں میں کہوں کہ بہشت اتنا خالی نہ رہتا۔ اسکی آبادی میں کچھ تو اضافہ ہو جاتا اس لئے کہ ہر جگہ ایمان لائیں یا نیک عمل کریں یا حق کی ہدایت کریں۔ تو میری تو چونکہ عمر درسگاہ میں گزری ہے ۲۷ برس لکھنؤ یونیورسٹی میں رہا ۱۵ برس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں رہا تو میرا سابقہ طلباء ہی سے رہا ہے۔ انکی ہی مثالیں بھی یاد آتی ہیں۔ تو جناب بی اے وغیرہ کے امتحان میں بعض مضامین لازمی ہوتے ہیں بعض اختیاری ہوتے ہیں اور وہ مضامین جو اختیاری ہیں ان میں ہر ایک کو لینے کا بھی حق ہے ہر ایک کو چھوڑنے کا بھی حق ہے۔ اب ان اختیاری مضامین میں سے کسی نے اسکو لیا اور کسی نے اسکو نہیں لیا تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں کہ تم نے اسے کیوں لیا اور اسکو کیوں نہیں لیا۔ کہا ہمیں یہی پسند ہے یہی آسان ہے۔ کسی نے اسکو لیا اسکو نہیں لیا تو کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں اس کے لئے وہی آسان ہے اسکو وہی پسند ہے۔ اس طرح سے پرچے جو دیئے جاتے ہیں تو چونکہ مقصود تو اساتذہ کا یونیورسٹی کے کرتا دھرتا حضرات کا یہ نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ فیل ہوں اسمیں ادارہ کی بھی بدنامی ہے اور پھر طلباء کیلئے آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ دس سوال دیئے جاتے ہیں کہ ان میں سے کم سے کم پانچ سوالوں کے جواب مطلوب ہیں۔ اب وہ طالب علم اس وقت دیکھتا ہے کہ میرے لئے کون سے آسان ہیں یا مجھے کون سے یاد ہیں۔ اب جو آسان ہوتے یا جو یاد ہوتے ان پر اس نے لال پنسل سے

نشان بنا دیا کہ مجھے یہ کرنے ہیں۔ دُوسرے طالب علم نے کسی دُوسرے پر نشان بنا دیئے جو اُسے یاد ہیں۔ نہ اُسے اس سے جھگڑا کرنے کا حق نہ اُسے اسپر اعتراض کرنے کا حق۔ اسے وُہ پسند ہیں اسے یہ پسند ہیں۔ اسکو اسمیں آسانی ہے اسے اس میں آسانی ہے۔ تو اگر یہ ہوتا کہ ایمان لائیں یا نیک اعمال کریں یا حق کی دعوت دیں یا صبر کی تلقین کریں۔ تو جناب میں تو اپنی کہتا ہوں۔ اسمیں آپ بھی غور کریں کہ آپ اس میں شریک ہیں یا نہیں۔ میں تو لال پنسل سے 'اٰمَنُوْا' پر نشان بنا دیتا۔ یہی زیادہ آسان ہے کیونکہ دل کو شگافتہ کر کے کون دیکھے گا کہ ایمان ہے یا نہیں تو ایمان کا مضمون میں لے لیتا۔ اب جب ایمان کا مضمون لے لیا تو اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ نماز کیوں نہیں پڑھتے کیونکہ وہ تو عمل صالح کا جز ہے۔ ہم نے صاحب وہ مضمون لیا ہی نہیں ہے۔ اب آپ ہم سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ نماز بھی پڑھو۔ آپ ہم سے نہ کہیئے کہ روزہ کیوں نہیں رکھتے اس لئے کہ وہ بھی تو عمل صالح ہے۔ ہم نے عمل صالح چھوا ہی نہیں ہے۔ ہم نے اس پر نشان ہی نہیں لگایا ہے اور اسی طرح اور منہیات۔ یہ نہ کہیئے کہ دُوسرے کا مال کیوں لیتے ہو یہ تو سب عمل صالح کا جز ہیں۔ کچھ منفی ہیں کچھ مثبت ہیں۔ کچھ اوامر ہیں کچھ نواہی ہیں۔ ہم نے وہ شعبہ ہی نہیں لیا ہے جو اس مصیبت میں پھنسیں۔ لہٰذا بس یہ دیکھ لیجئے کہ 'اٰمَنُوْا'۔ بحمداللہ ہماری پوری جماعت کا لقب ہے مومنین کرام۔ تو ادھر مردم شماری کے رجسٹر میں اس فرقہ میں نام آیا۔ خانہ مذہب میں اپنا نام آیا ادھر مومنین تو ہو گئے۔ اور جب مومنین ہو گئے تو پھر عمل صالح سے کیا واسطہ، لیکن اگر آپ نے یہ جز پسند کر لیا اور اپنے ذمہ لے لیا تو پھر دُوسرے کو حق ہے کہ وہ نشان عمل صالح پر لگائے۔ پھر اب اس سے ایمان کا مطالبہ نہ کیجئے گا۔ یہ دیکھ لیجئے کہ مسجدیں

توخالی نہیں رہتیں۔ یہ دیکھئے کہ نماز کے وقت کیسی تیزی سے دوڑتے ہیں۔ یہ دیکھئے کہ حج میں کتنے آدمی جاتے ہیں۔ اب یہ نہ کہیئے گا کہ کیا فائدہ۔ ایمان تو ہے نہیں جی آپ کو ایمان سے فائدہ ہو گیا بغیر عمل صالح کے اور کسی کو عمل صالح سے فائدہ نہ ہوا بغیر ایمان کے۔ اصول تو ایک ہوتا ہے۔ آپ کو یہ مضمون پسند کسی کو دوسرا مضمون پسند۔ اس نے عمل صالحات لے لیا ہے ایمان سے بحث نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے بحث تو آپ کو کیا ہے۔ اور ابھی ختم تھوڑی ہوئی ہے۔ بات۔ اَوْ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ اب ہمارے جیسے واعظان بے عمل کے لئے بڑی آسانی ہے۔ جسکو اللہ نے قوت تقریر عطا کی وہ گیا اور دعوت حق دینی شروع کر دی اس لئے کہ اللہ نے زبان عطا کی ہے اور زبان میں قوت تقریر ہے اور دعوتِ حق تو زبان سے ہوتی ہے دیکھ لو کہ ہماری زبان رکتی تو نہیں دعوتِ حق دینے سے۔ اب یہ نہ دیکھو کہ ہم بھی حق پر ہیں یا نہیں۔ اب ہم میں ایمان تلاش نہ کیجئے گا اور ہم میں عملِ صالح بھی تلاش نہ کیجئے گا کہ صاحب ہم نے تیسرے مضمون پر لکیر لگائی ہے ہم نے اسے اپنایا ہے اب جب تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ہے اور اس پر ہمارا عمل ہے تو ہمیں نہ اٰمَنُوْا سے مطلب نہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے غرض نہ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ سے مطلب صرف تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ دیکھئے کتنا عمدہ ہو جاتا ہے کتنی عمدہ ہم تقریر کر لیتے ہیں حق کی دعوت دیتے ہیں۔ اب اس کے بعد جانچ نہ کیجئے گا ہمارے کسی اعتقاد و عمل کی۔ اب اس کے بعد تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ اب جو مطلب صبر کا سمجھیں ہم۔ کسی کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھا کہا خبردار صبر کرو آنسو بہانا خلاف صبر ہے۔ زبان سے آہ آہ سنی۔ انہوں نے کہا ہائیں خلافِ صبر ہو گیا۔ اب عمر گزری دعوتِ صبر دیتے ہوئے۔ اب آپ ہم سے ایمان بھی چاہتے ہیں۔

عمل صالح بھی چاہتے ہیں وصیت حق بھی چاہتے ہیں۔ اس سے ہمیں مطلب نہیں۔ ہم نے تو صبر کے شعبہ کو لیا ہے وصیت صبر دوسروں کو کہتے ہیں چاہے خود کتنے ہی بے صبرے کیوں نہ ہوں۔ تو اب جب یہ سب میں نے عرض کر دیا تو آپ میں سے کسی کا ضمیر یہ قبول نہیں کرتا کہ یہ ٹھیک ہے۔ آؤ۔ آؤ کہنے کے بعد تو یہ آسانیاں ہوتیں لیکن اب میں کیا کروں کہ وہاں تو ہے اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۥ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ سب خسارہ میں ہیں سوا ان کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور ایک دوسرے کو حق کی ہدایت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔ اب اور کے معنی ہوتے ہیں مطالبہ اجتماع۔ میں کہوں کہ آپ اور آپ کل تشریف لائیے گا تو میں آپ سے ایک خاص بات کہوں گا۔ اب دوسرے دن اکیلے آپ آئے میں کہوں گا جناب میں نے تو کہا تھا آپ اور آپ اب وہ شرط تو پوری نہیں ہوئی۔

وصیت حق بھی ہو بقدر ضرورت۔ یہ ضرورت تھوڑی ہے کہ وہ منبر پر جا کر ہی خطبہ پیش کر سکے نہیں۔ جیسی زبان سے جیسے انداز سے وہ حق کی طرف دعوت دے سکتا ہو۔ اس انداز سے وہ دعوت دے اور تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ دوسروں کو بھی صبر کی دعوت دے۔ اگر مزید کہیں بیان ہوا تو عرض کروں گا کہ صبر کی دنیا کتنی وسیع ہے۔ اس میں کتنی چیزیں داخل ہوتی ہیں۔ تو اب یہ تمام چیزیں ہوں تو خسارے سے بچاؤ اور اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو آئینی طور پر تو حکم سابق بحال ہاں تفضل خالق پر مجھے پہرہ لگانے کا حق نہیں۔ خسارے سے بچنے کا استحقاق نہیں ہو سکتا۔ صلوٰۃ۔ تو چاروں ہوں ایمان بھی عمل صالح بھی ایک دوسرے کو حق کی ہدایت بھی اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین بھی۔ یہی تواصوا بالصبر جو ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے کہ جس راستے

کوتم صحیح سمجھتے ہو تو دوسرے کو بھی اسکی دعوت دو۔ دوسرا کوئی غلط راستے پر جا رہا ہے تو اسکو ٹوکو اُسے بتاؤ کہ یہ غلط راستہ ہے۔ اُسے روکنے کی کوشش کرو۔ یہ سب چیزیں تواصوا بالصبر کے تحت میں تو یہ سب باتیں ہر آدمی کا فریضہ عینی ہیں کہ ایمان بھی شرط۔ عملِ صالح بھی شرط۔ حق کی طرف ہدایت بھی شرط اور تلقین صبر بھی شرط۔ یہ تمام چیزیں بحیثیت مجموعی شرائط میں سے ہیں۔ خسارے سے بچنے کے لیے۔ اور جب میں غور کرتا ہوں تو یہ سب اوصاف آپس میں دست وگریباں نظر آتے ہیں۔ ایمان اور عمل صالح میں باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ تو وہ ہے کہ ہمارے علمانے بچوّں تک کو سکھانے کے واسطے محاورہ قائم کیا ہے۔ اُصولِ دین اور فروعِ دین۔ کیا معنی۔ بچوں کو معنی بھی اس کے بتائے جاتے ہیں۔ اُصولِ دین۔ دین کی جڑیں۔ فروعِ دین۔ دین کی شاخیں۔ اب جڑ اور شاخ میں جو باہمی تعلق ہے وُہ اُصولِ دین اور فروعِ دین میں ہے۔ اصُولِ دین کو دیکھئے تو وہ نمایاں طور سے عقائد کا مجموعہ ہے اور فروعِ دین کو دیکھئے تو وُہ تمام اعمال کا مجموعہ ہے اور گویا وہ اٰمَنُوْا کے لفظ کی تشریح ہے اور یہ عملوا الصالحات کے لفظ کی تمثیل ہے۔ دونوں جیسے وہاں برابر کے جملے ویسے ہی یہ دونوں برابر کے حکم اصولِ دین اور فروعِ دین۔ تو اب یہ جڑیں اور شاخیں۔ ان کے خصوصیات دیکھئے۔ جڑیں عموماً پردہ زمین میں تہہ خاک پھیلتی ہیں۔ اس کے رگ و ریشے زیر زمین پھیلتے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے جو ہوتی ہیں وہ شاخیں ہوتی ہیں۔ یونہی عقائد حقہ دل و دماغ کی اندرونی زمین میں انکے رگ و ریشہ پھیلتے ہیں اور اعمالِ صالحہ ہے جو شاخوں کی صورت میں اعضا و جوارح سے نمودار ہوتے ہیں۔ تو اب صِدقِ دل سے سوچیئے کہ اگر شاخیں خشک ہیں یا وجود ہی نہیں رکھتیں تو کیا اس کے معنی یہ

نہیں ہیں کہ جڑیں، ہی کمزور ہیں یا وجود ہی نہیں رکھتیں۔ ارے جناب آثار سے مؤثر پہچانا جاتا ہے نتائج کو دیکھ کر اسباب کا پتہ لگایا جاتا ہے جب شاخیں نظر نہیں آرہی ہیں تو لازمی طور سے ماننا پڑے گا کہ دل و دماغ کی زمین میں اصُول نہیں ہیں اب اگر عقائد حفظ ہیں تو یہ باپ دادا کے سکھائے ہوئے زبان پر ہیں اور اگر افعال اس کے مطابق ہیں وُہ رسم و رواج کے ماتحت ہیں ورنہ اگر دل و دماغ کی تہوں میں وہ تصوّرات مضمر ہوں تو ممکن ہی کیونکہ ہے کہ اعضا و جوارح سے اسکی زندگی کا اثر نمودار نہ ہو۔ اور اب ہر ایک اندازہ کرے کہ جب شاخیں افسردہ ہوں پژمُردہ ہوں تو کیا پانی لاکر اس میں شاخوں کو ڈبو یا جاتا ہے کچھ نہیں ہو گا۔ شاخیں اگر کمزور ہیں تو جڑ کی خبر لیجئے۔ جو کچھ پانی دینا ہو تو جڑ کو دیجئے۔ جب اس میں زندگی ہو گی تو خود بخود شاخیں پیدا ہو جائیں گی۔ یاد رکھئے کہ اگر صحیح مصرف میں استعمال ہوں تو یہ ہماری مجلسیں جڑوں ہی میں پانی دینے کے لئے ہیں۔ صَلوٰۃ۔

مگر وہی بات ہے کہ اگر ہم مجالس بھی کر رہے ہیں اور پھر بھی شاخیں خشک ہی نظر آرہی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری مجالس رسمی طور پر ہیں۔ ہماری مجالس بھی اس مقصد کو حاصل نہیں کر رہی ہیں جو مقصد ان مجالس کا تھا یہ تو اس صورت میں ہے کہ جب اصل پژمردہ ہے یہ ثابت ہو گیا شاخوں کے پژمُردہ ہونے سے یا شاخوں کے نہ ہونے سے اور اگر اصل نہیں ہے یعنی ایمان دل و دماغ کے اندر نہیں ہے اور شاخیں ہیں بڑی تر و تازہ۔ بڑی گھنی تو یاد رکھئے کہ پھر یہ شاخیں نمائشی ہوں گی وہ شاخیں جو اصل سے متصل نہیں ہیں وہ شاخیں نمائشی ہوں گی اور نمائشی شاخوں کی خاصیت ہے بیکار نہیں ہوتیں۔ وہ نمائشی شاخیں بھی زینت چمن کا کام دیتی ہیں رونق گلزاران

سے ہو جاتی ہے لیکن یاد رکھیئے کہ وُہ حوادث زمانہ کے تیز و تند جھکڑ کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ متوازن حالات رہیں تو وہ شاخیں لگی رہیں گی برقرار رہیں گی اور ذرا اگر کٹھن منزل ہوئی کوئی انقلاب کا سخت جھونکا آیا تو وہ شاخیں تتر بتر ہو جائیں گی کوئی کہیں کوئی کہیں معلوم ہو گیا کہ شاخیں تھیں مگر جڑیں نہیں تھیں۔ تو حضور والا - یہ ہونگی وہ شاخیں جو بغیر اصُول ہوں اور دُوسری خاصیت یہ ہے کہ جناب رونق چمن ہو جائے گی - زینت کاشانہ ہو جائیں لیکن ان شاخوں سے ثمر حاصل نہیں ہو سکتا۔ ثمر انہی شاخوں سے حاصل ہو سکتا ہے جنکا تعلق جڑوں سے ہو۔ اور پھر جیسی شاخیں ہوں اگر پژمُردہ ہیں تو ثمر بھی اس کے پژمُردہ ہوں گے اگر زندہ شاخیں ہیں تو ثمر بھی ان کے زندہ ہوں گے۔ تو جناب ثمر ان شاخوں سے نہیں مل سکتے جو بغیر اصُول ہوں۔ مگر اُس سے بھی ثمر ملے گا تو شاخوں کے ذریعہ ہی ملے گا۔ صَلوٰۃ۔

اسی بنا پر آپ دیکھیئے جو جو چیزیں ہیں۔ جنّت ہے ہر مسُلمان کی تمنّا اور نعمات جنّت وہ سب جنّت کے ساتھ حور و قصور کوثر و تسنیم۔ جو کچھ بھی ہے سب کچھ۔ اور جنّت بھی ہری بھری چیز ہے اور تمناؤں کے سبز باغ بھی ہرے بھرے ہیں - تو کون مسلمان ہے جو ان سبز باغوں کو نہیں دیکھ رہا ہے جنّت وہاں دیکھے گا سبز باغ یہاں دیکھ رہا ہے۔ وہاں کی خبر خدا جانے یہاں کی خبر خود اس کے ہاتھ میں ہے کہ تمنّائیں ہیں آرزوئیں ہیں۔ ہر ایک مسلمان کی۔ بہشت عنبر سرشت کس مسُلمان کی آرزو نہیں مگر میری ایک کتاب بھی نکلی ہے " وعدہ جنّت " اسمیں ۹۳ آیتیں قرآن مجید کی جمع کر کے میں نے پیش کی ہیں کہ ہر جگہ جنّت کا وعدہ عمل صالح کے ساتھ مشروط ہے اور کوئی ایک آیت مجھے نہیں ملی جس میں تنہا ایمان پر عمل صالح کے بغیر جنّت کا وعدہ

ہو تو صاحب جس کے ہاتھ میں جنّت ہے اس نے وعدہ تو ان دو شرطوں کے ساتھ کیا ہے۔ اب ہم کس دستاویز سے مطالبہ جنّت کریں گے تو ایمان اور عملِ صالح دونوں درکار ہیں۔ اب مسلمان بہر حال سہولت پسند آدمی ہے لہٰذا تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر اپنا لقب اُمّت مرحومہ رکھ لیا ہے۔ بحیثیتِ مسلمان ہمارا محاورہ ہے۔ بحمد اللہ اُمتِ مرحومہ میں سے ہونے کا میں بھی دعویدار ہوں۔ تو سب اُمّت مرحومہ۔ پوری اُمّت اُمّتِ مرحومہ۔ تو دل کو لگتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ رحمۃ للعالمین کی بدولت ہم سب اُمّتِ مرحومہ قرار پاتے ہیں۔ تو یہ جبھی تو ہوگا کہ جب ہمارا اور رحمۃ للعالمین کا راستہ ایک ہو یعنی جس طرف ان کا رُخ ہے ہمارا رُخ بھی اسی طرف ہو۔ تب تو جو رحمتِ الٰہی کی گھٹا اُٹھے گی اور ان پر برسے گی تو کچھ نہ کچھ ہم تک بھی آجائیگی۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمارا اور ان کا راستہ الگ ہوگیا وہ اُدھر جارہے ہیں۔ اور ہم اِدھر جارہے ہیں تو اب بتایئے رحمتِ الٰہی آئے گی تو اُدھر جائیگی یا اِدھر آئے گی پھر یہ کہ اُمت ہونا ایک رشتہ ہی تو ہے۔ تو اگر ہم خود کو رسول کی اُمّت کہیں تو رسول بھی تو ہمیں اپنی اُمّت مانیں ورنہ یک طرفہ دعویٰ ہوگا۔ ہم لاکھ کہہ رہے ہیں کہ ہم رسول کی اُمّت ہیں اور پیغمبر ہمیں اپنی اُمّت نہیں سمجھتے۔ رسول کی زبانی ایک اعلان ہے کہ من تبعنی فانہ منی جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے تعلّق رکھتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جو پیروی نہ کرے وہ مجھ سے تعلّق ہی نہیں رکھتا تو اُمّت ہونے کا کیا ذکر۔ اس کے بعد ایک سخت تر منزل ہے۔ نازک تر منزل۔ وہ یہ کہ پیغمبر فرما بھی دیں میری اُمّت تو اللہ بھی تو مانے پیغمبر کی اُمّت۔ کیونکہ نجات اس کے ہاتھ میں ہے کوئی کہے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ پیغمبر فرمائیں میری اُمّت اور اللہ اسکو

نہ مانے۔ اسکی اُمّت نہ سمجھے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ نہیں ہو سکتا ہے تو حضرت نوح بھی تو پیغمبر تھے اور اولوالعزم پیغمبر تھے وہ بارگاہِ الٰہی میں کہہ رہے تھے۔ ان ابنی من اھلی میرا بیٹا میرے اہل سے ہے۔ دُہری دُہری نسبتیں اپنی طرف دے رہے تھے۔ بیٹے ہونے کی نسبت بھی۔ میرا بیٹا۔ دُوسری نسبت اہل کی کہ میرا اہل تو خالق نے پہلی نسبت کی نفی نہیں فرمائی یہ نہیں فرمایا کہ انہ لیس یا بنک۔ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔ وُہ نسبت برقرار۔ یعنی بیشک ہے تمہارا بیٹا لیکن انّہٗ عملٌ غیر صالح یہ اعمال اچھے نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا عمل غیر صالح ایسی چیز ہے جو بیٹے کو اہل سے خارج کر دیتا ہے تو اُمّت ہونا کیا چیز ہے اور اب یوں ماشاء اللہ آپ کی محبّت اور توجہات اور پھر احساس اور شعور بھی ایک حد تک بیدار ہو گیا ہے۔ کارآمد چیزیں بھی کبھی کبھی سن لینی چاہیئں اور آپ سن رہے ہیں لیکن یہ کہ وہ بہت تلخ باتیں ہیں۔ جو ابھی تک کر تا رہا ہوں اب ذرا ذہن آپ کا متوجہ کر دوں۔ آپ کے ایک مطلوبہ شعبۂ بیان کی طرف۔ وہ بھی حقیقت ہے اور حق ہے۔ میں کہتا ہوں جس رسول کی زبانی یہ اعلان ہوا کہ بیٹا اس لئے اہل نہیں ہے کہ اس کے اعمال صحیح نہیں ہیں تو اب رسول اگر سبز چادر کے نیچے لے کر کسی کو اگر کہے گا کہ پروردگار یہ میرے اہل ہیں تو وہ صرف رشتہ داری کی بنا پر نہیں ہو گا وہ ان کے عمل کے معیار کو دیکھ کر ہو گا۔ تو حضور والا میں نے قرآن سے مثال پیش کر دی ہے اور ہم میں کا ہر فرد بحمد اللہ مسلمان ہے اور قرآن کو مانتا ہے۔ لہٰذا شاید لاجواب تو ہو جائے۔ کہے کچھ نہیں لیکن یہ بات حلق سے اُترے گی نہیں یعنی دین میں کچھ ایسے ہو گا کہ ہاں حضرت نوح تک تو یہ ہو گیا۔ اب کیا کریں قرآن میں ہے تو ماننا پڑے گا کہ ایسا ہو گیا لیکن ہمارے رسول کہیں

میری اُمّت اور پھر اللہ نہ مانے ان کی اُمّت۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے ایک مُسلمان کا دل شاید اب بھی قبول نہ کرے مگر آیئے ہمارے اور آپ کے رسول۔ صحاح سِتہ میں۔ یہ لفظ اعتماد کے لئے کافی ہے۔ اسکی وقعت جمہور اُمّت میں مسلّم ہے۔ پھر صحیحین۔ اور مرتبہ اونچا ہوا اور ان میں بھی جناب صحیح بخاری۔ یوں تو تمام صحاح کی متفقہ ہے مگر صحیح بخاری میں مختلف ابواب میں بمناسبت تیرہ جگہ یہ حدیث موجود ہے۔ اب میں الفاظ حدیث پڑھ رہا ہوں چونکہ تیرہ جگہ ہے یہ حدیث لہٰذا کسی راوی نے کسی لفظ کو کسی طرح کہا ہے کسی نے کسی طرح مگر مضمون ایک ہی ہے اور جو الفاظ مجھے یاد ہیں اور وہ صحیح بخاری میں بھی ہیں وُہ میں پڑھ رہا ہوں کہ پیغمبرِ خداؐ ارشاد فرما رہے ہیں کہ یَرِدُ عَلَیَّ اُنَاسٌ مِنْ اُمَّتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ صحاح سِتّہ کی لفظ تو وقعت پیدا کرنے کے لئے ہے ورنہ شہرت عام کے لحاظ سے کہہ رہا ہوں کہ ہے مشکوٰۃ شریف میں بھی۔ جو داخلِ نصاب بھی ہے۔ اُمّت کے کورس میں ہے۔ میرے پاس روزِ قیامت میری اُمّت کے کچھ افراد لائے جائیں گے دیکھتے امتی کی لفظ سب کے لئے ہے۔ بلا استثنیٰ پُوری جماعت کے لئے امتی کی لفظ ہوگئی۔ رسول کی طرف سے نسبت ہوگئی۔ مگر اب ہوتا کیا ہے۔ میری اُمّت میں سے کچھ لوگ میرے پاس لائے جائیں گے۔ یاد رکھئے کہ وُہ عام برتاؤ جو ہے مسجد میں آنے دینا اپنے پہلو میں بیٹھنے کی اجازت دینا۔ اپنے گرد و پیش انہیں وقت دینا۔ جتنا وقت چاہیں صَرف کریں وہ سب ہے فریضہ آئینِ رسالت۔ جسمیں اسبابِ ظاہری پر حکم مبنی ہوتا ہے اور یہ قیامت کے سلسلہ میں جو بات ہے وہ علم غیب پر مبنی ہے جو اللہ کا دیا ہوا ہے۔ ٹکرائیے گا کہ یہاں تو یہ کہہ رہے ہیں وہاں اپنی جماعت میں شامل کرتے

ہوئے تھے۔ وہ ان کے آئین کا تقاضا ہے یہ ان کے علم کا تقاضا ہے فرما رہے ہیں میرے پاس روزِ قیامت میری اُمّت کے کچھ لوگ لائے جائیں گے۔ کہاں حوضِ کوثر پر۔ جسکی اُمید سب کو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی کسی کو ساقی کہے کوئی کسی کو کہے مگر پیاس سب کو ہے۔ تشنگی بھی سب کو ہے۔ تو جناب حوضِ کوثر پر میرے پاس میری اُمّت میں کے کچھ لوگ آئیں گے آئیں گے یا آنا چاہیں گے۔ ظاہر ہے کہ حوض کوثر پر کیوں آئیں گے۔ اس لئے کہ پیاسے ہیں۔ اسلئے کہ پانی کے طلبگار ہیں فیحال بینی و بینھم لیکن میرے اور ان کے درمیان حائل ہو جایا جائے گا یعنی کچھ رکاوٹیں بیچ میں ڈال دی جائیں گی۔ اب پردے پڑ جائیں۔ فرشتوں کی صفیں بیچ میں حائل ہو جائیں۔ کیا ہو وہ اللہ جانے۔ پیغمبرؐ نے صیغۂ مجہول استعمال فرمایا ہے۔ فیحال حائل سے۔ سدِّ راہ۔ بینی و بینھم۔ میرے اور ان کے درمیان حائل ہو جایا جائے گا نتیجہ یہ ہے کہ پہنچنے نہ دیا جائے گا۔ فاقول یا رب اصحابی اصحابی۔ میں کہوں گا پروردگارا یہ تو میرے اصحاب ہیں میرے اصحاب ہیں اور کہوں گا یا رب اصحابی اصحابی ثلاثاً تین مرتبہ کہوں گا فیقال مگر کہا جائے گا لا علم لک بما احدثوا بعدلک۔ آپ تو آئین ظاہر کے پابند رکھے گئے تھے۔ آپ کو اس آئین کے مطابق کیا خبر کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا ہے۔ انھم ادعیوا الی اعقابھم القھقرہ۔ یہ لوگ پچھلے پیروں اپنے پرانے طریق پر پلٹ گئے تھے۔ اب دیکھا آپ نے رسول دہری دہری نسبت اپنی طرف دے رہے ہیں مگر اللہ کہتا ہے نہیں یہ اس لائق نہیں ہیں کہ آپ تک پہنچیں۔ تو اب رسول ہمیں اپنی اُمّت کہدیں اللہ اسے نہیں مانتا کیا کیا جائے۔ تو یہ تو اُمّت مرحومہ کے تصوّرات کا جائزہ تھا اور اب اُمّت مرحومہ میں سے

ایک فرقہ نے اپنا لقب فرقہ ناجیہ قرار دے لیا ہے۔ وہ فرقہ جو بحیثیت جماعت نجات کا حقدار ہے۔ تو میں نے اُمّت مرحومہ سے جرح کی۔ فرقہ ناجیہ ہونے کا بھی بحمد اللہ مجھے ادعا ہے۔ اس کو یونہی چھوڑ دوں ان سے جرح نہ کروں کہ آپ کو کیا حق صرف آپ فرقہ ناجیہ کیسے ہو گئے۔ جیسے اُمّت مرحومہ کی نمائندگی میں میں نے اسکی وجہ بیان کی تھی۔ لہٰذا اسکی وجہ بیان کرنے کا بھی حق ہے اور یہ بہت طاقتور وجہ ہے۔ میرے سامنے پیغمبر کی دو حدیثیں ہیں اور دونوں متفق علیہ۔ ایک حدیث میرے گذشتہ بیان کی بھی دلیل ہے اور وہ متواتر حدیث ہے ستفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ کلھم فی النار الا واحدۃ۔ میری اُمّت کے تہتّر فرقے ہوں گے۔ دیکھئے اُمّتی کی نسبت سب کے لئے ہے۔ گذشتہ حصّہ بیان سے بھی متعلّق ہے۔ یہ نہیں ہے کہ آدمیوں کے تہتّر گروہ ہوں گے۔ اُمّتی۔ میری اُمّت کے تہتّر فرقے ہوں گے کلھم فی النار الا واحدہ۔ سب دوزخ میں ہوں گے سوائے ایک کے۔ ایک کون یعنی ایک فرقے کے۔ ۷۳ فرقے ہوں گے سب آگ میں ہوں گے مگر بس ایک۔ اس حدیث سے بھی ہم سمجھے کہ صرف اُمّت ہونا کافی نہیں ہے۔ اُمّت کا وہ ایک فرقہ ہونا چاہیئے یہاں سے تو فرقہ کی لفظ آئی۔ خود ساختہ نہیں ہے۔ اب ہر صاحب عقل غور کرے کہ جب رسول نے یہ بتا دیا کہ ۷۳ فرقے ہیں اور سب دوزخ میں مگر ایک۔ اسی رسول کا تو یہ فرض بھی ہے کہ اس ایک کی کچھ پہچان بتاتے۔ صدق دل سے ہر مسلمان۔ صبر و سکون کے لمحات میں غور کرے جو عرض کر رہا ہوں کہ اگر پیغمبر نہ بتائیں تو ہر مسلمان کو دامن تھام کر اس مطالبہ کا حق ہے کہ آپ نے یہ تو بتا دیا کہ ۷۳ فرقے ہیں ڈرا تو دیا کہ بس ایک نجات کا حقدار ہے اور اس ایک کی پہچان

اب بتا نہیں رہے ہیں۔ یہ کہہ دیا کہ چورا ہا ہے اور ایک راستہ کی پہچان نہ بتائی۔ چہ جائیکہ ہفتاد و سہ راہا اور آپ وہاں ہمکو چھوڑ کر جا رہے ہیں اور یہ بتا کر نہیں جاتے کہ وہ ایک آخر کون ہے تو یہ ہر مُسلمان کو حق ہے کہ وُہ پیغمبر سے پوُچھے اور اگر کوئی ضعیف روایت بھی نہ ملے کہ کسی نے پیغمبر سے نہ پوُچھا ہو تو ماننا پڑے گا کہ پیغمبر نے بتایا اب جو بحمداللہ مجھے معلوم ہے وہ میں بتاؤں تو یا دُنیا اُسے تسلیم کرے یا خود بتائے کہ کیا بتایا۔ مجھے جو معلوم ہے وہ بھی متفق علیہ حدیث ہے کہ پیغمبر نے اس ایک کی پہچان بتائی کہ مثل اهلبیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجیٰ ومن تخلف عنھا غرق وھوا۔ میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اسپر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے تخلّف کیا وُہ ڈوبا اور گیا۔ کوئی کہے یہ کیا ترجمہ ہوا تخلّف کا ترجمہ تخلّف عربی سے عربی۔ میں عرض کروں گا کہ میں کیا کروں مجھے اُردو میں لفظ نہیں ملا۔ لہٰذا جملوں سے سمجھاؤں گا کہ جو کشتی پر بیٹھا ہی نہیں یا بیٹھ کر کہیں اُتر گیا۔ اور اب میں تخلّف کا منفی لفظوں میں اس تشریح کے بعد ترجمہ بھی کر سکتا ہوں کہ من تخلّف جو اس کشتی پر بیٹھا نہ رہا وُہ غرق وھوا وُہ ڈوبا اور ختم ہوا۔ میں نے کہا گیا۔ جو بھی تعبیر کر لیجئے۔ تو جناب وہاں سے فرقہ کی لفظ آئی اور یہاں سے ناجیہ کی لفظ آئی۔ جو کشتی اہل بیت پر سوار ہوا اس جماعت کو یقیناً فرقہ ناجیہ کہلانے کا حق حاصل ہے مگر اب سوال یہ ہے کہ کشتی پر بیٹھنے کے کیا معنی ہیں۔ یہاں کوئی جسمانی کشتی تو ہے نہیں نہ معاذاللہ اس طرح کا بیٹھنا ہے وہ تو مذمّت کا پہلو ہے۔ یہ تو کوئی عمل ہے جس کو استعارۃً کشتی میں بیٹھنا کہا گیا ہے۔ استعارہ کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ تشبیہ میں ایک مشبہ ہوتا ہے جس کو تشبیہ دی اور ایک مشبہ بہ

ہوتا ہے جس سے تشبیہہ دی اور ایک مشترک چیز ہوتی ہے دونوں ہیں ۔ کہ جو اس میں بھی ہے اسمیں بھی ہے ۔ وہ وجہ شبہ کہلاتی ہے ۔ آدمی کو کہہ دیا شیر تو جناب یہ آدمی حقیقت میں شیر تو ہے نہیں ۔ شیر کیوں کہا ۔ استعارۃً کہا ہے ۔ یعنی شجاعت ایک مشترک چیز ہے ۔ جو شیر کی بھی نمایاں چیز ہے اور اس انسان میں بھی نمایاں چیز ہے لہٰذا کہہ دیا شیر ۔ تو مشترک جو چیز ہو وُہ ہوتی ہے وجہ شبہ ۔ تو اب کوئی بات ایسی ہے جو مشترک ہے ہمارے کسی عمل اور کشتی پر بیٹھنے میں ۔ اب تلاش کرنا ہے ۔ کشتی پر بیٹھنے میں کیا خاص بات ہوتی ۔ تو کوئی کہے کہ صاحب ہماری سمجھ میں نہیں آتا ۔ جاتے ہیں کشتی پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ جہاز ہو جو کچھ بھی ہو ۔ بہ اختلاف زمانہ جو چیز بھی ہو اس پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ اسمیں ہوتا کیا ہے یہ عجب سوال ہے میں کہتا ہوں میرے اس تجزیہ سے شاید آپ محسوس کریں کہ میرا مطلب کیا ہے ۔ کشتی پر بیٹھنے سے کیا ہوتا ہے ۔ آپ ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی دریا میں جا رہی ہے اور آپ ساحل پر کھڑے کھڑے اسکی تعریف کرنا شروع کر دیجئے ۔ کتنی عمدہ کشتی ہے کیسی چال ہے کیسی رفتار ہے کیسی ساخت ہے ۔ تعریفیں کرنے لگئے ۔ تو غلط فہمی نہ ہو یہ تعریفیں کرنا ۔ اظہار حقیقت ہے واقعی اگر وہ اچھی ہے تو اچھا کہنا آپ کی سچائی کا تقاضا ہے اسکا حق ہے لیکن ساحل پہ کھڑے کھڑے یہ تعریفیں کرنا کشتی پر بیٹھنا تو ہے نہیں ۔ اور آگے بڑھئے ۔ وہیں ساحل پہ کھڑے کھڑے کہنے لگے کہ ہم اس کشتی سے بہت محبّت کرتے ہیں ہم اسکو بہت چاہتے ہیں بڑی پیاری کشتی ہے ۔ ہمیں اس سے بہت پیار ہے میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے اگر وہ کشتی اچھی ہے تو محبّت کرنی ہی چاہیئے اسکا حق ہے یہ محبّت کرنا کوئی ہمارا احسان نہیں ہے یہ اس کے حسن کا تقاضا ہے صلوٰۃ

توجناب یہ محبّت تو واقعی آپ کو ہونی چاہیئے اگر کرتے ہیں تو کوئی بُرا کام کرتے ہیں؟
میں کہتا ہوں کہ اگر ماحول ایسا ہو کہ اظہار محبت کرنے والوں کو سزا ملتی ہو تو یہ محبّت
جہاد بھی ہے۔ اس اظہارِ محبّت کی یقیناً بڑی قیمت ہوگی مگر ساحل پر کھڑے
کھڑے یہ کشتی پر بیٹھنا تو نہیں ہے۔ اور آگے بڑھیئے۔ وُہ جز تو محفوظ ہے کہ ہم
ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی ہے دریا میں۔ اور اب بادِ مخالف کے جھونکے
چلنے لگے اور اب کشتی ہوئی طوفانی اور ہم ساحل پر کھڑے کھڑے آنسو بہانے
لگے۔ ہائے یہ کشتی تباہ ہو رہی ہے یہ کشتی اس طرح برباد ہو رہی ہے۔ روئے
اور رونے کے جو تقاضے ہیں وہ سب پُورے کرتے رہے ہے۔ میں کہتا ہوں
کہ یہ آنسو بھی بے قیمت نہیں ہیں۔ یہ دردِ دل کی دلیل ہیں یہ قدر حسن کی
دلیل ہیں اور وہی بات کہ جب دُنیا ہنس رہی ہو تو یہ رونا بھی جہاد ہے مگر
وہ بات اپنی جگہ ہے کہ یہ ساحل پر کھڑے کھڑے کشتی پر بیٹھنا تو نہیں ہے تو
آپ کو مجھ سے پُوچھنے کا حق ہے کہ یہ نہیں ہے یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔
کشتی پر بیٹھنے میں کیا بات ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں میری جو سمجھ میں آیا ہے
وہ یہ بات ہے کہ جب کشتی پر جاکر ہم بیٹھ گئے تو نہ ہماری ذاتی حرکت کچھ
رہی نہ ذاتی سکون کچھ رہا۔ کشتی چلی تو ہم چلے۔ کشتی رُکی تو ہم رُکے۔ یہ معنی ہیں
کشتی اہل بیت پر سوار ہونے کے۔ اپنے حرکت و سکون کو تابع اہل بیت
بنایئے اور اگر اس معنی سے کشتی اہل بیت پر سوار ہوں تو ممکن ہی کہاں ہے
کہ کشتی ساحل پر پہنچے اور ہم نہ پہنچیں۔ میں کہتا ہوں نجات تو ایک عام لفظ ہے
نجات سے پُورا تصوّر انسان کو کہاں ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کشتیِ اہل بیت
پر سوار ہیں تو جہاں کشتی پہنچے گی وہاں ہم پہنچیں گے۔ یہ کہا ہے معصوم نے
کہ شیعتنا فی درجتنا یوم القیٰمۃ۔ ہمارے شیعہ روز قیامت ہمارے

درجہ میں ہوں گے۔ صلوٰۃ۔

ہمارے درجہ میں ہوں گے اب ظاہر ہے کہ کوئی عظیم آدمی کہیں جاتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سے اس کے تابعین جاتے ہیں۔ اس کے ہمراہی کے طور پر۔ تو جس مکان میں اسکا قیام ہوگا اسی مکان میں ان کا قیام کرایا جائے گا۔ یہ اس کے اعزاز کا تقاضا ہے۔ وہاں جاکر یہ اس کے برابر تھوڑی ہو جائیں گے۔ جب اسکی بدولت یہ ٹھہرائے جا رہے ہیں تو پھر بھی اصل تو وہی رہے گا۔ ان کا اعزاز تو تابع ہونے کا ہے۔ ان کا تو متوسل ہونے کا اعزاز ہے۔ شیعہ کے معنی ہی ہیں اتباع کرنے والے۔ تو جناب بس ایک عام بات کہ پانی پیاس بجھاتا ہے۔ کاغذ پر پانی کا نقش نہیں۔ روٹی پیٹ بھرتی ہے روٹی کا نام نہیں۔ اسی طرح بلاشبہ محبّت اہلبیت نجات کی ضامن ہے۔ مگر محبّتِ اہلبیت ہو تو۔ جس کا نام محبت ہے حقیقت وہ ہے۔ اور اب دیکھئے کہ ہم محب اہل بیت زیادہ یا سلمان فارسی۔ ہم محب اہل بیت زیادہ یا ابا ذر غفاری۔ ہم محب اہل بیت زیادہ یا حبیب ابن مظاہر۔ خدا کی قسم ہم میدان محبّت میں ان کی گرد قدم تک بھی تو نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ دیکھیے کہ جتنا محبّت اہل بیت کا دعویٰ زیادہ تھا اتنا ہی انہماک عبادتِ الٰہی میں ان کا زیادہ تھا یا نہیں۔ اتنی ہی عبادتِ الٰہی میں ان کی سرگرمی زیادہ تھی یا نہیں۔ یہاں تک کہ وہ عام زندگی تو ایک طرف۔ نماز بھی جیسی کربلا میں ہوئی ہے ایسی تاریخ عالم میں کہیں نہیں ہوئی۔ یوں تو ایک عام اصُول یہ ہے کہ ذرا پریشانی کا وقت ہو تو آدمی کچھ شرع کی رعایتوں کا فائدہ اٹھائے گا۔ آدمی اوّل وقت نماز پڑھنے کا عادی ہے تو خدانہ خواستہ اگر کسی مریض کی طبیعت گھر میں خراب ہوئی۔ ابھی ڈاکٹر آیا ہے۔ آج اوّل وقت نماز نہیں ہوئی قضا نہیں ہونے پائی۔ دیر سے ہوئی۔ بعد میں

افسوس کیا کہ دیکھو اتنے برس سے میں اوّل وقت نماز کا پابند تھا لیکن آج اس وقت پڑھ رہا ہوں۔ تو کوئی معترض نہیں ہوگا۔ ہر ایک ہمدرد ہی ہوگا کہ بیشک ہنگامی حالات کا تقاضا ہی یہی تھا۔ کوئی شخص ہے نوافل کا پابند ہے خدانخواستہ کوئی جنازہ گھر سے نکل رہا ہے۔ اس دن واجب نماز ہی پر اکتفا ہو گئی۔ بعد میں افسوس کیا کہ دیکھو آج نوافل نہیں پڑھ سکا۔ کوئی ہرگز معترض نہیں ہوگا۔ ہمدردی محسوس کرے گا مگر امام حسینؑ نے کربلا میں یہ مثال قائم کی کہ جتنا وقت سخت ہو اتنا عبادتِ الٰہی میں اضافہ کر دو کمی نہ ہونے پائے۔ یوں تو یہ آلِ رسولؐ تھے ہر ایک ان میں سے نماز تہجّد کا پابند تھا مگر خود پیغمبر کو خالق کی ہدایت یہ ہے کہ پوری رات جاگنے کی ضرورت نہیں قم اللّیل الّا قلیلا۔ نصف شب یا کم و بیش عبادت کیجئے۔ باقی آرام کیجئے۔ عموماً آلِ رسول کا بھی یہی عمل تھا۔ لیکن جو زندگی کی آخری رات ہے۔ اور ابھی اور قدر اس رات کی بتاؤں کہ وہ رات جو مانگ کر حاصل کی گئی ہے۔ پہلے ہی امام نے اس رات کے مانگنے کا مقصد بتا دیا تھا جب ابوالفضل العباس سے کہا کہ جاؤ ان سے ایک رات کی مہلت لو۔ طبری کے صفحات پر بھی یہ الفاظ ہیں۔ اللہ یعلم انی احب الصلوٰۃ و ذکر لہ۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اسکی نماز اور عبادت سے میں کتنی محبت رکھتا ہوں۔ یاد رکھئے کہ فطرت محبّت ہے کہ اپنا محبوب جس شے سے محبّت رکھتا ہو اس سے اسکو بھی محبت ہو۔ یہ تو نئی محبت ہماری ہوگی کہ ہم حسینؑ سے محبّت کا دعویٰ کریں اور نماز سے ہمکو محبّت نہ ہو۔ نماز سے ادر فرار ہو اس کے معنی ہیں کہ محبت کا بھی دعویٰ ہمارا غلط ہے۔ فرماتے ہیں کہ دیکھو اللہ گواہ ہے کہ اسکی نماز اور اسکی عبادت کو میں کتنا دوست رکھتا ہوں۔ اس کے بعد پوری رات یونہی گزری اور یہ خصوصیّت ہے اور میرا مستقل موضوع

ہے گنگا پرشاد میموریل ہال میں تقریر ہوئی تھی کہ واقعہ کربلا کی تاریخی اہمیت۔ اس میں میں نے تفصیل سے اسکو کہا ہے۔ اب وقت نہیں ہے۔ واقعہ کربلا کی یہ خصوصیت ہے کہ جو چیز کبھی جزو تاریخ نہیں بنتی۔ اس نے اسے جزو تاریخ بنا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ ایک دن کم ۷۵ برس کی عمر میں امام حسینؑ نے کتنی نمازیں پڑھی ہیں مگر کوئی نماز جزو تاریخ نہیں بنی۔ مگر کربلا کی نمازیں جزو تاریخ ہیں یعنی حسین نے رزم کربلا کو شریعت اسلام کی یادگار بنا دیا۔ کہ جب تک میرا یہ معرکہ یاد رہے۔ تب تک خدا کی عبادتیں بھی یاد رہیں گی۔ اب یہ ہمارے ذہن کا تضاد ہوگا کہ ہم معرکۂ کربلا کو یاد رکھیں اور وُہ سجدے ہمیں یاد نہ رہیں وُہ نمازیں یاد نہ رہیں وہ عبادتیں یاد نہ رہیں۔ تو یہ کچھ عجیب ذہنی تضاد ہوگا۔ ارباب عزا یہ پوری رات کس طرح گزاری جا رہی ہے۔ تاریخ کا جز۔ کبھی تاریخ نے یہ صدائیں کیوں نہ سُنیں۔ کبھی تاریخ نے یہ منظر کیوں نہ دیکھے اور محسوس نہ کئے۔ یہ کربلا کا صدقہ ہے جو یہ تمام مناظر جزوِ تاریخ بن رہے ہیں۔ طبری کا مؤرخ لکھتا ہے۔ بَاتُوْا بَیْنَ رَاکِعٍ وَقَائِمٍ وَسَاجِدٍ۔ پوری جماعت نے یوں رات گزاری کہ کوئی رکوع میں ہے کوئی قیام میں ہے کوئی سجدے میں ہے لَهُمْ دَوِیٌّ کَدَوِی النَّحْلِ۔ اس رات کے سناٹے میں ان کی تسبیح و تہلیل و مناجات کی آوازیں یُوں گونج رہی ہیں جیسی شہد کی مکھی کے چھتّے سے آوازیں آیا کرتی ہیں۔ کبھی تاریخ نے نہ یہ آوازیں سُنیں نہ تاریخ نے یہ سجدے دیکھے نہ یہ رکوع دیکھے۔ رکوع کرنے والے بھی یہی تھے سجدے کرنے والے بھی یہی تھے۔ کوئی بھی ان کا رکوع و سجود جزوِ تاریخ نہیں بنا مگر آج کا سجدہ بھی آج کا رکوع بھی جزوِ تاریخ بن گیا۔ پُوری رات یوں گزاری جا رہی ہے۔ ذرا دِلوں کے تقاضے دیکھ لیجئے سب کو معلوم ہے کہ کل روز قربانی ہے تو بہنوں کی تمنّا

ہوگی کہ بھائی آج زیادہ سے زیادہ وقت ہمارے پاس گزاریں ۔ مائیں جن کے بچے کل تہہ تیغ ہو جائیں گے ان کی آرزو ہو گی کہ ہمارے بیٹے آج رات بھر ہماری آنکھوں کے سامنے رہیں وہ خواتین جو کل بیوہ ہو جائیں گی ان کی تمنا ہو گی کہ آج وارث ہمارے پاس بیٹھ کر بعد کے لئے ہمیں کچھ ہدایتیں کر جائیں۔ اور اہل دل وہ بیٹی جو باپ کے سینے پر سونے کی عادی ہو گی اسکا تو دل چاہ رہا ہو گا کہ آج پوری رات باپ کے سینے پر گزار دے مگر ان تمام تمناؤں کے بالکل برخلاف یہاں پوری جماعت یوں رات گزار رہی ہے کہ رکوع و سجود میں مصروف ہے نمازوں میں مصروف ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک روایت آپ سنتے رہے ہوں گے۔ یہ نہیں ہے کہ بے بنیاد ہے بعض کتابوں میں بھی ہے لیکن میرے دل نے کبھی قبول نہیں کی ہے اور اس کے لئے قرآن بھی ابھی پیش کر دوں گا۔ میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ لیلیٰ رات بھر انتظار میں رہیں کہ میرا علی اکبر آجائے تو میں جی بھر کر صورت دیکھ لوں مگر وہاں پوری جماعت اس طرح رکوع و سجود میں مصروف ہے تو ممکن کہاں تھا کہ علی اکبر تو سیرت میں بھی نبی کی تصویر ہیں۔ یہ کب ممکن تھا کہ وہ سب مصروف عبادت ہوں اور یہ مصروف خواب ہوں۔ ہرگز میرا دل قبول نہیں کرتا۔ اور اب اسکا قرینہ میرے پاس موجود ہے کہ جو رات بھر عبادت میں مصروف رہے ہوں وہ نماز کو بالکل اوّل وقت میں پڑھیں گے یعنی تہیہ نماز کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ کچھ وقت وضو میں صرف ہوتا ہے۔ اسباب نماز ہیں۔ نہیں نہیں فوراً نماز پڑھیں گے اور آج کی صبح کی نماز میں مولا نے خصوصیت کیا برتی کہ روز کے مؤذن حجاج بن مسروق جعفی اور آپ آج کی نماز صبح کے وقت فرماتے ہیں بیٹا علی اکبر آج کی اذان تم دو۔ دیکھا آپ نے بیٹا باپ کے پاس موجود ہے۔ فرماتے ہیں آج صبح کی اذان تم دیدو۔ اس میں نفسیاتی احترام بھی ہو سکتا ہے۔ خدا

کی قسم اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ اولاد کی محبّت کو دِل سے نکالنے کے لئے نہیں آیا۔ یہ بھائیوں کے دل سے بھائیوں کی محبّت نکالنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ حسین کو خبر ہے کہ لیلیٰ کے دل کی تمنائیں کیا ہونگی۔ رات بھر صورت نہیں دیکھی تو اس وقت آواز ہی اپنے جوان کی سُن لیں۔ ماشاءاللہ اجرکم علی اللہ۔ میں کہتا ہوں ایک بڑی مصلحت ہے امام کی۔ اور وُہ کیا ہے۔ کہ امام جانتے ہیں کہ میرا علی اکبر بھُولنے کی چیز نہیں ہے۔ دُنیا علی اکبر کو یاد رکھے گی۔ امام عالم نفسیات بھی ہیں جانتے ہیں کہ تمام نمازوں سے زیادہ امتحانی نماز صبح کی ہوتی ہے بہت سے لوگ جو نمازوں کے عادی بھی ہیں وہ اکثر صبح کی نماز۔ نمازِ ظہر کے ساتھ قضا پڑھتے ہیں۔ شرع کی رعایتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ تو جناب والا حسین نے صبح کی نماز کی اذان دلوائی ہے علی اکبر سے۔ اور دُنیا میں جوانی کی نیند مشہور ہے۔ مولا کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی نوجوان کی بستر پر آنکھ اس وقت کھُل جائے اور اُسے تصوّر ہو جائے کہ میرا شہزادہ اس وقت کہہ رہا ہے حَیَّ اِلیَ الصَّلوٰۃ تو دیکھنا ہے کہ علی اکبر کی آواز پر کون کون آتا ہے رہاں جناب یہ صبح کی نماز ہے جس کی تعقیبات میں کربلا کا جہاد ہے۔

ادھر صفِ نماز منتشر ہوئی ادھر صفِ جہاد مُرتّب ہوگئی اور اب راہِ خدا میں جدال و قتال ہے۔ راہِ خدا میں قربانیاں پیش ہو رہی ہیں اور اس عالم میں ظُہر کی نماز کا وقت آتا ہے اور ظہر کی نماز کے وقت ابو ثمامہ صائدی حاضر ہوتے ہیں کوئی عزیز نہیں آیا ہے ایک صحابی ہیں۔ محبّت اہلِ بیت کے ایک دعویدار ہیں۔ وہ آئے ہیں۔ یہ کیا ہے۔ یہ یہ ہے کہ جہاد ہو رہا ہے اور نگاہ آفتاب پر ہے۔ کوشش یہ ہے کہ مولا حُکم نہ دینے پائیں کہ ہم اپنے رِزقِ عبادت کا نذرانہ پیش کر دیں۔ عرض کرتے ہیں کہ مولا دُشمن بہت

قریب آ گئے ہیں۔ اور تمنّا یہ ہے کہ یہ نماز آپ کے ساتھ بہ جماعت ادا ہو جائے۔ امام فرماتے ہیں ذَکَرتَ الصّلوٰۃ جعلك الله من المصلّین۔ تم نے اس وقت نماز کو یاد کیا اللہ تمہارا شمار نمازیوں میں کرے۔ یہ اوّل وقت نماز ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے پہلے تو آیا ہی نہیں تھا وقت۔ ادھر وقت آیا اور ادھر انہوں نے درخواست پیش کر دی۔ مولا نے فرمایا کہ یہ اوّل وقت نماز ہے۔ مولا دُعائیں دے رہے ہیں۔ تم نے نماز کو خود سے یاد کیا اللہ تمہارا شمار نمازیوں میں کرے۔

مجلس سوم

حقوق اللہ حقوق العباد حقوقِ ایمانی حقوقِ انسانی

کربلا شریعت اسلام کا پورا مدرسہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

وَالۡعَصۡرِ ۝ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ۝ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝

قسم ہے عصر خاص کی کہ یقیناً انسان خسارے میں ہے سوا اُن کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور ایک دُوسرے کو حق کی ہدایت کریں اور ایک دُوسرے کو صبر کی دعوت دیں۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے متعلق کل عرض کیا ابھی دو جز باقی ہیں وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ چاروں جز درحقیقت دست و گریباں ہیں۔ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا باہمی تعلق اُصولِ دین اور فروعِ دین کی تشریح کے ماتحت بیان ہو چکا۔ اب یہ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ اِن دونوں کا تعلق قبل کی دونوں صفتوں کے ساتھ کیا ہے۔ اسلام کسی فیض کسی نعمت کسی عطائے پروردگار کے لئے یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ ایک ذات میں محدود رہے بلکہ اس فیض کو دُوسروں تک پہنچنا چاہیئے۔ یہ خود غرضی کہ ہم راہِ ہدایت پر ہیں تو اب ہمیں دُوسروں سے کیا مطلب ہم نیکوکار ہیں تو بس اب ہمیں کیا غرض کہ کون کیا کر رہا ہے۔ دینی حیثیت سے یہ خود غرضی روا نہیں ہے۔ تو وہاں جو دو وصف تھے یعنی

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ تو ایمان کے کیا معنی دین حق پر قائم و برقرار رہنا۔ یہ صفت جب متعدی ہوئی غیر تک ۔ یعنی بحمد اللہ ہم جب حق پر ہیں تو ہم نے بھی یہ کوشش کی کہ دُوسرے بھی دینِ حق سے متعارف ہو جائیں تو یہ تواصوا بالحق ہوا اور عملوا الصٰلحٰت یہ گویا اپنے کو کردار کے ایک زیور سے آراستہ کرنا تھا ہم نمازی ہیں ہم روزہ دار ہیں فرض کیجئے ہم راست باز ہیں ہم امانتدار ہیں۔ سب صفتیں اپنے میں اختیار کرلیں تو ان سب کا مجموعہ تو ہوا عملوا الصٰلحٰت اب اس عمل صالح کے وصف کو غیر کی طرف متعدّی ہونا چاہیئے۔ دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے تو وہ درحقیقت وتواصو بالصبر ہے۔ اسکو معنی و بیان میں کہتے ہیں کہ ایک لف و نشر مرتب ہوتا ہے۔ لف و نشر مرتب یہ ہوتا ہے کہ دو چیزیں ایک ساتھ بیان ہوئیں اور پھر دونوں سے متعلّق جو بات ہے وہ اسی ترتیب سے پھر بیان ہوئی۔ مثلاً اس عالم کو کیا پُوچھتے ہو بادل تھا اور پانی شدّت سے گرج رہا تھا اور شدّت سے برس رہا تھا۔ تو وہاں بادل اور پانی دو چیزیں ایک ساتھ کہی تھیں اب اسی ترتیب سے گرج رہا تھا برس رہا تھا۔ ایک بادل سے متعلّق دوسرا پانی سے متعلق۔ جس ترتیب سے پہلے دو چیزیں تھیں اسی ترتیب سے بعد میں دو چیزیں جن میں سے پہلی چیز کا پہلے جملے کی پہلی چیز سے تعلّق اور دُوسری چیز کا پہلے جملے کی دُوسری چیز سے تعلّق۔ اسی طرح وہاں پہلے اٰمنوا تھا اس کے بعد عملوا الصٰلحٰت تھا۔ اسی ترتیب سے تواصوا بالحق۔ اٰمنوا کا فیض جاری ہوا۔ اور تواصوا بالصبر۔ صالحات کا عمل متعدی ہوا۔ صلوٰۃ۔ اب کوئی کہے کہ یہ صبر کے معنی جو ہم جانتے ہیں وہ تو یہ ہیں کہ ایک مصیبت پڑی اور بس مصیبت کو برداشت کیا اسکا نام ہے صبر۔ تو وہ پُورے عملوا الصٰلحٰت کے

مقابل میں کیونکہ یہ تواصوا بالصبر آگیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ باوجودیکہ اتنی کثیر الاستعمال ہے کہ ہمیں اُردو زبان کی لفظ معلوم ہونے لگی یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ غیر بھی جو اُردو بولتے ہیں۔ وہ بھی چاہے لفظ غلط کہیں۔ صَبَر کہیں لیکن صبر وہ بھی کہتے ہیں تو لفظ تو اتنی عام ہے مگر اس کے معنی میں دیکھتا ہوں کہ خواب پریشاں کی طرح مختلف ذہنوں میں الگ الگ ہیں۔ لفظ اتنی قریب اور معنی اتنی دُور۔ چُنانچہ اب جو مجھے معلوم ہے۔ ایک طبقہ ترقی یافتہ ماشاء اللہ اس دَور کا ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ صبر بُزدلی کی تعلیم ہے۔ کیوں۔ اس لئے کہ اس نے صبر کے معنی یہ سمجھ لئے ہیں کہ ہر حربے کے سامنے ہر تشدّد کے سامنے سَر جُھکا دو۔ جو بھی تمہارے ساتھ ہو چپکے سے برداشت کرلو۔ یہ معنی چُونکہ صبر کے انہوں نے سمجھے ہیں لہٰذا وُہ یہ کہتے ہیں کہ طاقتوروں نے پیشوایانِ دین کو آلۂ کار بنا کے صبر کی تلقین کرائی ہے تاکہ کمزوروں میں قوّت مدافعت نہ پیدا ہو۔ تو جیسے مذہب کو ایک ملک میں کہا جاتا ہے کہ افیون ہے۔ ایسے اب کہا جاتا ہے کہ صبر بھی بے حِس بنانے کے لئے ایک افیون ہے تاکہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے سامنے سر جُھکا دیا جائے کہ ہم تو صابر ہیں۔ تو یہ ایک معنی صبر کے ہیں جو ترقی یافتہ ذہنوں میں ہیں۔ ایک معنی صبر کے بڑے مذہبی حلقہ میں ہیں کہ صبر یہ ہے کہ بس آنکھ سے آنسو نہ نکلیں۔ ادھر آنکھ سے آنسو نِکلا اور انہوں نے کہا کہ ہائیں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہو۔ صبر کرنا چاہیئے۔ تو ان کے نزدیک صبر کا معیار یہ ہے کہ بس آنکھ سے آنسو نہ نکلے۔ پتھّر بنے کھڑے رہو۔ اس کے علاوہ ایک اور معنی بھی صبر کے مُراد لئے جاتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ مصیبت کا احساس ہی نہ ہو اثر مصیبت ہی نہ ہو۔ افسردگی بھی نہ ہو تو کیا کہنا گویا ایسا شخص سب سے زیادہ صابر ہوا۔ یہ بھی صبر کا ایک مفہوم ہے۔ معلوم ہوا کہ لفظ صبر زبان پر ہے

لیکن معنی صبر ذہن میں نہیں ہیں ۔ تو مجھے ابھی آگے ایک بہت وسیع بیان کرنا ہے لہٰذا اس چیز کو بہت بسیط طور پر پیش نہیں کر سکتا ۔ بس مختصر جائزہ پیش کر دیتا ہوں ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ صبر کی لفظ آپ کو یاد کہاں سے ہوئی ہے ۔ سب سے پہلے آپ نے یہ لفظ قرآن میں سنی ۔ پھر تشریح کرنے والوں کی زبان سے یہ لفظ آپ کو معلوم ہوئی ۔ ورنہ یہ صبر کی لفظ آپ کو بولنا ہی نہ آتی ۔ قرآن کی بدولت یہ لفظ صبر دُنیا تک پہنچی ہے تو جو قرآن نے تشریح صبر کی ہو ۔ کسی کو حق نہیں کہ اسکو بدلے ۔ نہ بیگانے کو نہ یگانے کو نہ دُور والے کو نہ قریب والے کو ۔ نہ روشنی کے دَور والے کو نہ تاریکی کے دَور والے کو ۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ قرآن کے خلاف لفظ صبر کی تشریح کرے ۔ تو اب قرآن مجید میں جہاں جہاں صبر کا اطلاق ہے ۔ اس میں ایک جگہ نہیں بہت جگہ ۔ میدانِ جنگ میں صبر کا مطالبہ ہے تو وہ کیا ہے کہ نیزہ آتا ہو تو سینہ بڑھا دو تلوار آتی ہے تو سر جھکا دو ۔ کیا یہ معنی ہیں وہاں صبر کے ۔ میدان جنگ میں صبر کے کیا معنی ۔ اگر صبر کے یہ معنی ہوتے کہ عاجزی سے سر جھکا دو تو پھر جنگ کا تصوّر ہی کہاں ہوتا اور میدانِ جنگ میں صبر کا مطالبہ ہی آخر کیوں ہوتا ۔ اب صبر کا مطالبہ جو قرآن مجید کر رہا ہے وہ کیا ہے ۔ ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین ۔ اگر تم میں ۲۰ صبر کرنے والے ہوں تو ۲۰۰ پر غالب آئیں وان یکن منکم مائۃ ۔ اگر تم میں سَو صبر کرنے والے ہوں تو یغلبوا الفا من الذین کفروا تو ایک ہزار پر غالب آئیں ۔ قرآن کے سادہ سادہ لفظوں میں بڑے بڑے فلسفے مضمر ہیں ۔ ذالک بانھم قوم لا یفقھون بات یہ ہے کہ تعداد میں وہ دس گنے سہی لیکن انکو ایمانی شعور نہیں ہے ۔ لہٰذا تمہاری تعدادی کمزوری کا توازن قائم ہونا چاہیئے تمہاری قوّت ایمانی کے ساتھ ۔ اب جناب دیکھئے ۲۰ صبر کرنے والے ہوں ۔

وہاں بھی قید صبر کی۔ اور سو صبر کرنے والے ہوں تو یہاں بھی قید صبر کی۔ تو اب وہ ترقی پسند دُنیا دیکھے کہ صبر وُہ چیز ہے جو دس گنے مقابلے کی دعوت دیتا ہے تو یہ بزدلی کی تعلیم کب ہوئی۔ اب چونکہ یہ آیت میں نے پڑھ دی۔ بلا فاصلہ اس کے بعد دوسری آیت ہے۔ ہم تو جتنا بھی زیادہ حفظ ہو اتنی ہی تیزی سے ایک آیت کے بعد دوسری آیت پڑھ دیں گے۔ مگر اب مضمون آیت دیکھئے کہ پہلی آیت نازل ہونے کے بعد کوئی سخت معرکہ ہوا جس میں کہ مُسلمان اس معیار پر پورے نہیں اُترے۔ یہ کوئی روایت تھوڑی ہے یہ قرآن کی آیت ہے اسی لئے میں نہیں بتا سکتا کہ وُہ کونسا معرکہ تھا۔ بہر حال مضمون آیت سے ظاہر ہے میں وہ آیت ابھی پڑھوں گا۔ بیچ میں ایک معرکہ ہوا اور مسلمان اس معرکہ میں اس معیار قرآنی پر پورے نہیں اُترے الآنَ قد خفف اللہ عنکم۔ اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے۔ یعنی اس فریضہ کو ہلکا کرتا ہے وعلِمَ انّ فیکم ضعفاً اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے بس پتہ چل گیا کہ تم میں کمزوری ہے تم کون وہی معزز طبقہ جو مخاطب ہے۔ اور اب کمزوری کیا مادی کمزوری، وہ تو پہلے ہی ثابت تھا کہ مقابل کے دس گنا ہونے کی وجہ سے کمزور تھے۔ اب یہ کمزوری وہی ایمان والی کمزوری ہے۔ پھر کہئے کہ پہلا حکم کیوں آیا تھا اس وقت کیا اللہ نہیں جانتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مُسلمانوں کو اپنی قوّت ایمانی کا زعم زیادہ تھا تو اس لئے خود پتہ چلانے کے لئے نہیں ان کو پتہ بتلانے کے لئے۔ پہلے وُہ حکم آیا اور اب ارشاد ہو رہا ہے کہ دیکھو پتہ چل گیا تم میں کمزوری ہے فان یکن منکم۔ اب اس کے بعد ان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبون اگر تم میں سو صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں ان یکن منکم الفٌ۔ اب دیکھئے اس معیار سے آٹھ درجہ قدم پیچھے ہٹایا گیا ہے کہ ان یکن منکم الفٌ۔

اگر تم میں ہزار ہوں تو لیس یغلبوا الفین باذن اللہ تو دو ہزار پر غالب آئیں یعنی کم از کم دو گنے مقابلے سے تو نہ گھبراؤ یعنی کچھ تو کفر و ایمان میں فرق ہو۔ پھر آخر میں واللہ مع الصابرین اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے یعنی تم صبر کرو گے تو اللہ کی مدد بھی شاملِ حال ہوگی۔ تو معلوم ہوا کہ یہ صبر وہ چیز ہے کہ جو مثالی مقابلہ تو دس گنے کے ساتھ کرتا ہے اور کم از کم دو گنے مقابلے کی دعوت تو ضرور ہے کہ گھبراؤ نہیں اگر فریق مخالف دُوگنا ہے کیونکہ وہ اس بصیرت ایمانی سے محروم ہے جس کے تم دعویدار ہو۔ اب اگر تم اس سے بھی گھبرائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے اندر بصیرتِ ایمانی کسی درجہ پر ہے ہی نہیں اب جو کچھ بھی ہے وہ بقلم خود ہے۔ تو کیا اب وُہ تصوّر صحیح رہا کہ صبر بزدلی کی تعلیم ہے اب آیئے اس پر کہ احساس غم ہی نہ ہو۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ احساس نتیجۂ شعور ہے انسان کی کوئی صفت مدح وہ نہیں ہوسکتی جو شعور و علم سے ٹکرائے۔ آج کل ڈاکٹروں نے ایسی دوائیں ایجاد کر لی ہیں کہ وہ دوا لگا دی تو وہ حصّہ بے حس ہو گیا۔ اب جو نشتر لگایا گیا تو خیر ہی نہیں ہوئی اب جس کے وہ دوا لگادی اور اس کے نشتر لگا دیا تو اس نے اُف نہ کی تو یہ اُف نہ کرنا کونسا کارنامہ ہے۔ یہ تو دوا کا اثر ہے۔ اسی طرح اگر دل و دماغ ایسے ماؤف ہوئے کہ احساس رنج ہی نہ ہوا تو یہ کونسی قابلِ تعریف صفت ہوتی۔ یہ تو ایک کیفیّت مزاج ہے کہ اثر غم ہوتا ہی نہیں۔ یہ کوئی کارنامہ نہیں ہوگا بلکہ میں کہتا ہوں کہ جتنا ادراک قوی ہوگا اتنا ہی اثر مصیبت زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی احساس اذیت والم زیادہ ہوگا۔ لہٰذا یہ کونسا کارنامہ ہوا۔ اب تیسری بات کہ آنسو نہ نکلیں۔ اب یہ تو بحمداللہ بالکل پکے مسلمان ہیں وُہ ترقی یافتہ تو دعویدار اسلام تھے یہ تو ذمّہ دار اسلام ہیں۔ یہ تو اسلام کے ٹھیکیدار ہیں تو صاحب انکی بات کو تو قرآن کے معیار پر جانچنا ہی ہے۔ تو جناب

آپ یہ کہتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ آنکھ سے آنسو نہ نکلیں تو جناب وہ جو میدان جنگ میں صبر کا مطالبہ ہے اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ روؤ نہیں چاہیے ہنستے ہوئے میدان سے نکل جاؤ۔ ایک بات اور کہہ دوں۔ یہ تو میں نے قرآن مجید کے معیار پر اس تصوّر کو جانچا ہے۔ اب کوئی ترقی یافتہ بھی اس تصوّر کو اختیار کرے کہ ہاں آنسو نکلنا تو بالکل خلافِ صبر ہے ـــــــــ تو میں یہ کہوں گا کہ یہ آنکھ اور دل میں تصوّر کس نے قائم کیا ہے کیا بات ہے کہ رنج ہوتا ہے تو ہاتھ تو نہیں پسیجتے پیر میں تو کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ آنکھ ہی سے آنسو کیوں نکلتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو خالق ہے آنکھ اور دل کا اس نے کوئی باہمی ربط قائم کیا ہے کہ جب دل کو صدمہ پہنچے گا تو آنکھ سے آنسو نکلیں گے تو بس ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں گا کہ اگر دل اور آنکھ دونوں بالکل مزاج معتدل پر ہیں تو اس کیفیت کا پیدا ہونا دینِ فطرت میں جرم نہیں ہو سکتا مگر اب مجھ سے مطالبہ کا حق ہے ہر ایک کو کہ پھر آخر صبر کیا ہے۔ وہ صبر غلط ترقی یافتہ ذہنوں والا۔ یہ تصوّرِ صبر کا غلط پرانی درسگاہوں والا تو پھر آخر صبر ہے کیا۔ تو صاحب جب ہم دیکھتے ہیں۔ تو پہلے اسکی جامعیت کو عرض کروں کہ یہی صبر ہے کہ بتقاضائے الٰہی جو مصائب آتے ہیں اس میں اسکا مطالبہ ہے۔ مثلاً کسی کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ کسی کا بھائی جدا ہو گیا کسی کو اولاد کا داغ لگا۔ وہاں بھی کہا جاتا ہے صبر کرو تو وہاں کیا معنی ہیں۔ پھر یہ کہ حق کی راہ میں خود اختیاری طور پر جو مصائب آئیں۔ خود اختیاری یوں ہے کہ جو راستہ حق کا چھوڑ دے تو سب مصیبتیں ختم ہو جائیں تو ان مصائب کو سمجھنا پڑے گا کہ خود اختیاری ہیں تو اگر وہ معنی ہیں کہ روؤ نہیں تو وہ بھی نہیں بنتے۔ اگر وہ معنی ہیں کہ چپکے سے سر جھکا دو تو وہ بھی نہیں بنتے۔ تو پھر آخر کون سے معنی ہیں۔ تو اب یوں سمجھیں کہ صبر کے بہت سے معنی ہیں۔ ایک معنی سے وہ صبر ہے

ایک معنی سے یہ صبر ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ کئی معنی بس مجبوری کی صورت میں مانے جاتے ہیں جبکہ کوئی ربط باہم نہ ہو۔ جیسے عین آنکھ بھی ہے اور عین آفتاب بھی ہے اور چشمہ بھی ہے عربی میں۔ تو ان میں کوئی مشترک چیز ہمیں نظر نہیں آتی کہ وہ آنکھ پر بھی صادق ہو چشمے پر بھی صادق ہو۔ مجبوراً یوں کہہ دیتے ہیں کہ یہ لفظ سب میں مشترک ہے۔ اس کے سب معنی ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں کہ عین کے چالیس معنی ہیں۔ تو اس کے اتنے کثیر معانی ہیں۔ سب الگ الگ ہیں۔ تو اب اگر یہاں واقعی کوئی مشترک مفہوم سمجھ میں نہ آئے۔ تو مجبوراً یہی کہیں گے جو آپ بتا رہے ہیں کہ الگ الگ معانی ہیں۔ اس صبر کے کچھ اور معانی ہیں جو مصائب آسمانی قضائے الٰہی کے نتیجے میں ہوتا ہے اور اس صبر کے معانی اور ہیں جو میدان جنگ میں ہوتا ہے لیکن میری سمجھ میں جو ہے وہ یہ ہے کہ صبر کے ایک معنی ہیں اور وہی ہر جگہ منطبق ہیں۔ وہ معنی صبر کے یہ ہیں کہ کوئی شدت وقت کوئی مصائب کی آندھی کوئی سخت سے سخت صورت حال تمکو اس فریضے کے جادہ سے نہ ہٹائے جس پر تم کو قائم رہنا چاہیئے۔ یہ میدانِ جنگ ہی میں ثبات قدم نہیں ہے تاکہ مصائبِ آسمانی میں کوئی کہے کہ وہاں تو میدان جنگ ہے نہیں۔ اور میدان جنگ کے ثبات قدم میں کوئی کہے کہ جنگ کا موقع نہیں۔ جی نہیں میدانِ جنگ ہی میں ثبات قدم نہیں ہے ثبات قدم ہے جادہ فرائض پر۔ جادہ فرائض علماؑ کی زبان ہے۔ عام لفظوں میں کہنا چاہیئے جو کرنا چاہیئے ہر صورتِ حال میں وہی کرے۔ کوئی سخت سے سخت موقع بھی اس راہ سے نہ ہٹائے جو صحیح ہو۔ یہ صبر کے معنی ہیں۔ اب ہر جگہ فرض کیا ہے وہ فرض بتانے والوں سے پوچھیئے جو اسی لئے بھیجے گئے تھے کہ وہ فرائض بتائیں۔ اب ذرا صبر کی تھوڑی سی اور تشریح۔ ہمارے لکھنؤ میں ایک سڑک کا نام ہے ٹھنڈی سڑک اور ایسے

ہی یہاں بھی سڑکیں ہونگی کہ لوگ صبح کی ہوا خوری کیلئے وہاں جاتے ہوں گے۔ تو ضرور جاتے ہوں گے تفریح ہوتی ہوگی۔ لیکن جس دن سے اس سڑک پر جانے میں کوئی کام سپرد ہو جائے گا۔ کہ اب فریضہ ہو گیا اس سڑک پر جانا۔ فرض کیجئے کہ والد صاحب نے حکماً کہہ دیا کہ دیکھو تم کو اس سڑک پر روز جانا ہوگا۔ یا کسی اور نے۔ جس کے ہاں ملازم ہیں۔ اس نے کہہ دیا۔ یا اتفاق سے اس طرف کوئی دفتر کا کام ہوا۔ ڈیوٹی ہو گئی۔ تو بس جس دن سے پابندی عائد ہو جائیگی اس دن سے تفریح ختم ہو جائے گی اور ناگواری ہو جائے گی حالانکہ وہی سڑک ہے وہی ہوا ہے مگر احساس پابندی خود ناگواری کا پیمانہ ہے۔ اسی وجہ سے احکام شریعہ کو تکلیفات کہتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں یہ اسکا مکلّف نہیں ہے۔ تکلیف شرعی عائد نہیں ہے۔ یہ تکلیف شرعی اسی لئے ہے کہ پابندی کلفت طبع کا باعث ہوتی ہے۔ وہ خود ناگواری طبع کا سبب ہوتی ہے۔ تو اب اگر انسان نے اس پابندی کو قبول کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ناگوار بات کو اس نے حکم کے دباؤ سے برداشت کیا تو وہ ہوا صبر علی المکروہ۔ دوسری طرف جس چیز سے منع کر دیا جائے اسی کو دل چاہنے لگتا ہے کوئی غذا آپ کبھی نہ نوش فرماتے ہوں مگر جس دن سے حکیم صاحب یا ڈاکٹر صاحب منع کر دیں اسی دن سے اسکو دل چاہنے لگے گا۔ اس کے لئے مقولہ بھی ہو گیا ہے۔ . .

اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَا مُنِعَ۔ انسان کو جس شے سے منع کیا جائے اسکا لالچ ہو جاتا ہے۔ تو محرمات جتنے ہیں۔ یعنی جو چیزیں حرام ہیں ان میں چونکہ ممانعت ہے لہٰذا بسبب ممانعت وہی چیزیں مرغوب طبع ہو جاتی ہیں۔ اب انہی کی خواہش ہوتی ہے اس لئے کہ ممانعت ہے۔ اب اگر انسان نے فرمان حاکم کے احترام میں اس ممانعت کو برداشت کیا اور خواہش دل کے

مطابق عمل نہ کیا تو یہ صبر عن المحبوب ہے پسند طبع چیز سے صبر۔ تو دُنیائے شریعت پوری صبر میں داخل ہے۔ اب اس کے بعد خصوصی حیثیت سے کچھ ناگواریاں ہوتی ہیں اس لئے اب ایک دوسری وسیع لفظ استعمال کروں۔ پوری شریعت قربانیوں کا مطالبہ ہے۔ میدانِ جنگ ہی میں قربانی تھوڑی ہوتی ہے۔ یہ نماز کے احکام کیا ہیں۔ کیا اللہ کو اس کی ضرورت ہے کہ آپ اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوئیے تو اس کے جاہ و جلال میں کچھ اضافہ ہو جائے گا۔ نہیں یہ دیکھنا ہے کہ تم اپنے مشاغل حیات میں سے کتنا حصّہ ہمارے لئے قربان کر سکتے ہو۔ اب اوقات کی پابندی سے دیکھئے کہ کتنا صبر آزما امتحان ہو گیا۔ مشاہدہ ہو گا آپ کا کہ بہت سے لوگ رمضان کے روزے کے پابند ہیں اور روز کی نماز کے پابند نہیں ہیں بلکہ روزوں کی بدولت پھر نماز کے بھی ماہِ رمضان میں پابند ہو جاتے ہیں تو کیا پتہ چلا۔ پتہ یہ چلا کہ وہ سال میں ایک مہینے کی بات ہے لہٰذا وہ اتنی ناگوار نہیں ہے لیکن یہ روز کی پانچ وقت کی بات ہے لہٰذا بہت ناگوار ہے۔ وہ چاہے جتنے منٹ میں نماز ہو جاتی ہو مگر وہ چند لمحوں کو صرف کرنا اس پابندی وقت کے ساتھ۔ یہ انسان کی طبیعت پر ناگوار ہوتا ہے اسی لئے بہت سے اس سے زیادہ سخت احکام۔ بجالے آئیں گے کہ جناب شب قدر کی مستحب نمازیں پڑھ لیں گے اور روز کی واجب نمازیں نہیں پڑھیں گے۔ کیونکہ وہ سال بھر میں ایک دفعہ کی بات ہے اور یہ ہر روز کی بات ہے اب اس میں بعض وقت صبر آزما منزل بھی آجاتی ہے کہ کوئی دُور سے بچھڑے ہوئے عزیز آئے ہیں اب وہ اپنے زمانہ سفر کی روداد سُنا رہے ہیں اور وقت نماز جا رہا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ عزیز کی محبّت زیادہ ہے یا اللہ کا حکم زیادہ ہے اور جناب اس کے بعد صبح کی نماز وہ خواب استراحت

اور اب میری عمر کا تقاضا نہیں۔ مقام منبر کا تقاضا بھی نہیں کہ اور بھی جو جاذب توجہ چیزیں ہوتی ہیں ان سب کو میں پیش کروں۔ ان سب کے باوجود اگر بندہ خدا نے احساس وقت نماز رکھا اور صبح کی نماز کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تو بلاشبہ صبر کا مصداق ہونے میں شبہ ہی کیا ہے۔ اس نے ان تمام پسندیدہ چیزوں کو ٹھکرا دیا اور آگیا وہ میدان عمل میں۔ اور پھر خالق نے آپ کی فطرت کے احساس سے گویا تھوڑے سے احترام کی خاطر فریضہ صبح کی رکعتیں سب سے کم رکھی ہیں۔ ارے ابھی تو نیند سے بیدار ہوتے ہو تو چلو دو رکعت ہی پڑھ لو۔ یعنی بستر سے اٹھ کر بارگاہ الٰہی میں ایک سلام کر لو تاکہ پتہ چل جائے کہ تم باغی حکومت نہیں ہو۔ صَلٰوۃ۔

اور یہ بھی دینِ فطرت ہے کہ واقعی اگر تمہاری آنکھ نہیں کھُلی تو سوتے رہنے کی وجہ سے قضا کا گناہ نہیں ہوگا۔ اس پر نامہ عمل میں کوئی گناہ نہیں لکھا جائیگا۔ قضا پڑھ لینا لیکن اب خواب راحت کے عادی دیکھیں کہ ایسا تو نہیں ہوتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت دفعہ بہت سوں کے ساتھ ہوتا ہوگا کہ جناب آنکھ کھُلی مگر اُٹھا نہیں جاتا۔ تو اب جناب عمداً ترک نماز کا گناہ نامۂ اعمال میں لکھا جائیگا۔ دُنیا سمجھ رہی ہے کہ سو رہے ہیں مگر یہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس دوران وقت میں آنکھ کھُلی تھی یا نہیں۔ اسی لئے اس نے حساب اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ہم تو گواہی دے دیں گے کہ یہ سوتا ہوا ہوتا تھا تو نماز اسکی رہ جاتی تھی۔ ورنہ یہ پابند نماز تھا۔ ہم پابند نماز ہونے کی گواہی دے دیں گے مگر جو جانتا ہے کہ یہ جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے اسکا علم کسی دوسرے دیکھنے والے کو نہیں ہو سکتا۔ دُوسرا تو بس لیٹنا دیکھ سکتا ہے سونا اور جاگنا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ آدمی خود دیکھ سکتا ہے یا وہ دیکھ سکتا ہے کہ جو سوتا ہی نہیں۔ اس میں دُوسرے لوگوں کو

معتبر نہیں ماننا پڑے گا کہ وُہ سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ اب اگر کسی نے خود کہا ہو کہ میں جیسی میٹھی نیند اس رات کو سویا کبھی نہیں سویا تو دُنیا کو گواہ طلب کرنے کی ضرورت نہیں۔ گواہی وہیں ہوتی ہے جہاں دوسرے دیکھنے والے ہوں۔ جہاں آدمی خود ہی واقف ہو وہاں گواہ باہر سے کہاں آئیں گے۔ اسی لئے اس بات کو جسے گھر والے ہی دیکھ سکتے ہوں اس کے بارے میں گھر والوں ہی کی گواہی قبول کرنی ہوگی اور ایک باپ اپنی بیٹی کو کوئی چیز دیتا ہے تو باہر والے کہاں سے آئیں گے دیکھنے کو۔ گھر والے ہی گواہ ہوں گے۔ صَلوٰۃ۔

تو اب پوُری دُنیائے شریعت صبر میں داخل ہے اسی لئے ایک عبادت ایسی کہ جس میں بہت سی خواہشوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے وہ روزہ ہے ہر عبادت میں کسی ایک جذبہ نفس سے مقابلہ ہوتا ہے روزے میں بہت سی نفسیاتی خواہشات سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ پانی جیسی ضروری اور پُرکشش چیز سے ایک معینہ وقت تک اس کے پینے سے احتراز کرنا پڑتا ہے۔ یہ پینا اتنا پُرکشش ہے کہ ایک نامعقول مشروب کو بعض افراد کا دل نہ بھی چاہتا ہو تو چاہنے لگتا ہے مگر اس سب کے باوجود بحمداللہ اس اتنے بڑے مجمع میں کوئی ایسا نہیں کہ جس کا دل چاہا ہو یہاں تک کہ وہ شاعر صاحب بھی جنھوں نے تقلید شاعری کے طور پر خود بھی تعریفیں کی ہوں ان کا بھی دل نہ چاہا ہوگا۔ درحقیقت اس سلسلے میں اپنے بزرگوں کے لئے دُعائے خیر کرنی چاہیئے کہ ہمیں ماحول ایسا ملا کہ ہم ایک گناہ کے خُوگر نہیں ہوئے۔ اسی لئے کبھی دل نہیں چاہا۔ کسی شاعر نے ہم پر طنز بھی کی تھی۔ تو نے پی ہی نہیں۔ اسکا طنز اس کے نزدیک چاہے کتنا ہی چبھتا ہوا ہو مگر ہم نے کہا الحمداللہ۔ ہم کو اس پر خوشی ہوئی کہ اس نے ہم کو یہ سند عطا کی۔ تو صاحب بہرحال، ہمارے لئے یہ نہ پینا کوئی بڑا جہاد ہی نہیں اس لئے کہ جب ہمارا دل ہی

نہیں چاہاتو کوئی بڑا جہاد ہم نے نہیں کیا جو ادھر ہم نہیں گئے۔ ہم کو تو اسکی بو سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس سڑک سے گزرے ہیں تو ہم کو ناگواری محسوس ہوئی ہے مگر اب میں کہتا ہوں کہ ماشاء اللہ مجمع میں سب روزہ دار ہوں گے مگر روزہ دار پر کون طنز کر سکتا ہے۔ پانی کے بارے میں کون کہے کہ تو نے پیا ہی نہیں۔ یہ ہے روزہ میں عظیم امتحان کہ جن چیزوں کے ذائقہ سے واقف ہے۔ حکمِ الٰہی کے دباؤ سے ان سے باز رہتا ہے۔ اسی لئے صوم کا ایک نام صبر ہو گیا۔ قرآن کی جو آیت ہے واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ مدد حاصل کرو صبر اور صلوٰۃ سے۔ تو بظاہر ربط نظر نہیں آتا کہ صبر اور صلوٰۃ میں باہمی کیا ربط ہے۔ تو علماء نے کہا کہ یہاں صبر کے معنی صوم کے ہیں تو بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ اسمیں ناگواری ہوتی ہے تو اگر حکمِ الٰہی کے ماتحت منہیات سے پرہیز رکھا اور واجبات کی پابندی کی تو پوری زندگی صبر ہو جائے گی۔ پوری زندگی معیارِ صبر پر پوری اُترے گی۔ اب پھر وہ بات آگئی کہ عملوا الصٰلحٰت وہی بات جب متعدی ہوئی تو تواصوا بالصبر ہو گئی کہ خود تو ہے ہی پابند دوسروں کو بھی پابندی کی دعوت دیتا ہے اب یہ الگ سے سمجھنے کی بات ہے کہ کس جگہ معیارِ صبر کیا ہے ہو سکتا ہے کہ ہمارے رہنمایانِ دین جو تھے ان کی زندگی میں بھی بظاہر نمونہ الگ الگ نظر آئے لیکن درحقیقت وُہ ان کا صبر ہو گا۔ یہ ان کا صبر ہو گا۔ ایک حسنؑ مجتبےٰ کا صبر ہو گا اور دُوسرا حسینؑ مظلوم کا صبر ہو گا۔ کردار دونوں کا ایک ہے۔ وہ بھی صابرین میں ہیں یہ بھی صابرین میں ہیں۔ صَلوٰۃ۔

یہ چار وصف ہیں۔ ہمارے جتنے رہنمایانِ دین ہیں ان میں سے سب میں ہر ایک وصف اپنے کمال پر ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ مثال میں پیش کرنے کے لئے کوئی نمایاں تاریخی واقعہ ہونا چاہیئے۔ لہٰذا میں عام رہنمایانِ دین کی زندگی کو سامنے

رکھ کر اگر ان اوصاف کا عملی مرقع پیش کروں تو مجھے شاید اٰمنوا کی مثال عمل دکھانے کے لئے زندگی کے ایک ورق کو پیش کرنا ہو اور عملوا الصّٰلحٰت کے لئے بہت سے اوراق کو پیش کرنا ہو کیونکہ عمل صالح کے شعبے بھی تو بہت سے ہیں اس لئے میں نے کہا کہ بہت سے اوراق کو پیش کرنا پڑے۔ تواصوا بالحق میں کوئی کہیں کی مثال پیش کروں اور تواصوا بالصبر میں کہیں کی مثال پیش کروں لیکن ہمارا رہنما ایک ایسا ہے کہ اس نے ایک ظرف مکان اور ایک ظرفِ زمان میں تمام اوصاف کو سمیٹ کر اس طرح پیش کیا ہے کہ اگر اٰمنوا کا مظاہرہ عمل مجھے دکھانا ہو تو کربلا جاؤں عملوا الصّٰلحٰت کے شعبوں کی مثالیں دکھانا ہوں تو کربلا جاؤں اگر تواصوا بالحق کی مثال عمل دکھانا ہو تو کربلا جاؤں اور اگر تواصوا بالصبر کی مثالیں دکھانا چاہوں تو کربلا جاؤں۔ اب اس سے آپ یہ محسوس فرما رہے ہوں گے کہ یہ مصائب ہیں لیکن یہ کہ یہ باب کتنا وسیع ہے کہ اگر اسکو تفصیل سے بیان کیا جائے تو کئی مجلسوں کا وقت اس کے لئے درکار ہے۔ میں مجمل طریقہ پر ہر ہر وصف کو آپ کے سامنے پیش کرکے مجلس ختم کر دوں گا۔ یہی اوّل ہے یہی آخر ہے یہی آغاز ہے یہی انجام ہے اسی ترتیب کے ساتھ جو آیت کے الفاظ ہیں۔ اٰمنوا۔ ایمان ہے دل کے اندر کی چیز دل کو شگافتہ کرکے دیکھا نہیں جا سکتا مگر اسکا مظاہرہ عملی وہ ہو گا کہ جو آنکھوں کے سامنے آئے اور مثال کے لئے پیش کیا جا سکے۔ بدبختی سے ادھر والے بھی دعویداران ایمان تھے یاد رکھئے کہ جب تک دعویداران ایمان نہ ہوں مسلمان ہی نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کے معنی ہیں اقرار ایمان کرنے والا۔ اگر دل سے ہے تو واقعی ایمان ہے ورنہ کچھ اور ہے لیکن دعویٰ ایمان تو اسلام کے لئے ضروری ہے بغیر اس کے اسلام ہو گا ہی نہیں تو ادھر والے بھی چونکہ مُسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں لہٰذا دعویداران ایمان

ہیں۔ اب مجھے کوئی مظاہرہ عمل چاہیئے جسے میں پیش کر سکوں۔ پتہ چلے کہ ان کا ایمان کس پر ہے تو یاد رکھئے کہ اعمال میں۔ یہ بھی ایک حکیمانہ باب ہے شریعت اسلام کا کہ۔ عبادات میں نیّت کو رکھ کر ایمان کو عمل صالح میں سمویا ہے وہ ایمان نیّت کراتا ہے وہ عمل صالحہ کے راستے پر اعضا و جوارح کو گامزن کرتا ہے تو یہ نیّت جو ہے درحقیقت یہ تقاضائے ایمان ہوتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان رکھے گا وہی قربۃ الی اللہ کی نیّت کرے گا ورنہ جس چیز کو مانتا ہے اسی کے لئے عمل کریگا جو اللہ کو مانتا ہے وہ اللہ کے لئے عمل کرے گا جو دُنیاوی طاقت کو مانتا ہے وُہ دنیاوی طاقت پر عمل کرے گا۔ اب نیّت ہوتی ہے آغاز عمل میں۔ اب مجھے دیکھنا ہے۔ ادھر والے کا آغاز عمل جب ہوتا ہے تو وہ تیر جوڑتا ہے چلّہ کمان میں۔ فوج والوں سے کہتا ہے گواہ رہنا یہ کہاں کے لئے گواہیاں ہیں۔ دربار حاکم کے لئے۔ پس معلوم ہو گیا کہ مقصد عمل حاکم وقت کی خوشنودی ہے۔ طاغوت باطل پر ایمان ہے۔ اب مجھے تلاش ہوئی کہ ادھر والے نے بھی کبھی کسی کو گواہ کیا۔ تو اُدھر والے کا مقصد عمل وہ حاضر و ناظر نہ تھا کہ خود دیکھے لہٰذا دُوسرے گواہوں کی ضرورت ہوئی اور اسکا مقصد عمل خود حاضر و ناظر ہے اس لئے اس نے گواہ کیا مگر خود اسی کو گواہ کیا وہ کب گواہ کیا۔ جب جوان بیٹا جانے لگا۔ ہاتھ اُٹھا دیئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا اَللّٰھُمَّ اَشْھَدْ عَلٰی ھٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ قَدْ بَرَزَ اِلَیْھِمْ غُلَامٌ اَشْبَہُ النَّاسِ بِرَسُوْلِکَ مَنْطِقاً وَّخَلْقاً وَّخُلُقاً کُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا لِزِیَارَۃِ نَبِیِّکَ نَظَرْنَا اِلٰی وَجْھِہٖ۔ پروردگارا گواہ رہنا کہ جو صورت و سیرت اور رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے خداوندا جب ہم مشتاق زیارت تیرے رسول کے ہوتے تھے تو اپنے اس جوان کو دیکھ لیتے تھے۔ یہ اصول بھی ہمیں ہمارے مولا نے سکھایا ہے کہ کسی زیارت کے

مشتاق ہو اور وہاں نہ پہنچ سکو تو شبیہہ کو دیکھ کر دل کی تسلّی کر لو۔ حسینؑ کو اللہ نے ایک جیتی جاگتی رسول کی شبیہہ عطا کی تھی۔ جملہ دیکھئے۔ ایک دفعہ کی بات نہیں ہے۔ کُنّا اذا۔ ماضی استمراری۔ کنا اذا اشتقنا۔ ہم جب تیرے رسول کے مشتاقِ زیارت ہوتے تھے۔ اب اس سے علی اکبر کی جلالت قدر دیکھئے کہ علی اکبر کی ولادت کے وقت مولا نے جب دیکھا رسول کی زیارت کی نیت سے دیکھا۔ اسی لئے اب علی اکبر کی یہ خصوصیت ہو گئی کہ جب علی اکبر چلے تو مولا اپنی جگہ کھڑے نہ رہ سکے۔ کسی کو یہ سمجھنے کا حق نہیں کہ یہ صرف بیٹے کی محبت تھی۔ نہیں یہ شبیہہ رسول کا احترام تھا اور یہ جو پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جہاں تک سامنا رہے اس وقت تک مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتے جاؤ۔ یہ کیا ہے۔ جانتے ہیں کہ یہ تصویر اب کہاں ملے گی لہٰذا جتنا زیادہ ممکن ہو اتنا رسول کی زیارت کر لوں۔ بس اربابِ عزا۔ اب دُوسرا شعبہ عملوا الصّٰلحٰت۔ اس ایک لفظ کی دُنیا اتنی وسیع ہے کہ عمل صالح میں حقوق اللہ بھی ہیں حقوق الناس بھی ہیں۔ حقوق الناس میں زندوں کے بھی حق ہیں مُردوں کے بھی حق ہیں۔ دوستوں کے بھی حق ہیں دشمنوں کے بھی حق ہیں یعنی حقوق ایمانی بھی ہیں اور حقوق انسانی بھی۔ ہر طرح کے حق ہیں۔ یہ کارنامہ کربلا ہے اور مولا کا کارنامہ ہے کہ یہ فقط مرقع مصیبت ہی نہیں ہے جو ہمیں صرف اشک افشانی ہی کی دعوت دے سکے بلکہ یہ شریعتِ اسلام کا پورا مدرسہ ہے۔ ایسے سخت ماحول میں حسینؑ نے جتنی تعلیمات دینی ہیں ان میں سے کسی کو تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا۔ ہر ایک کی کوئی مثال پیش کی۔ اب عملوا الصالحات کی دنیا کتنی وسیع۔ تو حقوق اللہ میں کل عرض کر چکا۔ کہ نماز جیسی کربلا میں پڑھی گئی ویسی نماز تاریخ عالم میں کبھی نہیں پڑھی گئی۔ اس کے بعد حقوق الناس۔ کِس نے پکارا اور مولا اسکی لاش پر نہیں گئے ہیں۔ حالانکہ مقتل سے

خیمہ گاہ کتنی دُور ہے۔ مجاہد ہوتا تھا وہاں اور مولا ہوتے تھے یہاں خیمہ گاہ جہاں ہے۔ وہاں سے وہ پکارتا تھا اور امام یہاں سے اسکی لاش پر جاتے تھے۔ یہ کب ہو رہا تھا تین دن کی بھُوک پیاس میں۔ عرب کی دھوپ میں۔ عراق کی گرمی میں۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ ہو سکتا تھا کسی کی آواز پر عباس سے کہیں کہ تم چلے جاؤ۔ کسی کی آواز پر علی اکبر سے کہیں تم چلے جاؤ۔ خدا کی قسم غلاموں کی صدا پر عباس چلے جاتے تو بھی اسے فخر ہو جاتا۔ علی اکبر چلے جاتے تو بھی اسے فخر ہو جاتا مگر مولا سے کیونکر ممکن تھا کہ حبیب کی لاش پر خود جائیں اور جوَن غلام ابی ذر کی لاش پر کسی اور کو بھیج دیں۔ نہیں جو بچپن کے دوست کی لاش پر گیا ہے وہی غلام ترکی کی لاش پر بھی جائے گا وہی غلام ابوذر کی لاش پر بھی جائے گا۔ اور جو علی اکبر کی لاش پر گیا ہے وہی حُر کے لاشے پر بھی جائے گا۔ اب کتنی پیاس مولا کی بڑھ گئی کتنی مشقت بڑھ گئی مگر حقوق الناس میں یہ تفریق نہیں کر سکتی۔ اس کے لعد بڑے سخت سے سخت ماحول میں حقوق الناس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ہمارے ہاں تو سلام کے معاملے میں چھوٹے اور بڑے کی تفریق ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ بڑا مستثنیٰ ہے۔ خیمے میں کون تھا جو مولا سے چھوٹا نہ ہو مگر جب رخصت آخر کے لئے۔ کیا رخصت آخر نزاکت وقت کو اتنا بتا سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب ابھی ایک چھوٹی سی قبر بنا کر آرہے ہیں اور اس عالم میں حقوق الناس کا یہ خیال کہ درِ خیمہ پر کھڑے ہو کر صدا دے رہے ہیں السّلام علیک یا زینب السّلام علیک یا اُمّ کلثوم۔ یہ تو بہنوں کو سلام ہو گیا اور السّلام علیک یا سکینہ السّلام علیک یا فاطمہ۔ یہ بیٹیوں کو سلام ہو گیا۔ السّلام علیک یا لیلیٰ السّلام علیک یا رباب یہ بیویوں کو سلام ہو گیا۔ السّلام علی اللواتی قتل ازواجھن واولادھن فی نصرتی سلام ہو ان خواتین

پر جن کے شوہر اور جن کے عزیز میری نصرت میں جان نثار کر گئے۔ لیجئے ام وہب کو سلام ہوگیا اور زوجہ مسلم ابن عوسجہ کو سلام ہوگیا اب کیا فرماتے ہیں۔ السّلام علیک یا فضّہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے فضّہ تمہیں بھی میرا سلام ہو۔ یہ حضرت فاطمہ زہرؑا کی کنیز ہے۔ فضّہ کو سلام ہو گیا۔ یہ ہیں حقوق الناس مگر بڑا سخت موقع ہے جو عرض کر رہا ہوں مجھے اسی پر مجلس ختم کر دینی چاہیئے مگر ابھی تھوڑا آگے بڑھنا ہے کہ مولا کے دل پر داغ تھا کہ اسلام میں اور مسلمانوں میں دفن کرنا سب سے اہم بات ہے مگر میں اپنے ساتھیوں کے لاشے دفن نہیں کر سکا۔ ہاں احترام میّت جتنا ممکن تھا۔ جہاں تک ممکن ہوا۔ کسی لاش کو میدان میں نہیں رہنے دیا۔ یہاں پر ذراسی تفریق ہے۔ جب تک اصحاب رہے لاشے اُٹھوائے اور جب دل کے ٹکڑوں کی باری آئی تو خود اُٹھاتے، خود لاشے اٹھائے۔ کسی کو رہنے نہ دیا۔ سوائے اس کے جس کی لاش نہ اُٹھ سکتی ہو۔ ورنہ بھلا مولا جو غلام ابوذر کی لاش تک کو اٹھوائیں وہ عباس کے لاشے کو رہنے دیں یا شاءاللہ اجرکم علی اللہ۔ مجلس ہوگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چند لفظوں میں سورہ کی عملی تفسیر کو پُورا کر دوں۔ ارباب عزا احترام میّت جتنا ممکن تھا اتنا کیا مگر مولا کو یہ صدمہ رہ گیا کہ دفن نہیں کر سکا مگر دُنیا کو دکھا دیا کہ دیکھو یہ وقت کی مجبوری ہے مگر میں اس فرض کو بھُولا نہیں ہوں۔ اس لئے ایک چھوٹی سی لاش کو دفن کر کے اس فریضہ اسلامی کو بھی اَدا کر دوں گا۔ علی اصغر کی لاش کو بے دفن نہیں رہنے دوں گا۔ اب آگے بڑھتی ہے آیت کہ وتواصوا بالحق۔ ایک دُوسرے کو حق کی ہدایت کرتے ہیں۔ خدا کی قسم مولا نے جتنے خطبے پڑھے ہیں اسمیں اپنا تعارف کرایا ہے کہ میں کون ہوں میں کون ہوں۔ یہ ہرگز اُمید نہیں تھی کہ وہ راہ راست پر آجائیں گے مگر یہ تواصوا بالحق کو ادا کرنا تھا۔ اس کے بعد تواصوا بالصبر۔

مجھے اصحاب میں بھی اسکی مثال ملتی ہے۔ مسلم ابن عوسجہ گھوڑے سے گرے۔ حبیب ابھی زندہ ہیں۔ حبیب کو لئے ہوئے مولا قریب آئے ہیں۔ مسلم کی حبیب ابن مظاہر سے بھی زیادہ عمر تھی۔ اس لئے کہ ان کا اصحاب رسول میں بھی روایتوں میں شمار آیا ہے۔ سب سے زیادہ کبیر السن تھے۔ ضعف پیری بھی ہے زخم بھی لگے ہیں اس لئے غش میں ہیں حبیب پکارتے ہیں مسلم مسلم۔ آنکھ نہیں کھولتے حبیب کہتے ہیں حسینؑ سرہانے کھڑے ہیں۔ حسینؑ کا نام سُننا تھا کہ مسلم ابن عوسجہ نے آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے کہا مسلم اگر اُمید ہوتی کہ تمہارے بعد زندہ رہوں گا تو کہتا کچھ وصیّت کرو۔ مگر پھر بھی اگر کچھ کہنا ہے تو کہو۔ کمزور اتنے ہیں کہ آنکھ نہیں کھلتی تھی مگر جیسے ہی یہ سُنا تو ایک دفعہ تھرتھرائی ہوئی انگلی کو بلند کیا اور حسین کی طرف اشارہ کر کے کہا اُوصِیكَ بِهٰذَا۔ وصیّت یہ ہے کہ ان کا دامن نہ چھُوٹنے پائے۔ یہ کیا ہے تواصوا بالصبر پر عمل ہے۔ اور اہل عزا اب آگے بڑھوں ایک روایت آپ سنا کئے ہوں گے۔ اثنائے جنگ میں علی اکبر ایک مرتبہ آئے تھے اور کہا تھا کہ بابا گرانی آہن نے جان لے لی اور پیاس نے مار ڈالا اگر ایک جرعہ آب مِل جائے تو پھر جنگ کر سکتا ہوں طاقت کے ساتھ۔ اور مولا نے زبان اپنی ان کے دہن میں دی اور علی اکبر نے گھبرا کر نکال دی اور کہا بابا آپ کی زبان تو میری زبان سے زیادہ خشک ہے اس وقت مولا نے بس ایک جملہ کہا تھا کہ بس جاؤ عنقریب تمہارے دادا تمہیں ایسا جام پلائیں گے جس کے بعد کبھی پیاسے نہیں ہو گے۔ یہ تو بہت دفعہ آپ نے سُنا ہوگا۔ اب علی اکبر میدان میں گئے جتنا ممکن تھا جہاد کیا آواز دی بابا میرا سلام قبول کیجئے مولا کسی طرح لاش پر گئے۔ اسکو بھی ایک دن عرض کر چکا ہوں بہر حال لاش پر پہنچے۔ ایک دفعہ کہا یا علی آنکھیں کھولو۔ حسین کی آواز سن کر علی اکبر نے آنکھیں

کھولیں - اب کیا کہا ہے - چونکہ ابھی ابھی مولا ان کی پیاس کی شدت کو دیکھ چکے تھے - تو ایک طرف باپ کے لئے تسلی بھی ہے دوسری طرف ان کے ارشاد کی تصدیق بھی ہے اتنا وقفہ گزرا ہے کہ بس مولا پہنچے ہیں تو مولا بعد میں پہنچے ہیں علی پہلے آ گئے ہیں۔ علی اکبر کہتے ہیں یا ابتاہ ھذا جدی قد سقانی بکاسہ الاوفی شربۃ لا اظمع بعدھا - اے بابا یہ میرے دادا سامنے ہیں انہوں نے مجھے ایسا جام پلا دیا ہے جس کے بعد میں کبھی پیاسا نہیں ہوں گا - اس کے بعد ایک جملہ اور کہتے ہیں اس کی کیا ضرورت ہے خدا کی قسم یہ خاندان رسول کی فرد ہیں اور شریعت اسلام کے تقاضوں کو بھی جانتے ہیں قرآن کی ہر آیت بھی انہیں حفظ ہے مگر محسوس کیجئے کہ یہ حفظ مراتب کے خلاف ہے کہ بیٹا باپ کو وصیت کرے کہ ثابت قدم رہنا - مسلم ابن عوسجہ کے لئے آسان تھا حبیب سے کہہ دینا - علی اکبر کے لئے تقاضائے منزل کے خلاف ہے کہ یہ باپ سے کہیں کہ ثابت قدم رہیئے - مگر دیکھئے ایک ہی جملے میں فصاحت و بلاغت میں یہ علی کا وارث ہے - یہ دو مہمیں طے کرتا ہے ایک طرف باپ کو تسلی دی کہ مجھے ایسا جام پلا دیا کہتے ہیں کہ دادا ایک دوسرا جام ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں - فرما رہے ہیں یہ میرے فرزند حسینؑ کے لئے ہے ارے وہ بڑا پیاسا ہے وہ بھی آیا چاہتا ہوگا یہ جام اس کے لئے ہے - دیکھئے کس ادب سے انہوں نے وتواصوا بالصبر پر عمل کر دیا - بس ارباب عزا مصائب کو اتنا طول دینا مشکل تھا مگر میں نے مختصر مختصر منزلیں طے کر کے اس مہم کو آسان کر دیا - اب آخری بات اور اسی پر مجلس ختم - یہ علی اکبر تھے صاحب زبان تھے یہ زبان سے انتہائی ادب کے ساتھ الفاظ جاری کر سکتے تھے مگر اب جو بے زبان ہے مگر وہ بھی قرآن ناطق کا جز ہے - بولتے ہوئے قرآن کا وہ بھی جز ہے باوجود بے زبانی کے وہ قرآنی فریضہ کو ادا کرے گا - کیونکر - وہ ایسے کہ - ادھر تیر آتا ہے وہ مسکراتا ہے - یہ اپنے انداز میں تواصوا بالصبر ہے -

مجلس چہارم

اِحسان و بلا۔ غرض آزمائش۔ ضد و ثباتِ قدم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ۔

ارشاد ہو رہا ہے کہ ضرور بالضرور ہم تمہاری آزمائش کریں گے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ خوف یعنی ڈر اور بھوک اموال کی کمی اور جانوں کی کمی اور ثمرات یعنی میوہ ہائے زندگانی کی کمی اور خوشخبری دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آئے تو ان کا قول یہ ہو کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم کو پلٹ کر جانا ہے یہ وہ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے درود ہے اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہِ ہدایت پر ہیں۔ صلوٰۃ۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ کی لفظ جس سے یہ آیت شروع ہوئی ہے یہ بلا سے ہے۔ ابتلا ایک مصدر ہے اس سے فعل بنتا تو لِیَبۡتَلِیَنَّکُمۡ ہوتا مگر وہاں ہے ولنبلونکم۔ تو یہ بلا سے ہے۔ ابتلا سے نہیں ہے بعض لفظیں عربی کی ایسی ہیں کہ ہماری اُردو میں آکر وہ اپنے اصل محل سے ہٹ گئی ہیں۔ لفظ عربی کی ہے اور معنی اُردو کے

ہیں۔ اس کی وجہ سے اکثر حالات میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث منبروں سے اکثر آپ نے سُنی ہو گی کہ مَنْ بَکیٰ عَلَی الْحُسَیْنِ فَقَدْ اَحْسَنَ بِالنَّبِیِ وَفَاطِمَہ۔ اب اسکا ترجمہ اُردو میں احسان کی لفظ کو دہرا کر جو کیا جائیگا تو اس سے میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی ترجمہ میں وہی احسان کی لفظ لے آئی جاتی ہے جو اصل حدیث میں ہے۔ جس نے حضرت امام حسین پر گریہ کیا اس نے پیغمبر خدا اور فاطمہ زہرا پر احسان کیا (معاذاللہ) احسان کی لفظ اُردو میں اس معنی میں آگئی ہے کہ وہ شخص اسکا مستحق نہیں ہے گویا ہم اپنے لطف و کرم سے اسکو کچھ عطا کرتے ہیں تو وہ احسان ہے۔ آپ اپنے ہاں اس لفظ کے استعمال کے محل کو دیکھ لیجئے کسی شخص نے آپ کو کچھ قرض دیا ہو اور اسکو اب ضرورت بھی ہے آپ کو معلوم ہوا کہ اسکو ضرورت ہے آپ نے لے جاکر اس کا قرضہ بر محل ادا کر دیا وہ کہتا ہے آپ نے بڑا احسان کیا کہ اسوقت یہ دے دیا تو فوراً آپ جواب دیں گے کہ احسان کیسا وُہ تو میرے ذمّہ واجب الادا تھا۔ اب مفہوم دیکھ لیجئے۔ احسان کیسا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ احسان وہ ہے جو بلا استحقاق ہو اور چونکہ آپ کا حق تھا میرے ذمّہ آپ کا فرض تھا لہٰذا میں نے فرض ادا کیا اور خود سبکدوشی حاصل کی اور اب احسان کیسا۔ تو احسان کا مفہوم بالکل نمایاں ہو گیا۔ اب وہ جُملہ کہیئے کہ جس نے گریہ کیا اس نے رسول اور فاطمہ پر احسان کیا۔ یہ ویسا ہی تصوّر ہے جیسے کوئی کہے کہ ہم نے عبادت کی تو اللہ پر احسان کیا۔ جس کے ہم پر اتنے حقوق ہیں کہ عمر بھر عبادتیں کریں تو اسکی نعمتوں کا حق ادا نہ ہو تو اسکی عبادت کرنا اس پر احسان کیسے ہو گا۔ اس معنی کے اعتبار سے عربی میں لفظ مَنَّ ہے۔ منت کے معنی ہیں احسان کرنا چنانچہ قرآن مجید میں احسان کے لئے ہے لَا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ

یہاں وہ معنی ہیں کہ تم مجھ پر اسلام لانے کا احسان نہ جتاؤ بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے ایمان کی تم کو ہدایت کی۔ صلوٰۃ۔

تو اب احسان کا محل آپ نے دیکھ لیا۔ قرآن مجید میں جو اس کے لئے لفظ آئی۔ اس کے ترجمہ میں میں نے کہا احسان اب بات سمجھ میں آگئی۔ تو وہاں وہ غلطی کیوں ہوئی اس لئے کہ ہم نے عربی کی لفظ احسان کو ترجمے میں صرف کر لیا۔ اور ترجمہ ہے اُردو۔ لہٰذا جو احسان کے اُردو معنی تھے وہ ہمارے ذہن میں آتے! اسی لئے ہم احسان کے ساتھ پر کہتے ہیں یہ پر خود ایک بار کا پتہ دیتا ہے جیسے عربی میں مَنّ کے ساتھ عَلَیَّ آیا۔ لَا تَمُنُّوْا عَلَیَّ۔ ویسے ہی ہم کہتے ہیں اس پر احسان۔ پر کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہمارا بار ہے اس کے کاندھے پر۔ اور عربی میں احسان کے ساتھ عَلیٰ نہیں آتا ب آتا ہے۔ فَقَدْ اَحْسَنَ بِالنَّبِیِّ اس جملے میں بھی اَحْسَنَ کے ساتھ ب ہے تو اس میں وہ بارِ احسان نہیں ہے۔ احسان کے معنی ہیں حسنِ عمل اسی لئے قرآن مجید میں کہیں کہیں اٰمَنُوْا کے ساتھ جو زیادہ تر عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ہے تو اٰمَنُوْا وَ اَحْسَنُوْا بھی ہے۔ تو اَحْسَنُوْا کے معنی وہی ہیں جو عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ہیں۔ تو اب کیا معنی ہوتے۔ معنی یہ ہوئے کہ جس نے حسینؑ پر گریہ کیا اس نے پیغمبر خدا اور فاطمہ کا ایک ایسا حق ادا کیا جو ادا کرنا چاہیئے ہی تھا۔ ایک ایسا عمل کیا جو ہونا چاہیئے تھا یعنی یہ ایک حسنِ عمل ہے اس میں تصور احسان کا نہیں ہے۔ تو لفظ عربی معنی اُردو۔ ایسی ہی بہت سی لفظیں ہیں ان میں سے ایک لفظ بلا بھی ہے کہ تمہارے نزدیک بَلا تو بَلا ہی ہے یعنی بہت ہی خراب۔ رسیدہ بود۔ بلائے ولے بخیر گذشت۔ تو بلا کے معنی ایک بُری چیز۔ ایسے ہی ایک اور لفظ ہے فتنہ۔ اُردو میں فتنہ ہنگامہ بے محل کو کہتے ہیں۔ اب چُونکہ اُردو میں فتنہ کے یہ معنی ہیں تو جب عربی میں ہم یہ لفظ سُنیں گے تو وہی مفہوم ذہن میں

آئے گا جو اُردو میں ہمارے ذہن نشین ہے تو اب دیکھیئے کہ بلا کا وہ مفہوم جو آپ کے ہاں ہے اور خالق نے اپنے حکم کو جو قربانی اسمٰعیل کے لئے تھا ارشاد ہوا ان ھذا لھو البلاء العظیم۔ اب آپ کہیئے یہ بہت ہی بُری بلا تھی معاذ اللہ خدا کے خلیل پر کوئی بلا نازل ہوئی تھی۔ تو معلوم ہوا کہ بَلا کی لفظ سے بَلا کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور اب فتنے کے معنی جو ہماری نظر میں بُرے ہیں۔ فلاں آدمی کیا ہے وہ تو فتنہ ہے وہ بھی ایک مذمت ہی ہے۔ اور فتنہ برپا کر دیا وہ بھی ایک غلط اقدام ہی کو کہتے ہیں اور اب جو قرآن مجید کی یہ آیت سُنتے ہیں کہ اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ تمہارے مال اور اولاد۔ اب اگر وہی لفظ دہرا دیئے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہ دونوں بڑے فتنے ہیں۔ اب کوئی زاہد خشک کہہ دے کہ ہاں اموال تو واقعی فتنہ ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ مال اگر ایسی بُری چیز ہوتا تو قرآن مجید میں ہر جگہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے ساتھ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ کیوں ہوتا۔ زکوٰۃ بغیر مال کے ہوتی ہی نہیں تو کیا خدا چاہتا ہے کہ ہر آدمی فتنہ میں مبتلا رہے ہر آدمی فتنہ پرداز رہے۔ مگر اموال کو کوئی زاہد کہدے تو کیا اولاد کو بھی فتنہ ہی سمجھیں کیا اولاد بُری چیز ہے یہ کوئی رہبانیت والا نظام کہتا تو خیر۔ لیکن قرآن نے جہاں اعلان ہو گیا کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے اور جہاں پیغمبر کثرت اولاد کی ترغیب دیں کہ میں ناز کروں گا اپنی اُمّت کی کثرت پر تو وہاں یہ تصوّر کیونکر ہو گا کہ اولاد فتنہ ہے تو ترجمہ کی وجہ سے یہ بَلا میں بھی غلطی ہوئی فتنے میں بھی غلطی ہوئی ترجمہ کی وجہ سے۔ نہ بلا کے معنی اس بلا کے ہیں اور نہ فتنے کے معنی اس فتنے کے ہیں۔ بلا کے معنی بھی ہیں امتحان اور فتنے کے معنی بھی ہیں امتحان ——— ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ یقیناً ضرور ہم تمہاری آزمائش کریں گے۔ ہم تمہارا امتحان لیں گے۔ یہ تو بحمد اللہ پانچ

مجلسوں کا سلسلہ ہے تو کل فلسفہ امتحان عرض کروں گا کہ آخر اللہ اپنے بندوں کا امتحان کیوں لیتا ہے مگر بہرحال قرآن مجید میں جا بجا مختلف لفظوں سے امتحان کا اعلان کیا گیا ہے یہاں تک کہ وجہ تخلیق کو بھی امتحان قرار دیا گیا ہے هل اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شی مذکورا نبتلیه۔ کیا انسان پر ایسا بھی وقت آیا ہے کہ جب وہ بالکل ہی قابل ذکر نہ تھا۔ ہم نے پیدا کیا خلق کیا انسان کو ملے جلے ہوئے نطفے سے۔ نَبْتَلِیْهِ۔ اس کو محل آزمائش میں جانے کے لئے۔ اور اسی کے لئے اُسے چشم بینا اور گوش شنوا عطا ہوئے ہیں۔ اسکو سمیعاً بصیراً بنایا۔ قوت سماعت عطا کی اور قوت بصارت عطا کی۔ تو اصل تخلیق انسان کا مقصد۔ نبتلیه ہم اسکو محل آزمائش میں لائے۔ آج جو کرنا ہے وُہ یہ کہ آخر انسان ہی کیوں اس لائق تھا کہ اُسے محل آزمائش میں لایا جائے اگر پتھروں کی بھی آزمائش ہوتی جمادات کی۔ نباتات کی بھی آزمائش ہوتی اور حیوانات کی بھی آزمائش ہوتی تو پھر انسان کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اُسے خلق کیا جائے تاکہ محل آزمائش میں لائیں۔ یہ انسان ہی کو کہنا کہ ہم نے اسکو خلق کیا تاکہ اس کو محل آزمائش میں لائیں اس کے معنی یہ ہیں کہ آزمائش کا مقصد اُن میں سے کسی سے پُورا نہیں ہوتا تھا وہ آزمائش کا مقصد اسی سے پُورا ہو سکتا ہے جسکا نام ہے انسان تو اب اس کے لئے جو حضرات ان مجالس میں شریک تھے جو سورہ والعصر پر ہوئیں تو وہ تمہید آج کے بیان کی ان کے ذہن میں تو بالکل آسکتی ہے۔ یعنی میں نے عرض کیا کہ انسان کے علاوہ جتنی اور مخلوق ہے وُہ یک رُخی ہے یعنی بس جو خاصیت ان میں طبیعتاً پائی جاتی ہے اسی کے تحت میں اس کے افعال ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف جمادات، نباتات، حیوانات۔ ان کے لئے تو دھرانا ہو جائے گا جو ماشاء اللہ ان مجالس میں شریک تھے۔ تو میں نے کہا تھا کہ ان میں مذمت کے قابل بھی کام ہیں حیوانات میں اچھے کام بھی ہیں۔ کچھ میں ایسے

اوصاف ہیں کہ تعریف ہوتی ہے۔کسی جانور کی وفا مشہور اور اسی طرح شجاعت۔
شجاعت اگر اچھی صفت نہ ہوتی تو شیر کے ساتھ بڑی ہستیوں کو کیوں تشبیہہ دی
جاتی۔معلوم ہوا شجاعت اچھی صفت ہے۔تب تو بلند ہستیوں کو بھی مجازاً شیر کے
ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ جانوروں میں اچھی صفتیں بھی ہیں بُری صفتیں
بھی ہیں۔ اس صورت سے ان مجالس میں عرض نہیں کیا تھا۔ بہرحال مطلب یہی تھا
ان میں لیکن انداز دُوسرا تھا۔ تو ان میں اچھی صفتیں بھی ہیں بُری بھی مگر جو اچھی صفتیں
ہیں وہ بھی مقتضائے طبیعت ہیں اور جو بُری صفتیں ہیں وُہ بھی مقتضائے طبیعت ہیں
لہٰذا جو اچھی صفتیں ہیں ان پر مدح ہوگی شکریہ نہ ہوگا اور جو بُری صفتیں ہیں ان کی
مذمّت ہوگی ملامت نہیں ہوگی۔ لیکن یہ انسان اسمیں دوطرفہ صلاحیتیں ہیں یعنی
میں نے وہاں یہ تعبیر کی تھی کہ لچکدار مخلوق۔ گھٹنے کی بھی صلاحیت بڑھنے کا بھی امکان۔
پستی میں آنے کی بھی صلاحیت بلندی پر بھی جانے کا امکان۔ تو یہ دونوں طرح کی
صلاحیتیں اس میں ہیں۔ جب دونوں طرح کی صلاحیتیں اس میں ہیں تو جس طرح وہاں
میں نے کہا تھا کہ اور کہیں خسارہ کا سوال نہیں ویسے ہی اور کسی میں آزمائش کا سوال
نہیں۔بچھو کا تو کام ہی ڈنک مارنا ہے۔اب اسکو ہاتھ پر بٹھا کر امتحان لیجئے گا کہ
ڈنک مارتا ہے یا نہیں۔شیر کا تو کام ہی پھاڑ کھانا ہے تو کیا اس کے سامنے
جائیے گا کہ پھاڑ کھاتا ہے یا نہیں۔آگ کا کام جلا دینا ہے تو کیا آگ میں جائیے
گا اس میں داخل ہوجیئے گا کہ یہ جلاتی ہے یا نہیں۔ دریا کا کام ڈبو دینا ہے تو آپ
بغیر پیراکی کا فن جانتے ہوئے پھاندیئے گا کہ ڈبوتا ہے یا نہیں صرف یہ دیکھنے
کو کہ ہم ڈوبتے ہیں یا نہیں یا یہ ڈبوتا ہے یا نہیں۔ جناب دونوں خاصیتیں۔
اس میں خاصیت ہے ڈبو دینے کی آپ میں صلاحیت ہے بچنے کی۔اور اگر آپ
اس صلاحیت کی وجہ سے نہ بچئے گا تو آپ بھی خاصیتاً ڈوبیئے گا۔ ڈوبنا خاصیتاً

ہوگا بچنا اپنی صلاحیت سے ہوگا۔ تو حضور والا جب ان میں گھٹنے کے سوا بڑھنے کا امکان نہیں تو ان میں آزمائش کا سوال نہیں۔ اور اُدھر ہیں فرشتے۔ ان کی بھی آزمائش نہیں کرتا ہے کہ دیکھیں وہ عبادت کرتے ہیں یا نہیں۔ وُہ تو عبادت کے خاص انداز ہی پر ان کی طبیعت ڈھلی ہوئی ہے مگر ہاں ان کے افعال بغیر ارادہ نہیں ہیں۔ یعنی رکوع ان کا بلا ارادہ نہیں ہے اگر ان کا رکوع بلا ارادہ ہوتا تو پھر اس کے چھوڑنے پر قادر نہ ہوتے۔ اگر بلا ارادہ ہوتا وہ رکوع و سجود تو پھر انہوں نے محل پہچان لیا تو پھر رضوان درزی کیوں بن کر آتا اور فرشتے مدد کے لئے کیوں آتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فاعل مُختار وہ بھی ہیں مگر ان کا اختیار ہمیشہ نیکی کی طرف جاتا ہے۔ کیونکہ محرکات بدی ان میں نہیں ہیں۔ انسان میں بھی اگر بُرائی کے محرکات نہ ہوں تو فطرۃً وہ بھی اچھائی کی طرف جاتا۔ یہ معنی ہیں اس کے کہ کُلُّ مَولُودٍ یُولَدُ عَلیٰ فِطرَۃِ الاِسلَامِ ہر مولود فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے یعنی اگر دُوسرے محرکات نہ ہوں تو وہ ہمیشہ اسی راستے پر جائے گا جو اللہ کو پسند ہے۔ تو یہ دُوسرے محرکات ہیں جو اُسے غلط راستے کی طرف لے جاتے ہیں مگر اس میں ان محرکات کے اثر لینے کی بھی صلاحیت ہے اور محرکات سے اثر نہ لینے کی بھی صلاحیت ہے جو اس صلاحیت کو بروئے کار لائے ہوئے ہیں وہ معصوم ہیں جو اُس صلاحیت سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں جو برائی کی طرف لے جاتی ہے وُہ گناہ گار ہیں۔ تو ملائکہ کی اطاعت بھی ارادی انسان کی اطاعت بھی ارادی۔ ملائکہ فاعل مضطر نہیں ہیں وہ بھی فاعل مختار ہیں مگر اختیار ان کا اطاعت کی طرف بغیر مزاحم کے ہے۔ اس اختیار کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ انسان کے لئے رکاوٹیں ہیں تو اب انسان میں صلاحیّت گھٹنے کی بھی ہے اور بڑھنے کی بھی ہے۔ انسان میں صلاحیت معصیت کی بھی ہے اطاعت کی بھی۔ چونکہ دو قسم کی صلاحیتیں ہیں تو اب

امتحان کے یہ معنی ہیں کہ اس کی صلاحیتوں کو عالم فعلیت میں لانے کے لئے مواقع فراہم کرنا یعنی اگر وہ مواقع نہ ملیں تو اس کا جوہر نہ کھلے کہ اس میں کونسی صلاحیت ایسی ہے کہ جسکو یہ بروئے کار لائے۔ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع دینے کا نام امتحان ہے۔ اگر مال و دولت ملتا ہی رہے تو پھر قناعت کے جوہر کا ظہور کیونکر ہو۔ اگر کبھی مصیبت آئے ہی نہیں تو صبر کے جوہر کا امتیاز کیونکر ہو۔ اگر کوئی سخت معرکۂ جنگ آئے ہی نہیں تو ثابت قدمی کی صفت کا مظاہرہ کیونکر ہو اور اب اس کے برخلاف دیکھ لیجئے اگر سخت موقع نہ آئے تو گریز پا افراد کے کردار کا ظہور کیونکر ہو تو یہ امتحان ہے صلاحیتوں کے ظاہر کرنے کے لئے مواقع دینے کا نام۔ اگر حکم ہو، ہی نہیں کہ بیٹے کو ذبح کرو تو خلیل کا مقام اطاعت کیونکر سامنے آئے۔ اگر آتشِ نمرود مشتعل ہی نہ ہو تو خلیل کے ثبات قدم کا جوہر کیونکر سامنے آئے۔ تو نام اسکا امتحان ہے مگر حقیقت میں وہ انسانی جوہروں کے نمایاں ہونے کیلئے مواقع فراہم کرنا ہیں۔ یہاں تک تو ایسا تھا کہ شاید کچھ افراد پورے طور پر ذہن نشین ہی نہ کر سکے ہوں۔ انشاء اللہ اُمید ہے کہ سب لوگوں کے ذہن میں مطلب تو آ ہی گیا ہوگا چاہے کچھ لفظیں اِدھر اُدھر رہ گئی ہوں کیونکہ جو لفظ سمجھ میں نہیں بھی آتی وہ سیاق و سباق سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اب جناب ہر دفعہ میں کہہ چکا کہ مجھے طلبا ہی یاد آتے ہیں۔ زندگی جو گزری ہے وہ انہی میں۔ لہٰذا ہمیشہ انہی سے سابقہ رہتا ہے تو انہی کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ تو جناب مجھے لکھنؤ یونیورسٹی میں امتحانات کے نگراں ہونے کا بہت موقع ملا ہے۔ تو جو نگراں ہوتا ہے اُسے تین گھنٹے کا وقت گزارنا بڑا مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان تین گھنٹوں میں آئینی طور پر کوئی اور کام کر بھی نہیں سکتے۔ کوئی اور مشغلہ اختیار نہیں کر سکتے۔ ورنہ فرض میں کوتاہی ہے۔ بہرحال اب ظاہر ہے کہ جب آدمی کو فرصت ہو تو ہر چیز کو وہ

غور سے دیکھے گا۔ ہر چیز پر اسکی توجہ ہوگی۔ تو اب امتحانات کی خصوصیات بھی مجھے یاد ہیں۔ ایک دفعہ ذہن نشین ہوئیں تو وہ ہر مرتبہ مجھے یاد آتی ہیں۔ جناب کسی کمرۂ امتحان میں ایک مرتبہ گئے تو وہاں بس میز تھی کرسی تھی اور کاپیاں دی گئیں لکھنے کے لئے۔ اسکے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ فرض کیجئے دوسرے دن گئے کسی دوسرے کمرے میں امتحان لینے کے لئے تو وہاں جن سے مثلث وغیرہ بناتے ہیں پرکار وغیرہ وہ رکھے ہوئے ہیں ہم نے پوچھا جناب کل تو یہ سب کچھ نہیں تھا۔ آج کیوں ہے انہوں نے کہا جی کل تھا آرٹ کا امتحان۔ ادب ہو یا کچھ ہو بڑا وسیع دائرہ ہے۔ تو کل اسکا امتحان تھا۔ اسمیں تو بس ذہن زاویے بناتا ہے اسمیں بس تصور کی لکیریں کھینچی جاتی ہیں۔ اسمیں ان سب کی ضرورت نہیں تھی۔ آج مثلاً فن ہیئت۔ مجھے پرانے نام یاد ہیں۔ جدید نام تو مجھے یاد ہیں نہیں۔ اقلیدس آج اسکا پرچہ ہے تو اب اسمیں دائرے بنانے ہیں شکلیں بنانا ہیں اقلیدس کی اور لکیریں کھینچنی ہیں لہٰذا یہ سب رکھا گیا ہے۔ تو اب اس سے کیا نتیجہ نکلا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جس قسم کا امتحان لینا ہو اس کے اسباب فراہم کرنے چاہئیں۔ بغیر اس کے اس شعبہ کا امتحان نہیں ہوگا۔ ایک دن گئے کلاس میں دیکھا کہ خاک اُڑ رہی ہے کلاس میں۔ طلبا ہیں ہی نہیں۔ ارے صاحب کیا ہوا امتحان نہیں ہے۔ جی نہیں۔ آج وہ سب سڑک پر ہیں۔ کیونکہ امتحان پیمائشوں کا ہے۔ تو جناب جب تک سڑک نہ ہو وہ امتحان نہیں ہو سکتا اور بعض دفعہ تو یہ دیکھا کہ سب طلباء کسی پہاڑی پر لے جائے گئے معلوم ہوا اس فن کا امتحان ہے جسکا پہاڑوں سے تعلق ہے تو معلوم ہوا کہ جس قسم کا امتحان ہو ویسے اسباب کا فراہم کرنا جزو امتحان ہے۔ اب یہاں ہے انسانی کردار کے شعبوں کا امتحان۔ اور انسانی کردار کے شعبے ہیں مختلف۔ جتنے قسم کے اخلاق ہیں جتنی قسم کے احکام شریعہ ہیں جتنی قسم

کے انسان کے اچھے اور بُرے کام ہیں وہ سب مختلف شعبوں سے انسانی کردار کے متعلق ہیں۔ تو یہاں امتحان جو ہے وہ کردار کا ہے۔ جب کردار کا امتحان ہے تو جس قسم کا کردار نمایاں کرنا ہو یعنی جیسا پرچہ امتحان کا جس طالب علم کو دینا ہو اس کے حسبِ حال اسکی ضرورت کے مطابق اسباب فراہم کرنا ممتحن کا فریضہ ہے اب اگر کسی کے صبر کا امتحان ہے تو مصیبتوں کا آنا ضروری ہے فقر و فاقہ کا ہونا ضروری ہے۔ یہ فقر و فاقہ میں مبتلا رکھنا دلیل ناراضگی نہیں ہے۔ رضا و ناراضگی نتیجۂ امتحان سے وابستہ ہے۔ یہ فقر و فاقہ یہ مصائب تو ضرورت امتحان ہیں اور اگر کسی کے شکر کا امتحان لینا ہے۔ اور یہ پرچہ ہے امتحان کا تو نعمتوں کی بارش کا ہونا ضروری ہے اور یہ نعمتوں کی بارش دلیل مہربانی نہیں ہے۔ مہربانی و نامہربانی نتیجۂ امتحان سے وابستہ ہے۔ یہ نعمتوں کی بارش تو ضرورت امتحان ہے اسی طرح اگر حاکم کا رعایا کے ساتھ اچھا یا بُرا سلوک یہ کردار انسانی ہے تو پھر ضرورت ہے کہ تخت و تاج ملے۔ ضرورت ہے کہ مسندِ حکومت ملے۔ اب وہ مسندِ حکومت رائے عامہ سے ملے یا باپ کی چھائی ہوئی ملے۔ کسی بھی صورت سے وہ مسند وہ تاج و تخت ملے ورنہ اس کردار کا امتحان ہی نہیں ہو سکتا۔ صاحب اختیار ہونے کے بعد اسکا کردار کیا ہو سکتا ہے۔ یہ عدل کرتا ہے یا ظلم کرتا ہے یہ خلق خدا کو فائدہ پہنچاتا ہے یا خلقِ خدا کی بربادی کا سامان کرتا ہے تو جو کچھ ناراضگی و رضامندی ہو گی وہ نتیجۂ امتحان پر ہو گی۔ نہ وہ دولت نتیجۂ رضائے پروردگار نہ تخت و تاج دلیل رضائے پروردگار وہ بھی بطور امتحان یہ بھی بطور امتحان۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے لئے امتحان ہے اس بات کا کہ وہ مرکز ظلم و تشدد ہونے کے بعد کیا کرتا ہے تو کسی جابر حکمران کے زیر سایہ اسکو زندگی گزارنے کا موقع دینے کی اسکو ضرورت ہے تاکہ دیکھا جائے کہ وہ شدائد کے مقابلے میں ہمت تو نہیں

ہار جاتا اور وہ مصائب کے بعد پستی کردار میں تو مبتلا نہیں ہوجاتا۔ تو اب نہ وہ ظالم کے زیر تسلط آجانا دلیل ناراضگی پروردگار نہ اسکا حکمران بن جانا دلیل رضائے پروردگار۔ یہ سب امتحان کے انداز ہیں۔ یہ سب امتحان کے طریقے ہیں۔ نتیجہ متعلق ہوتا ہے اس کردار سے جو عالم ظہور میں آئے۔ آپ حضرات کی بڑی محبت ہے کہ مجھ سے ایسا غیر دلچسپ بیان ایسا خشک وعظ آپ سن لیتے ہیں اور پھر دوسرے دن سُننے کے لئے آجاتے ہیں۔ امتحان کے معنی آپ کی سمجھ میں آئے اور یہ سمجھ میں آیا کہ امتحان جب لیا جائے تو اس کے لئے ویسے ہی اسباب فراہم کرنے چاہیئں جو امتحان کے لئے ضروری ہیں ورنہ پھر امتحان ہی نہیں ہوسکتا ہے اور ان اسباب کا فراہم کرنا اگر وہ ناگوار طبع ہیں تو ناراضگی کی بنا پر نہیں ہے اور اگر وُہ خوشگوار ہیں تو وہ رضامندی کی بنا پر نہیں ہے وہ بھی بضرورت امتحان ہیں یہ بھی بضرورت امتحان ہیں یہ ہے خلاصہ اپنے اس بیان کا جو آپ کے سامنے پیش کیا اب میں عرض کرتا ہوں کہ ذرا غور فرمایئے کہ جس طرح کچھ حالات ذریعہ امتحان ہوتے ہیں اسی طرح کچھ شخصیتیں شخصیتوں کے لئے پرچۂ امتحان بنتی ہیں یعنی اگر فرعون نہ ہو تو موسویت پردہ میں رہ جائے اگر نمرود نہ ہو تو خلیلیت پردہ میں رہ جائے اور اگر یزید نہ ہو تو حسینیت پردہ میں رہ جائے اور اسی طرح ادھر سے۔ اگر ابراہیم نہ ہوں تو نمرودیت پردہ میں رہ جائے اگر موسیٰ نہ ہوں تو فرعونیت پردہ میں رہ جائے اور اگر حسین نہ ہوں تو یزیدیت پردہ میں رہ جائے۔ اسی لئے ایک شاعر نے بڑے پتہ کی بات کہہ دی ہے کہ یزید کوئی انوکھا بُرا نہیں تھا ویسے بہت سے بُرے ہیں مگر کیا کیا جائے کہ ان کے لئے حسین جیسا اچھا سامنے نہیں ہے اس لئے ان کی بُرائی اس نقطہ پر نمودار نہیں ہوئی۔ یک حسینے نیست کو گردد شہید۔ ورنہ بسیار اند در دنیا یزید۔ جن جن کو ہم بُرا سمجھتے ہیں۔ یزید کی خصوصیت نہیں۔ جن

جن کو ہم بُرا سمجھتے ہیں۔ ویسے بُرے بہت ہیں مگر ان کے مقابل میں ویسے اچھے نہیں ہیں جیسے ان بُروں کے مقابلے میں آگئے تھے لہٰذا انکی بُرائی زیادہ نمایاں ہوگئی اور بُرائی کا چرچا بہت بڑھ گیا تو ہر شخصیّت دُوسری شخصیت کے لئے باعث امتحان ہوتی ہے۔ ہاں کوئی غلط فہمی نہ ہو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو اچھا ہے وہ خود اپنی جگہ اچھا ہے اور جو بُرا ہے وہ خود اپنی جگہ بُرا ہے۔ اب وُہ سوال ختم ہوجاتا ہے کہ اللہ نے شیطان کو کیوں پیدا کیا اگر شیطان کو پیدا نہ کرتا تو معصومین کا درجہ امتیاز نمایاں کیونکر ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ایک سلسلہ ہے جس میں فرعون ابوجہل ابولہب اسوقت والا ابوسفیان پھر آخر میں یزید یہ سب اک سلسلہ ہے اور دُوسرا سلسلہ ہے جس میں ابراہیم موسیٰ حضرت رسالت مآبؐ اور جس سلسلہ کو میں پیش کر رہا ہوں اس کے آخر میں۔ یہاں تک میرا بیان ہے آخر میں حسینؑ تو اسی کو پیش نظر رکھ کر اقبال نے کہہ دیا ہے۔ موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید۔ ایں دو قوت از حیات آمد پدید۔ یعنی موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید بظاہر آدمیوں کے نام ہیں لیکن حقیقت میں یہ خیر و شر کی دو قوتیں ہیں۔ یہ حق و باطل کی دو قوتیں ہیں جنکے مظاہر کا نام بہ اعتبار دور و زمانہ بدلتا جاتا ہے۔ تو ایک وقت میں جو ایک قوت کا مظہر ہے وہ ہے موسیٰ جو دوسری قوّت کا مظہر ہے وہ ہے فرعون۔ اور ایک وقت میں جو ایک قوّت کا مظہر ہے وہ ہے ابراہیم اور جو دُوسری قوت کا مظہر ہے وہ ہے نمرود۔ پھر آخر میں وہی۔ ایک قوت کا مظہر جو ہے وہ حسین ہے اور دوسری قوّت کا مظہر وہ ہے یزید۔ اقبال کا تصوّر جو ہے اُسے سمجھے کہ وہ ایک متن تھا جسکی میں نے شرح کی۔ اب ظاہر ہے کہ بہت سے افراد تھے لیکن ضرورت شاعری کی وجہ سے موسیٰ و فرعون آگئے شبیر و یزید آگئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ذہن میں سب ہیں مصرعہ میں تقطیع کے ماتحت اور نہیں آئے لیکن اقبال کے ذہن میں سب ہیں نمرود بھی ہے،

ابراہیم بھی ہیں اور سب بھی ہیں درمیان والے شروع میں تو سب ہیں لیکن اس کے بعد دیکھ لیجیے کہ زندہ حق از قوت شبیری است باطل آخر داغ حسرت میری است۔ اب موسیٰ کا نام نہیں ہے قوت کلیمی اب نہیں ہے اب قوت شبیری ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے اپنے وقت کے نام تو سب الگ ہیں لیکن اس قوت کا اصل نام قوت شبیری ہے۔ اسی قوتِ شبیری کے حامل اپنے وقت میں موسیٰ ہیں اور اسی قوت شبیری کے اپنے وقت میں حامل ابراہیم ہیں اور کیا کیا جائے کوئی صفت چھوٹے کی ایسی نمایاں ہوتی ہے کہ بڑے بھی اسے اختیار کرتے ہیں عذر نہیں کرتے۔ اسی قوت شبیری کے حامل اپنے وقت میں محمد مصطفیٰ تھے۔ حق اسی قوت سے زندہ ہے یعنی اگر قوت شبیری نہ ہوتی جو ازل سے مختلف شکلوں میں آتی رہی تو حق مُردہ ہو جاتا اور بقاعدہ تضاد اگر حق پرست افراد جو جو بھی تھے ان کی طرف کا نام قوت شبیری تھا تو ماننا پڑے گا کہ جو فرعون میں تھی وہ بھی قوت یزیدی تھی اور جو نمرود میں تھی وہ بھی قوت یزیدی تھی اور ابوجہل و ابولہب میں جو تھی وہ بھی قوت یزیدی تھی۔ اس دور میں اسکا وہ نام تھا۔ اصل میں قوت یزیدی تھی۔ جو ہر دَور میں کارفرما تھی۔ یعنی قوت حسینی ہمیشہ دُوسری نقابوں میں تھی ۶۱ھ میں بے نقاب ہو کر آئی اور قوت یزیدی ہمیشہ روپوش تھی اور اب وہ بے حجاب ہو کر آئی تو اب جو میں کہتا ہوں اسپر غور کر لیجیے کہ کسی دور کے حسین نے کسی دَور کے یزید کی بیعت نہیں کی۔ ہاں یہ بیعت نہ کرنا پھولوں کی سیج بھی نہیں رہا ہے۔ نتائج اس کے بہرحال ہر ایک کے لئے ناخوشگوار ہی ہیں۔ اگر موسیٰ فرعون کے سامنے سر جھکا دیتے تو دربدر کیوں پھرنا پڑتا دشت نوردی کی مصیبت کیوں برداشت کرنی پڑتی کہ اسی جنگل میں ان کی وفات ہوئی اور اگر جناب ابراہیم نمرود کی خدائی کو معاذ اللہ تسلیم کر لیتے تو آگ میں کیوں پھینکے جاتے اور پھر دیس سے پردیس میں انہیں کیوں جانا پڑتا۔

ان کا ملک تو نہیں تھا جہاں انکی اولاد گئی۔ یہ سب عراق میں تھے یہ شام کیوں جاتے مصر کیوں جاتے۔ بنی اسرائیل بعد میں مصر گئے۔ یہ سب نمرود کے سامنے سر نہ جھکانے کے نتائج تھے اور اگر حضرت پیغمبر اسلام اپنے وقت کے یزیدوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیتے۔ جو وہ چاہتے یہ بھی ان کے ہمنوا ہو جاتے تو جسم مبارک پر پتھر کیوں کھانے پڑتے اور عزیزوں کے لاشے کیوں دیکھنے پڑتے اور تمام مصائب زندگی برداشت کیوں کرنے پڑتے تو ہمیشہ یہ نتائج مرتب ہوئے اور پھر بھی نہیں مانے یعنی پھر بھی ان کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا۔ اب جس جس کو جو سہنا پڑا لیکن انہوں نے اپنی بات نہیں بدلی۔ اب اسی کا نام ضد ہے تو کون نبی ضدی نہ تھا۔ خدا کی قسم یہ ہم تک پیغام خدا کا پہنچنا ان سب کی ضدوں کا صدقہ ہے۔ اگر پہلے ہی علمبردار حق باطل کے سامنے سر جھکا دیتا تو حق آج ہم تک بطور امانت نہ پہنچتا۔ یہ حق کی امانت جو دست بدست ہم تک پہنچی ہے یہ انہی ثابت قدم افراد کی بدولت ہم تک پہنچی ہے۔ اب لفظ بدلی ہوئی ہے میں اسکو ثبات قدم کہتا ہوں کوئی اسکو ضد کہتا ہے میں کہتا ہوں کہ ہمیشہ اہل باطل اس ثبات قدم سے اپنی شکست محسوس کر کے اسے جھنجلا کے ضد کہتے ہیں۔ وہ ماورائے تاریخ کی باتیں ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ فرعون والے یہی کہتے ہوں گے کہ موسیٰ بڑے ضدی ہیں اتنا ہم نے کہا اور پھر بھی نہیں مانتے نمرود والے یہی کہتے ہوں گے کہ ابراہیم بڑے ضدی ہیں کہ یہ سب کچھ ہو گیا پھر بھی راہ حق سے نہیں ہٹتے اب وہ سب ابوجہل وغیرہ یہی کہتے ہوں گے کہ بڑے ضدی ہیں پتھر کھا رہے ہیں اور نہیں مانتے۔ تمام مصائب اٹھا رہے ہیں اور پھر بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اب ان سب کی باتیں ہم تک نہیں پہنچیں اس لئے کہ فرعون والوں کی نسلیں ہم تک نہیں آئیں۔ حسینؑ نے جو نہیں مانا تو ہم تک پہنچ گئی کیونکہ اسوقت ضد کہا گیا اور ضدی کہنے والے آج تک رہ گئے۔ تو یہ غصہ میں آ کے ضد کہتے ہیں۔

کہ ہمارا مقصد نہ پُورا ہوا۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ ہمارے سامنے سر جُھکا دیں۔ یہ باطل کا داغِ دِل ہے، جو حق پرستوں کی طرف سے ہے اور یہ شکل اختیار کر رہا ہے۔ اور جب تک دنیا میں ایک حق پرست بھی باقی ہے وُہ کسی بھی خطۂ ارض پر ہو اس وقت تک دُنیا والوں کو اس پر غصّہ رہے گا۔ اب جناب اس کے معنی یہ ہیں کہ ابراہیم اس وقت مجازی طور پر حسین۔ مقام حق پرستی میں یا باطل سے ٹکر لینے میں وہ حسین تھے اور موسیٰ بھی اپنے وقت میں حقیقت کے لحاظ سے موسیٰ تھے، مجازاً اس صفت کی شرکت کی وجہ سے حسین تھے۔ اور پھر دفع دخل کر چکا کہ اپنی جگہ فضائل کا اُونچا ہونا اور بلند ہونا دُوسری چیز ہے لیکن کسی صفت کا نمایاں ہونا اور بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ بھی باوجود بلند تر ہونے کے فضائل میں مقامِ مقاومت باطل میں اور ظلم کے سامنے ثابت قدم رہنے میں حضرت محمد مصطفیٰ بھی اپنے وقت میں حسین تھے اور یہ بھی ایک مفہوم ہے۔ انا من الحسین کا حسین کو دیکھو تو مجھے پہچانو گے کہ میرا اثبات قدم بھی حسین میں آکر ظاہر ہوا۔ صَلوٰۃ۔ دھرانے کی عادت نہیں ہے مگر سلسلہ کلام کے لئے نتیجے کے چسپاں کرنے کے لئے کہ ابراہیم اپنے وقت کے حسین اور لازمی طور پر فرعون بھی اپنے وقت کا یزید نمرود بھی اپنے وقت کا یزید اور ابوجہل و ابوسفیان وغیرہ بھی اپنے اپنے وقت کے یزید۔ اس جُملے کے کہنے کے لئے میں نے یہ دہرایا کہ جب مجازی حسینوں نے مجازی یزیدوں کی بیعت نہیں کی تو بھلا حقیقی حسین حقیقی یزید کی بیعت کیسے کر لیتے۔ صَلوٰۃ۔

وہ جو میں نے کہا کہ بیعت نہ کرنا کبھی خوشگوار نتائج کا حامل نہیں رہا۔ ان لفظوں میں کہا تھا کہ پھُولوں کی سیج نہیں رہا اب ایک اور لفظ کہتا ہوں کہ جب وہ مجازی حسین وہ مجازی یزید۔ وہ مجازی حسین وہ مجازی یزید۔ وہ مجازی حسین وہ مجازی یزید۔ جب یہ سلسلہ ایک آگیا تو یاد رکھئے کہ جہاں حسین اور یزید کا مقابلہ ہوتا ہے۔

اسکا نام کربلا ہے تو اب مولانا محمد علی جوہر کا شعر بھی با معنی ہوگیا جہاں بھی حق اور باطل کا معاملہ ہو وہ ایک کربلا ہے یعنی فرعون و موسیٰ کا مقابلہ ہوا وہ ایک کربلا تھی۔ خلیل و نمرود کا مقابلہ ہوا وہ بھی ایک کربلا تھی اور مدینہ میں اگر پیغمبر اسلام کا اور ان سب کا مقابلہ ہوا وہ ایک کربلا تھی مگر جب وہ سب مجازی حسین تھے اور ان کے مقابلے میں سب مجازی یزید تھے تو لازماً ماننا پڑے گا کہ وہ سب مجازی کربلائیں تھیں اور یہ حقیقی کربلا تھی جو کربلا میں ہوئی تو جب وہ مجازی کربلائیں تھیں اور کربلا ہوتی ہے کرب و بلا سے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مصائب جو حقیقی کربلا کے ہوں گے وہ مصائب نہ موسیٰ کو برداشت کرنے پڑے نہ ابراہیم کو برداشت کرنے پڑے نہ ہمارے پیغمبر کو ان جیسے مصائب برداشت کرنے پڑے حالانکہ پیغمبر خدا نے فرمایا ما اوذی نبی کما اوذیت۔ جیسی اذیتیں مجھے ملیں اتنی کسی نبی کو نہیں ملیں تو میں کہتا ہوں کہ ہم تو بحمداللہ مسلمان ہیں اور آپ کا ارشاد ہمارے لئے آمنّا و صدقنا کہنے کے لئے کافی ہے لیکن اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان سے یہ پوچھ لے کہ تمہارے رسول کا یہ ارشاد ہے۔ بر بنائے واقعات ثابت کرو کہ تمہارے رسول کو جو ایذائیں ملیں وہ کسی پیغمبر کو نہیں ملیں اور پھر قرآن و حدیث اور آپ ہی کی کتابوں سے وہ ان ایذاؤں کی فہرست بھی دکھا دے جو دوسرے انبیا و مرسلین کو پیش آئیں تو یاد رکھئے کہ ایک مسلمان کی شاید روانی کلام کم ہو جائے زبان میں گرہ پڑ جائے۔ اگر حسینؑ کو رسولؐ سے الگ کرلیں۔ لیکن اگر مصائب حسین مصائب رسول کی فہرست میں داخل ہیں تو پیغمبر نے یہ بات تو نہیں کی کہ میرے جسم پر زخم کتنے آئے ہیں کہ کسی نبی کے جسم پر نہیں آئے۔ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے ایذا اتنی پہنچی۔ اب پوچھ لیجئے کسی بھی حساس انسان سے کہ اولاد کی تکلیف سے اُسے ایذا ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ فاطمہ زہرا کے لئے ہو وہ بھی رسول کی ایذا

اور اب یہ تلخ بات ہے کہیں مَیں بھی اس کی زد میں نہ آجاؤں کہ قیامت تک جو بھی اس کے دین کے خلاف ہوتا ہے وہ پیغمبر کی ایذاؤں کی فہرست میں داخل ہے اگر ان کی رسالت قیامت تک کے لئے ہے اگر ان کا دین قیامت تک کے لئے ہے تو اس دین پر جو مصائب آئیں۔ کسی بھی دَور میں۔ وہ سب پیغمبر کے مصائب میں داخل ہیں۔ اب بتائیے کون نبی آتا ہے ہمارے پیغمبر کے مقابل موقف امتحان میں۔ اور کون پیغمبر آتا ہے موقف امتحان میں ہمارے رسولؐ کے سامنے۔ تو یہ کربلا ہے اور جب کربلا ہے تو یہاں مصائب بھی جو ہوں گے وہ کہیں نظر نہیں آئیں گے اسی لئے وہ پہلا جز کہ کسی نے بیعت نہیں کی اس کے لحاظ سے میں کہا کرتا ہوں کہ امام حسین نے کوئی نیا کام نہیں کیا انہوں نے وہی کیا جو ان کے پیش رو ہمیشہ کرتے آئے تھے کس نے بیعت کی۔ انہوں نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ اسی لئے امام عصر نے فرمایا اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا وَارِثَ آدَمَ صَفِیِّ اللہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا وَارِثَ مُوسٰی کَلِیْمِ اللہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا وَارِثَ عِیْسٰی رُوْحِ اللہ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا وَارِثَ نُوْحَ نَبِیِّ اللہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اِبْرَاہِیْمَ خَلِیْلِ اللہ۔ کیا یہ نسبی وراثت ہے اگر نسبی وراثت ہوتی تو اس میں یہ نہ آتا کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا وَارِثَ مُوسٰی کلیم اللہ یَا وَارِثَ عیسٰی روح اللہ۔ کیونکہ وہ ان کے شجرہ نسب میں نہیں آتے ہیں۔ ماننا پڑے گا کہ یہ نسبی وراثت نہیں ہے یہ حفاظت حق کی وراثت ہے وہی کام جو آدم سے چلا تھا وہی کام جو نوح نے انجام دیا وہی کام تھا جو اس وقت حسین انجام دے رہے تھے انہوں نے کوئی نیا کام نہیں کیا جو کسی نے نہ کیا ہو مگر پھر بھی میں کہتا ہوں کہ ان کی قربانی کی مثال نہ اوّلین میں ہے نہ آخرین میں ہے کوئی کہے کہ یہ متضاد باتیں ہوگئیں ابھی تو کہا کہ یہ نئی بات نہ تھی اور ابھی کہا کہ اسکی مثال نہ اولین میں ہے نہ آخرین میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے

دونوں باتیں سمجھ کر کہی ہیں۔ انہوں نے کیا وہی جو ہمیشہ کیا گیا مگر ہوا ان کے ساتھ وہ جو کسی کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ لسے میں یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہمیشہ باطل کے دل میں کچھ حسرت رہ گئی۔ انہوں نے اتنا تو برداشت کر لیا اتنا ہم نے اور کیوں نہ کیا اُسے تو برداشت نہ کر سکتے پھر ہمارا مقصد حاصل ہو جاتا۔ اس اعتبار سے صابر کے متعلق غلط فہمی رہ گئی کہ اتنا تو سہہ گئے اتنا تو برداشت کر لیا اس سے زیادہ اور ہوتا تو اسکو برداشت نہ سکتے۔ یہ بات کربلا میں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اب ظلم سوچ نہیں سکتا کہ اتنا اضافہ اور ہو جاتا تو شاید مقصد حاصل ہو جاتا اور اب صابر کے متعلق سوچا نہیں جا سکتا کہ اسے تو نہ برداشت کر سکتے۔ کیا رہ گیا جسے نہ برداشت کر سکتے اور مصائب میں کیا چیز نئی آسکتی ہے۔ ممکن ہے میری زبان سے سُنا ہو کہ کربلا میں اگر جنگ مغلوبہ ہوتی اور ایک مرتبہ ہی سب شہید ہو جاتے تو ہمارے آنسو بہانے کے لئے تو بحیثیت مصیبت وہ بھی کافی تھا لیکن یہ جوہر اختیار صبر نمودار نہ ہوتا جو کربلا کی تدریجی رفتار مصائب میں ہے۔ اصحاب سب چلے گئے اب بھی امام اقرار بیعت کر کے علی اکبر کی جوانی کو بچا سکتے ہیں اب بھی عباس جیسے باوفا بھائی کو بچا سکتے ہیں مگر حسینؑ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا اور اسکو میں کبھی یوں کہتا ہوں کہ امام حسینؑ کے سامنے ایک ترازو نصب تھی ایک میزان نصب تھی جس کے ایک پلڑے میں حق تھا جو بدلنے والی چیز نہ تھی دُوسرے پلڑے میں قربانیاں آرہی تھیں اور مولا اپنے عمل سے ثابت کر رہے تھے کہ حق کا وزن میرے نزدیک زیادہ ہے۔ یہ قربانی بھی مجھے گوارہ ہے۔ دوپہر اور اس کے بعد تک۔ ایک پلڑے میں کبھی حبیب ابن مظاہر کی رفاقت آئی کبھی مسلم ابن عوسجہ کی وفاداری آئی۔ فیصلے ہوتے رہے پھر جب دل کے ٹکڑوں کی باری آئی تو ایک پلڑے میں وہی حق اسلام اور دین اور دُوسرے پلڑے میں یتیم بھتیجا اور وہ کون قاسم ابن الحسن اور

کیسا بھتیجا جس کے لئے ارشاد شیخ مفید کی روایت ہے کہ جب میدان جنگ میں گئے تو فوج دشمن کے ایک سپاہی نے کہا خَرَجَ غُلَامٌ کَانَ وَجْهُهُ فَلْقَةُ قَمَرٍ۔ ایک بچہ ایسا نکلا جیسے چاند کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ اب جو دشمن کی نگاہ میں چاند کا ٹکڑا ہو وہ چچا کی نگاہ میں کیا ہوگا وہ پھوپھی کی نگاہ میں کیا ہوگا وہ بیوہ ماں کی نگاہ میں کیا ہوگا مگر امام نے دکھلا دیا کہ دیکھو یہ قربانی بھی مجھے گوارہ ہے مگر وقار حق پر حرف نہ آئے حق کو صدمہ نہ پہنچے۔ اب ایک منزل آئی کہ ایک پلڑے میں وہی اسلام دین حق اور دوسرے پلڑے میں وفائے عباس اور مولا نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ دیکھو یہ قربانی بھی مجھے گوارہ ہے عباس کی شہادت بھی گوارہ ہے ہاں ہاں کمر ضرور ٹوٹ جائیگی مگر ہمت نہیں ٹوٹے گی کمر شکستہ ہو جائیگی مگر ہمت شکستہ نہیں ہوگی اور اب اے اہل عزا ایک پلڑے میں وقارِ اسلام اور دوسرے پلڑے میں شباب محمدی۔ رسولؐ اللہ کی ہو بہو جوانی۔ حسینؑ نے یہی تو تعارف کرایا تھا پروردگارا اب وہ جا رہا ہے جو صورت و سیرت اور رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے مگر حسینؑ نے اپنے عمل سے دکھا دیا کہ یہ قربانی بھی گوارہ ہے پھر ثابت کر دیا کہ میری ہمت شکستہ نہیں ہوئی دیکھو اب دشمن کے علم میں میرے پاس قربانی نہیں ہے۔ صفیں تو سب خالی ہو چکیں۔ اب اسے کوئی نظر نہیں آتا جسے میں بھیج دوں مگر دیکھو میری ہمت ابھی ہے قربانی کی۔ کہ میں ڈھونڈ کر قربانی لاؤنگا چاہے وہ گہوارہ کی آغوش سے ہو چاہے پھوپھی کی آغوش سے ہو چاہے وہ ماں کی گود سے ہو مگر میں قربانی پیش کر دونگا ارباب عزا یہ دیکھ لیجئے کہ حسین کی ہمت کا کیا ذکر انکے ہاتھوں میں رعشہ بھی نہیں ہے یوں بعض وقت کہہ دیا جاتا ہے کہ مولا نے بچے کو کانپتے ہاتھوں پر بلند کیا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ بربنائے واقعہ دیکھئے کیا مولا کے ہاتھ کانپ رہے تھے یاد رکھئے نشانہ جتنا مختصر ہو اتنا ہی تیر کا خطا کرنا آسان ہوتا ہے اگر قدم پیچھے ہٹتا تو تیر خطا کرتا اگر ہاتھ کو جنبش ہوتی تو تیر خطا کرتا مگر نہ قدم پیچھے ہٹا نہ ہاتھ کو جنبش ہوئی تیر ٹھیک نشانے پر پڑا فانقلب الصبی علی ایدی الامام۔ بچہ امام کے ہاتھوں پر منقلب ہوگیا۔

مجلسِ پنجم

عظمتِ قربانی۔ ذبحِ عظیم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ۔ الخ

تمام سلسلہ انبیأ میں ہمارے پیغمبر سے پہلے سب سے بالاتر ذات حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تھی اس لیئے ان کا امتحان دہرا ہوا۔ ذات کے بارے میں بھی امتحان اور اولاد کے بارے میں بھی امتحان۔ ذات کے بارے میں امتحان ہوا کہ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈالے گئے۔ اسکا ذکر کل کر چکا۔ اب دوسرا امتحان اولاد کے بارے میں۔ جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے ہمیں اس امتحان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اتنا عظیم امتحان یعنی آگ میں پھینکا جانا اور اس کا گلزار ہونا اسکا ذکر صرف دو جگہ ایک ایک اور دو دو آیتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اسکا ذکر اتنے اختصار کے ساتھ ہوا ہے۔ اور یہ امتحان جو اولاد کے بارے میں تھا۔ اس کا ذکر کئی آیتوں میں مسلسل۔ شروع سے لیکر آخر تک کی ترتیب کے ساتھ اس کی کڑیاں موجود ہیں۔ یہ میں بتاؤں گا کہ درمیان کی کڑیاں اکثر سننے والے کی سمجھ پر چھوڑ کر بنظرِ اختصار ترک کی گئی ہیں ورنہ آغاز کار اور انجام کار اس سب کو قرآن مجید نے نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سلسلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے وَبَشَّرْنَاہُ بِغُلَامٍ حَلِیْمٍ ۔ ان کو ہم نے ایک متحمل بیٹے کی بشارت دی۔ اب

اس بشارت کے لفظ سے کچھ لوگوں کو دھوکہ ہو رہا ہے اور کچھ اسمیں یہود و نصاریٰ کا نظریہ ہمارے نظریئے سے مختلف ہے۔ تو چونکہ دوسری جگہ۔ دو جگہ اس کے علاوہ۔ جناب اسحٰق کی بشارت کا ذکر ہے اور تفصیل کے ساتھ ہے تو اب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہ قربانی کا واقعہ جناب اسحٰق سے متعلق ہے۔ مسلمان بظاہر تو سبھی مگر تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے اسلام بھی۔ مگر شاذ و نادر غالباً اسی بشارت کے ذکر سے دھوکہ کھا کے۔ انہوں نے بھی ایسا قول اختیار کر لیا کہ یہ جناب اسحٰق سے متعلق ہے۔ طبری نے اپنی تاریخ میں ان علماء کا نام لے لے کر ذکر کیا ہے۔ ابتدائی صدیوں کے متعلق کہ وہ بھی ایسا ہی کہتے تھے کہ یہ جناب اسحٰق سے متعلق ہے۔ مگر زیادہ تر علمائے اسلام کا نظریہ اور عام اسلامی تصوّر یہی ہے کہ یہ جناب اسمٰعیل سے متعلق ہے۔ اب اگر انہی چند علمائے اسلام سے بحث کرتا ہوں۔ جنہوں نے یہ قول اختیار کر لیا تو تو قرآن مجید کی آیتیں اور ہماری حدیثیں فیصلہ کُن ہو سکتی ہیں لیکن یہاں چونکہ سامنے ایک جماعت غیر مسلمین کی ہے لہٰذا فیصلہ قرآن مجید کی آیتوں سے تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ قرآن مجید کو مانتے ہی نہیں تو اب ان سے گفتگو میں فیصلہ کن چیز کیا ہو۔ میرے خیال میں دو ذریعہ ہیں ایک انہی کی بائیبل اور دُوسرے عقلی روایت کیونکہ عقل کسی ایک قوم کی ملکیت نہیں ہے۔ جو قرآن عقلی کا تقاضا ہو اسمیں مذہب و ملّت کا سوال نہیں ہوتا۔ تو اب میں پہلے اس بحث کا فیصلہ بائیبل سے چاہتا ہوں۔ ان لوگوں کے لئے جو ناواقف ہیں۔ ان کی واقفیت کے لئے عرض کر دوں کہ جناب اسمٰعیل پہلے متولد ہوئے تھے اور جناب اسحٰق بعد میں پیدا ہوئے۔ وہ بڑے بھائی تھے اور یہ چھوٹے بھائی تھے۔ پھر جب بائیبل ہی میں دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے اور پُورا اندازہ ہوتا ہے کہ جناب اسمٰعیل تیرہ برس بڑے تھے جناب اسحٰق سے۔ اب جب یہ حقیقت

سامنے آگئی تو اب جسکا دل چاہے وُہ بائیبل کو اُٹھا کر دیکھ لے۔ وہ تو ہر زبان میں ہے ہم تو جو اور زبان میں ہیں انکو ترجمہ قرآن کہتے ہیں مگر ان کے ہاں ہر زبان والی بائیبل اصلی ہے۔ کیونکہ ان کے پاس اصل تو کوئی اور ہے ہی نہیں۔ آپ ان سے جا کر کہئے بائیبل دیجئے وہ یہی دیں گے آپ کہیں گے کہ یہ تو ترجمہ ہے وہ کہیں گے جی نہیں یہی ہے اصل بائیبل۔ تو وہ ہر ایک کیلئے وہی ہے اور دُنیا کی سب سے زیادہ زبانوں میں جو ترجمہ ہوا ہے وہ اسی بائیبل کا ہے۔ اس لئے کسی زبان کی بائیبل دیکھ لیجئے کہ جب وقت جناب ابراہیم نے فرزند کی قربانی کرنے کا تہیّہ کیا اس وقت کی انکی ایک مناجات بارگاہِ الٰہی میں بائیبل میں درج ہے۔ اسکی مناجات میں وہ کہہ رہے ہیں کہ پروردگار میں اپنا اکلوتا بیٹا تیری بارگاہ میں نذر کر رہا ہوں اب ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ چھوٹا بھائی کبھی اکلوتا نہیں ہوتا بڑا بھائی اس وقت تک اکلوتا رہتا ہے جب تک کہ چھوٹا بھائی پیدا نہ ہو یہ اکلوتے کی لفظ قطعی طور پر اس کا ثبوت ہے کہ یہ جناب اسمٰعیل سے متعلق ہے اور جناب اسحٰق سے متعلق نہیں ہے مگر اب یہ تو ان کے مقابلے میں فیصلہ بائیبل سے ہو گیا۔ میں نے کہا تھا کہ عقلی قرائن۔ تو عقلی قرائن یہ ہیں کہ اگر یہ جناب اسحٰق سے متعلق ہوتا تو اسکی یادگاریں سرزمینِ شام میں ہوتیں اس لئے کہ جناب عیسےٰ اور جناب موسیٰ سے متعلق مقامات بیت اللحم وغیرہ وہ سب موجود ہیں تو انہیں میں اس قربانی سے متعلق مقامات ہوتے تو ایک تو ظرف مکاں سرزمین شام ہوتی۔ دُوسرے ان کی دینی رسموں میں کوئی دن اسکی یادگار کا ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کے متعلقہ مقامات جتنے ہیں وہ سرزمین مکّہ میں ہیں منیٰ ہے وہ کیا ہے اور وہ عرفات وہ کیا ہے اور وُہ مزدلفہ ہے وہ کیا ہے۔ یہ تمام مقامات اسی قربانی سے متعلق ہیں اور اس لئے منیٰ ہی میں وہ قربانیاں کی جاتی ہیں جو روز عید قرباں وہاں ہوتی ہیں عام طور سے

ہمارے ہاں جو قربانیاں ہوتی ہیں وہ مستحب ہیں مگر وہاں وہ جزو حج ہیں کیونکہ اصل مرکز قربانی وہی سرزمین تھی منیٰ۔ تو وہ تمام مقامات سرزمین مکّہ پر ہیں ملک شام میں نہیں ہیں پھر یہ کہ اس سے متعلق جو دن ہیں وہ اسلامی روایات میں ہیں۔ اگر ان کے ہاں کا یہ واقعہ ہے تو انہوں نے اسکی یادگار قائم کیوں نہ کی ہمارے ہاں عید قرباں ہے تو وہ اسکی یادگار۔ پورے مراسم حج جو ہیں وہ اسکی یادگار ہیں صفا ومروہ کے درمیان سعی کیا ہے یہ بھی اسی واقعہ کے متعلق یادگار ہے اور سالِ گذشتہ غالباً انہی مجالس میں وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ۔ یہ سرنامہ کلام تھا تو اسمیں اسکو عرض کر چکا ہوں کہ یہ تمام چیزیں حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ سے نسبت رکھتی ہیں۔ جناب ہاجرہ سے اور جناب ابراہیم سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔ سب اس واقعہ قربانی سے متعلّق ہیں۔ اب یہ تو فیصلہ ان کے مقابلے میں ہو گیا۔ یہ جو چند پُرانے علمائے اسلام ہیں وہ بھی اس کے قائل ہیں تو اب ان کے لئے قرآن مجید پیش کر دوں کہ یہ بشرناہ بغلام حلیم۔ یہ پورا سلسلہ چلا اور قربانی کا ذکر ہو گیا اور اس قربانی کے ذکر کے بعد ہے وبشرناہ باسحٰق۔ پھر ہم نے ان کو اسحٰق کی بھی بشارت دی تو اب تو پتہ چل گیا کہ وہ پہلی بشارت کس اور فرزند کی تھی۔ صلوٰۃ۔

مگر جناب یہود ونصاریٰ کے اس اختلاف سے میری نظر میں ایک بڑا نتیجہ حاصل ہوا اور وہ یہ کہ یہ قربانی ایسی عظیم شے ہے کہ اسے ہر ایک اپنانا چاہتا ہے۔ آخر یہ شوق کیوں ہے اگر قربانی کوئی عظیم چیز نہیں ہے تو دوسری جماعت کیوں کہہ رہی ہے کہ ہمارے ہاں ہے ہمارے مورثِ اعلیٰ کا واقعہ ہے معلوم ہوا کہ قربانی اتنی عظیم شے ہے کہ جہاں نہیں ہے وہ بھی اسے اپنانا چاہتے ہیں اس کے بعد کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک قوم کے پاس عظیم قربانی ہو اور

وُہ اس کے ذکر پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ یہ تو پہلی آیت میں میں نے پیش کردیا بشرناہ بغلام حلیم۔ یہ اختلاف اور اس کا فیصلہ اب یہ تو تمہید تھی کہ ہم نے بشارت دی ایک متحمل فرزند کی اب یہاں سے قربانی کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ بشارت یوں دی۔ اب ظاہر ہے کہ درمیان کی کتنی کڑیاں کہ وہ متولد ہوئے اسے سننے والے کے ذہن پر چھوڑا فلما بلغ معہ السعی۔ اب نشوونما ہوئی اور بڑے ہوئے اور اب وہ لڑکا جو پیدا ہوا اس عمر کو پہنچ گیا کہ دوڑ دھوپ کر سکے۔ سعی کے معنی دوڑنا تو لما بلغ معہ السعی۔ جب وہ اس حد تک پہنچ گیا کہ باپ کے ساتھ ذرا دوڑ دھوپ کر سکے۔ اس میں دو چیزیں مضمر ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ابھی جوانی کی منزل تک نہیں پہنچا ہے بس اتنا ہی اور ایک یہ کہ بہت کمسن بھی نہیں ہے کہ جو باپ کی کوئی مدد نہ کر سکے درمیانی عمر ہے۔ بچپن اور شباب کے درمیان کی۔ بس اتنی کہ ابھی تھوڑا سا وہ چل پھر کر باپ کی خدمت کر سکتا ہے تو جب یہ ہوا تو اب ہمارے علم میں کیا ہے کہ انہوں نے خواب دیکھا۔ اب بنظرِ اختصار قرآن مجید خواب کا ذکر نہیں کرتا کہ انہوں نے خواب دیکھا اور وہ کیا دیکھا۔ نہیں بلکہ جب وہ سعی کی منزل تک پہنچا تو باپ نے بیٹے سے کہا کہ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں اب اسی سے سمجھ لیجئے کہ خواب دیکھا اور یہ بھی روایتیں بتاتی ہیں کہ تین روز مسلسل دیکھا۔ یہ قرآن کے الفاظ سے نمایاں ہے۔ صیغۂ ماضی نہیں ہے کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا۔ اس کے لئے ہوتا رَاَیۡتُ فِی الۡمَنَامِ اس کے معنی ہوتے میں نے خواب میں دیکھا۔ یہاں مضارع کا صیغہ ہے اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ۔ میں خواب میں یہ دیکھ رہا ہوں دیکھ رہا ہوں کہ معنی یہ ہیں کہ کئی دفعہ یہ دیکھا ہے بس اب سمجھ لیجئے کہ خلیل کہہ رہے ہیں کہ میں نے خواب دیکھا ہے اور دیکھ رہا ہوں تو اس واقعہ کو جو نہیں بیان ہوا تو سمجھ لیجئے کہ انہوں نے خواب دیکھا جبھی تو

بیان کیا کہ یَا بُنَیَّ اے میرے بچے اِنِّیۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ اِنِّیۤ اَذْبَحُكَ۔ کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی۔ ذرا تم دیکھو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ میں بارگاہ جناب ابراہیم میں عرض کروں گا کہ اے خلیل اللہ خواب دیکھا ہے آپ نے۔ حکم ہوا ہے آپ کو۔ اسکی تعمیل فرمائیے۔ یہ بیٹے سے رائے لینے کے کیا معنی کہ تم دیکھو تمہاری کیا رائے ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر بیٹے سے یوں ذکر نہ کرتے تو قربانی فقط کارنامہ ابراہیم ہوتی۔ کارنامہ اسمٰعیل نہ ہوتی اور جب بیٹے سے اس طرح ذکر کر لیا اور بیٹے نے وہ جواب دیا جو ابھی بیان ہوگا اور پھر قربانی ہوئی تو اب وہ دونوں کا کارنامہ ہے باپ کا بھی کارنامہ ہے اور بیٹے کا بھی کارنامہ ہے۔ اب جناب ایک دوسرا سوال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حکم اتنا شدید کہ طبیعتِ انسانی پر گراں ہے کہ اپنے بچے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ تو حکم اتنا شدید اور ذریعہ حکم اتنا خفیف یعنی خواب۔ ہمیں معلوم ہے کس طرح احکام آتے ہیں فرشتہ آتا پیغام الٰہی پہنچاتا یہ عام طریقہ ہے۔ خواب بھی ایک قسم وحی ہے مگر عام طریقہ تو یہ ہے حکمِ الٰہی پہنچانے کا۔ جی نہیں۔ اتنا عظیم حکم اور وہ صرف خواب کے ذریعہ سے۔ تو یہی میرے موضوع کلام کا ایک اہم رکن ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ امتحان جب ہے تو اُسے ذریعہ ایسا رکھنا ہے جسے ناقص نفوس خواب کہہ کر ٹال سکتے ہوں۔ اب دُنیا دیکھے کہ خلیل حق اس خواب کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اچھا اس نے خواب دکھلایا کیا ابراہیم نہیں جانتے کہ یہ حکم ہے مگر وہ بھی بیٹے سے خواب ہی کہہ کر بیان کرتے ہیں یہ نہیں کہتے کہ مجھے حکم ہو رہا ہے۔ یہی بیان کر رہے ہیں کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اگر کہہ دیتے کہ حکم ہو رہا ہے تو یہ ٹکڑا بے جوڑ ہوتا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ جب حکم ہو گیا تو رائے کا سوال کیا۔ پھر یہ کہ یہاں پر بڑا چھوٹے کا امتحان لیتا ہے خالق

اپنے خلیل کا امتحان لے رہا ہے اور اب خلیل اپنے فرزند اسمٰعیل کا امتحان لے رہے ہیں یاد رکھیے امتحان میں ایک پرچہ سوال کا ہوتا ہے۔ وہ پرچہ درس گاہ کے جو کرتا دھرتا ہیں ان کے پاس آتا ہے اور وہ بانٹا جاتا ہے طالب علموں میں۔ یہ ہوتا ہے سوال کا پرچہ۔ اس کے بعد طالب علم جواب کی کاپی لکھتا ہے۔ وہ جواب کی کاپی طالب علم کے پاس سے جاتی ہے پہلے درس گاہ کے سربراہان کے پاس۔ وہاں سے ممتحن کے پاس۔ تو میں کہتا ہوں کہ اللہ نے خواب دکھلا دیا یہ تو سوال کا پرچہ ہے جو خالق نے اپنے خلیل کے ہاتھ میں دے دیا انہوں نے اپنے بیٹے سے مشورہ لیا یہ ابھی سوال کا پرچہ ہی ہے جو باپ نے بیٹے کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب تک سوال کا پرچہ رہا تب تک لفظ خواب رہی اور جہاں سے جواب کی کاپی شروع ہوئی۔ اسمٰعیل نے لفظ بدل دی اسمٰعیل نے یہ نہیں کہا کہ جو خواب دیکھا ہے اسکی تعبیر آپ سامنے لائیے وہ اب خواب کی لفظ نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں یا ابت افعل ما تومر ستجد نی انشاء اللہ من الصابرین۔ بابا جو حکم ہو رہا ہے اسکی تعمیل کیجیے۔ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔ صلوٰۃ۔

اب گفتگو کے جو انداز ہوتے ہیں اسکو ہر صاحبِ زبان سمجھ سکتا ہے کہ گھبراہٹ کے جواب کا طریقہ اور ہوتا ہے اور اطمینانی جواب کا طریقہ اور ہوتا ہے۔ جناب اسمٰعیل کے جواب کا یہ ٹھہراؤ یا ابت افعل ما تومر۔ اے بابا جو حکم ہو رہا ہے، اسکی تعمیل کیجیے اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیے گا۔ الفاظ کا یہ ٹھہراو سکون نفس کا پتہ دے رہا ہے۔ کوئی اضطراب نہیں ہے نفس مطمئن ہے۔ بیشک بڑا عزم ثابت ہوتا ہے۔ الفاظ ہی سے ثابت قدمی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ایک حقیقت کی طرف توجہ دلاؤں کہ کہہ رہے ہیں اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیے گا یعنی اتنے عظیم امتحان میں کامیابی کے بعد منفرد صابر ہونے کا دعوی نہیں ہے

بلکہ کہتے ہیں مجھے صابرین میں سے پائیے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی جماعت صابرین سامنے ہے جس سے ملحق ہو جانا اپنی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اب عزم کی منزل میں بات طے ہو گئی کہ باپ بھی تیار بیٹا بھی تیار۔ اب منزل جب عمل کی آئی تو اسے قرآن مجید نے کس طرح ادا کیا کتنی تفصیل سے تذکرہ کیا مگر یہاں انتہائی اختصار سے فلما اسلما۔ یہ اس عظیم امتحان کی کامیابی کیلئے جب آئے ہیں باپ اور بیٹے دونوں۔ اسلما تثنیہ کا صیغہ ہے اگر الف نہ ہوتا تو واحد کا صیغہ ہوتا اور جب اسلما ہو گیا تو دو کا صیغہ ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں حکم کی تعمیل کے لئے آ گئے۔ مگر اسے کس لفظ سے قرآن مجید نے ادا کیا ہے وہ قیامت تک کے ہر مسلمان کے لئے قابل لحاظ ہے۔ کتنا عظیم امتحان اور اسکی تیاری کے لئے آنا اور اسکی تعمیل کے لئے آنا اور اسکو ایک لفظ میں فلما اسلما۔ جب وہ دونوں عملاً مسلم ہو کر آ گئے اس کے معنی یہ ہیں کہ قربانی اتنی اہم ہے کہ جزوِ اسلام ہے کہ ایسی عظیم قربانی کے لئے قرآن مجید لفظ اسلام کو منتخب کرتا ہے۔ لما اسلما جبکہ بالکل مسلم ہو کر وہ آ گئے پھر اس کے بعد وتله للجبين اس نے یعنی باپ نے اسکو یعنی بیٹے کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔ خواب میں آپ سن ہی چکے ہیں کہ آپ کیا دیکھ رہے تھے۔ انی اذ بحك میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ اب یہاں قرآن مجید گویا سننے والوں کے آبگینۂ خاطر اتنے نازک دیکھ رہا ہے کہ اس منظر کا تذکرہ وہ لفظوں میں بھی نہیں سُن سکتے لہٰذا بس یہاں پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ تله للجبين۔ پیشانی کے بل لٹایا گویا خالق یہ کہہ رہا ہے کہ اب ہم سے نہ سنو کہ کیا کیا۔ وہی کیا جو حکم ہوا تھا اب اسکا کوئی ذکر نہیں۔ بس تمہید اسکی جو ہے کہ پیشانی کے بل لٹایا اسی کا ذکر ہے تله للجبين وناديناه ان يا ابراهيم اور بس جو حکم ہوا تھا اسکی تعمیل کی اور ہم نے آواز دی کہ بس اے ابراہیم۔ کیا۔ قد صدقت الرؤيا۔ تم نے خواب سچ کر دکھایا۔ بس بس۔ اب یہاں عام طور سے اکثر مقررین ممکن ہے کہ بعض واعظین

سے بھی آپ نے سُنا ہو یہ کہہ دیتے ہیں کہ خالق نے اپنا حکم اُٹھا لیا یعنی منسوخ کر دیا۔
حکم میں تبدیلی پیدا کر دی مگر مجھے اس سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ یہ تصور غلط
ہے اسکو از روئے عقل بھی میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اور قبل میں جو خطاب
ہوا تھا اسکی بنا پر بھی عقل و قرآن کی شرکت سے بھی پیش کروں گا اور پھر تنہا قرآن
سے بھی اسکو پیش کروں گا۔ عقلی بات تو یہ ہے ذرا غور کیجیے کہ اکثر نتائج غیر اختیاری
ہوتے ہیں کیونکہ اسباب کی آخری کڑی اپنے ارادہ سے ہوتی ہے لہٰذا آخر تک نتیجہ
اسکی طرف منسوب ہوتا ہے اسکی مثال دینے میں مَیں نے دوسرے کی جان لینے میں
آسانی سمجھی تھی جدید طریقے سے۔ کیونکہ وہاں فاصلہ میں دکھا سکتا تھا کہ گولی بندوق سے
رہا ہو گئی اور ابھی وہاں تک پہنچی نہیں اب بیچ میں جتنا فاصلہ ہے۔ ابھی وہ شخص
قتل نہیں ہوا مگر بے بس ہے۔ میں نے یہ طریقہ کیوں پسند کیا اس لئے کہ چھُری
وغیرہ کے یا تلوار کے طریقے میں فاصلہ میں نہیں دکھا سکتا تھا۔ وہاں خودکشی میں
دریا والا طریقہ اپنے مطلب کا سمجھا کہ وہاں پُل سے لے کر دریا تک ایک مسافت
ہے اور یہاں میں نے یہ طریقہ اپنے مقصد کے لئے زیادہ مناسب سمجھا ہے مگر
اب یہاں مجھے اس مشکل کو آسان کرنا ہے کہ میں ذبح کی منزل میں دکھاؤں کہ
اختیار کہاں سلب ہوتا ہے اور بے اختیاری کی صورت میں نتیجہ کیونکر مرتب
ہوتا ہے وہاں میں اس مشکل میں نہیں پڑا مگر یہاں مجبوراً پڑنا ہے اس مشکل میں۔
تو اب میں آپ سے فیصلہ چاہتا ہوں۔ مگر ایک عقلی بات۔ کہ ہمیشہ تکلیف
شرع فعل اختیاری سے متعلق ہوتی ہے جو انسان کے ارادے سے متعلق ہو۔
تو دیکھئے ذبح کی منزل میں جو افعال ارادے سے ہوں وہ کیا کیا ہیں۔ جیسے ذبح
کرنا ہے اُسے سامنے لٹایئے ایک یہ کام۔ وہ کوئی دھار دار چیز ہاتھ میں لے
جس سے رگہائے گردن قطع ہوں۔ یہ دُوسرا کام جو ارادے سے متعلق ہے۔

تیسرا کام ہاتھ کو وہ جنبش دینا جس سے رگہائے گردن قطع ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اب ہر صاحب عقل جائزہ لے کہ ان میں سے کونسی بات جناب ابراہیم نے نہیں کی۔ کیا بیٹے کو سامنے نہیں لٹایا یا کسی اور کو لٹایا۔ تو قرآن کہہ رہا ہے کہ اسی کو تلہ للجبین۔ اسی کو سامنے لٹایا۔ کیا چھری ہاتھ میں نہیں لی کوئی نمائشی چیز ہاتھ میں لی۔ نہیں یہ غلط۔ پھر چھری ہاتھ میں لی۔ اب زیادہ نازک مرحلہ تیسرا ہے کیا ہاتھ کو وہ جنبش نہیں دی جس سے رگہائے گردن قطع ہوتے ہیں۔ اگر ہاتھ کو وہ جنبش نہیں دی تو وہ گوسفند بھی کیونکر ذبح ہوا جو فدیہ میں آیا تھا۔ اس لئے کہ اس گوسفند کے ذبح کی نیت سے تھی۔ اسی سے وہ گوسفند ذبح ہوا ہے تو افعال ارادی تو سب عمل میں آگئے۔ اب حکم منسوخ ہو کر کیا کرے گا۔ تو یہ عقلی بات ہو گئی کہ یہ تصوّر غلط ہے کہ حکم منسوخ کیا گیا۔ حکم منسوخ کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں دُوسری بات یہ ہے کہ یہاں حکم لفظی تو تھا نہیں کہ فرشتے نے آکر پیغام زبانی لفظوں میں پہنچایا ہو۔ یہاں تو حکم بذریعہ خواب تھا تو خواب دیکھئے کیا تھا۔ خواب یہ دیکھا ہوتا کہ میں بیٹے کو ذبح کر چکا ہوں تو عمل میں کچھ رہ گیا۔ اور خواب یہی دیکھا تھا کہ ذبح کر رہا ہوں تو جو خواب دیکھا تھا وہ عمل میں پورے طور پر لے آتے۔ اب اور حکم کہاں تھا جو منسوخ ہوگا۔ اب تیسری بات صاف طور سے قرآن سے پُوچھوں کہ صدا کیا آئی تو قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ ہم نے پکار کر کہا کہ بس بس اب ہم اپنا حکم اٹھاتے ہیں۔ جی نہیں قرآن کہہ رہا ہے کہ ادھر سے آواز آئی کہ بس بس تم نے خواب سچ کر دکھایا یعنی جو حکم تمہیں ملا تھا اسکی تعمیل تم نے کر دی۔ صَلوٰۃ۔

جناب دلیل وہ ہوتی ہے جو قطعی ہو اور بہت مستحکم ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جناب ابراہیم نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی۔ اسے مصائب کربلا کے ساتھ موازنہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے بے شک یہ قربانی پیش کی مگر محبت فرزند کی بناء پر

آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے اس واقعہ سے انکار کی ضرورت نہیں ہے۔ پٹی باندھ لی ہو تو کیا ہے۔ جو حکم ہوا تھا اسکی تعمیل کے لئے آئے ہیں۔ اسلام دلوں سے آل اولاد کی محبت نکالنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ یہ محبت بھی جزوِ اسلام ہے لہٰذا اگر بیٹے ہی کی محبت میں آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہو تو تعمیل حکم میں اس سے کیا اثر پڑتا ہے بہرحال اگر یہ واقعہ صحیح ہے اگرچہ مستند ماخذوں میں میری نظر سے نہیں گزرا ہے اس لئے یہ اگر مگر کر رہا ہوں۔ بہرحال یہ چیز جو میں نے بھی سنی ہے اور آپ نے بھی سنی ہوگی اگر یہ بالکل صحیح ہے تو میں کہتا ہوں۔ اب اسکو چاہے محاورہ کے طور پر دیکھ لیجئے چاہے عقلی طور پر دیکھ لیجئے اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو نتیجے کو دیکھتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ کردار ابراہیم اور شاندار ہو گیا اس لئے کہ انہوں نے تو آنکھ بند کر کے چھری چلائی ہے اب کون ذبح ہوا اسکی ذمہ داری ان پر نہیں ہے۔ صلوٰۃ۔

ارشاد ہو رہا ہے کہ یا ابراہیم قد صدقت الرویا۔ اصل بیان واقعہ میں تو اتنا اختصار ہوا تھا مگر اب یہاں قرآن مجید بسط و تفصیل سے کام لے رہا ہے کہ ہم نے اسکا فدیہ دے دیا ذبح عظیم کے ساتھ۔ ذبح عظیم کو ہم نے اسکا فدیہ قرار دے دیا تو اب مشکل یہ ہے کہ فدیہ میں کیا آتا ہے وہ ہمیں معلوم ہے کہ کیا تھا۔ وہ گوسفند تھا۔ تو اب علمائے جمہور۔ بڑے بڑے اکابر علما وہ خواہ علامہ فخر الدین رازی ہوں، حافظ طبری ہوں یا علامہ نیشاپوری ہوں۔ خواہ کوئی ہوں۔ بڑے بڑے علما۔ دل میں خلش ہے کہ ذبح ہوتا تو نبی زادہ اور آئندہ ہونے والا نبی۔ فقط نبی زادہ تھوڑی بلکہ وہ جو سلسلہ انبیا میں ہے وہ ذبح ہونے والا ہے اور جو چیز فدیہ میں آئی ہے وہ ہے گوسفند۔ تو گوسفند کو اللہ اس کے مقابلے میں ذبح عظیم کہدے۔ ذہن میں آتا ہے کہ گویا اتنا عظیم نہیں تھا اور ہم نے اسکا فدیہ جو قرار دیا وہ ذبح عظیم ہے۔ تو اب گوسفند کو ان کے مقابلہ میں عظیم کہا جا رہا ہے۔ اب اس کے لئے یہ بیچارے مفسرین اس

گوسفند کی عظمت دکھاتے ہیں اور اسکی عظمت کے اظہار میں مصروف ہو گئے ہیں کہ وہ گوسفند جنت کا تھا اور وہ کوئی ہزار برس سبزہ زار جنت میں چرا تھا اور وہاں اسکی پرورش ہوئی تھی۔ اسکو غذا جنت کی دی گئی تھی۔ وہ ایسا تھا اس لیے اسکو خالق نے ذبح عظیم کہہ دیا۔ مگر ان اکابرین مذہب اور علما سے میرا یہ سوال ہے کہ جناب وہ جنت کا تھا اور جنّت کے میوے کھاتا رہا۔ اور جنّت کے سبزہ زار میں چرتا رہا اس سب کے باوجود وہ گوسفند ہی رہا یا اور کچھ ہو گیا۔ ان تمام ترکیبوں کے بعد بھی رہا تو وہ گوسفند ہی۔ تو جب وہ گوسفند ہی رہا تو پھر سوال تو باقی رہا کہ نبی زادے کے مقابل میں اسے ذبحِ عظیم کہہ دیا گیا۔ یہ ایک پریشانی ہے اور ان بے چاروں کی پریشانی کے دُور ہونے کا کوئی سامان نہیں ہے کیونکہ ان کے جتنے راوی ہیں وہ اس سے آگے بڑھتے ہی نہیں۔ اب ہمیں بھی بہر حال پریشانی تو ہونی چاہیئے ہی تھی لیکن ہماری پریشانی اپنے ہاں کی تفسیر دیکھ کر دُور ہو گئی۔ جو ائمہ اہل بیت علیہم السّلام سے وارد ہوئی ہے کہ ذبحِ عظیم سے مُراد قربانی کربلا ہے۔ اب وہ خلش تو دُور ہو گئی۔

اور دُوسرے مسلمان چاہے نہ مانتے ہوں کہ انبیاء کے مقابلے میں اور ہستیاں بھی افضل ہو سکتی ہیں مگر ہم تو بحمداللہ مانتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اور ہستیاں نہیں جو خاتم الانبیاء کے اجزاء ہیں وہ گذشتہ انبیا سے افضل ہونے چاہئیں لہٰذا ہمارا دل بالکل قبول کر لیتا ہے کہ بے شک وُہ نبی ہیں اور نبی زادے میں سب کچھ ہے لیکن یہاں سیدا شباب اہل الجنۃ میں اور ان کی قربانی ہے اور حدیث ہے متفق علیہ۔ سیدا شباب اہل الجنۃ۔ یہ بھی صحاح ستہ کی حدیث ہے۔ تو اب دبی زبان سے ان علماء سے جو اس میں تامّل کرتے ہیں کہ انبیا سے کیونکر افضل ہو سکتے ہیں ان سے میں بس ایک سوال کر لوں گا کہ انبیا بھی اہل جنّت میں ہیں یا نہیں۔ بس اس سرداری کے دائرے سے بقاعدہ عقل ایک تو متکلّم خارج ہو گا جو اس سرداری کا تاج پہنا

رہا ہے وہ متکلم خارج ہوگا یا بس وہ جسے وہی اپنے الفاظ سے مستثنیٰ کر دے کہ اسکے ساتھ ایک تتمہ بھی ہے کہ ابوہما خیر منہما، ان کا باپ ان دونوں سے بہتر ہے۔ باقی اور کوئی اب اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ جسکو انکی سرداری کے دائرہ سے نکلنا ہو وہ جنت سے استعفیٰ دے دے۔ یہ پریشانی تو بالکل دُور ہو گئی بے شک ان کو اُن کے مقابلہ میں ذبح عظیم کہنا بالکل درست ہے۔ مگر جناب میں کیا کروں کہ میرے ذہن میں ایک اور پریشانی پیدا ہو گئی ایک اور خلش پیدا ہو گئی وہ یہ کہ جسکا فدیہ ہو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مقصود اصلی ہے اور جو فدیہ ہے وہ ثانوی طور سے مقصود ہے تو یہ پریشانی کسی اور کو نہ ہوتی ہمیں کو ہو سکتی ہے کہ جناب اسمٰعیل بڑے جلیل القدر سہی لیکن ان کا فدیہ سید الشہداء ہو جائیں یہ کچھ ذہن میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اب یہ خلش بہت بڑی ہے۔ حقیقت میں یہ خلش ہے ترجمہ کی غلطی کی وجہ سے کہ ب کو صلہ اور تادیہ قرار دے لیا ہے کہ ذبح عظیم کو ہم نے فدیہ بنایا اس سے یہ پریشانی پیدا ہوئی مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ہے ہی نہیں۔ یہ ب تادیہ اور صلہ کا نہیں ہے یہ ب بائے سببیہ ہے۔ فدیناہُ ہم نے فدیہ بھیج دیا۔ بات پوری ہو گئی۔ ہمیں معلوم ہے کیا ہے وہ وہی گوسفند تھا۔ فدیناہ۔ یہ جملہ گویا مکمل ہو گیا کہ امتحان ہو گیا کامیابی حاصل ہو گئی ہم نے کہا کہ ہم نے فدیہ بھیج دیا اور وہ جو بھیجا وہ ہمیں معلوم ہے۔ گوسفند۔ اب وہ گویا کہتا ہے کہ ہم سے پُوچھو کہ ہم نے کیوں وہ فدیہ بھیج دیا۔ چونکہ سنتِ الٰہیہ یہ نہیں رہی ہے کہ وہ اپنے انبیا و اولیا کو خطروں سے بچایا کرے اگر وہ انبیا و اولیا کو خطروں سے بچایا کرتا تو مثال استقلال کیونکر قائم ہوتی زکریا کو آرے سے چیر ڈالا گیا تو آرے کو نہیں روکا گیا ان کے چیرنے سے۔ اسی طرح یحییٰ کا سر قلم کیا گیا تو تلوار کو کند نہیں کیا گیا۔ تو سنّت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ انبیا پر اگر حربے ہوں تو وہ کارگر ہوں۔ بچانا اسکا اصُول نہیں ہے۔ تو یہ آخر کیوں بچایا کیوں

فدیہ بھیجا۔ وہ کہتا ہے سنو ہمارا مقصد تو ہے مثال قربانی پیش کرنا۔ یہ اس جملے کی شرح ہے جو میں کر رہا ہوں۔ مقصد خالق کا ہے قربانی کی عظیم سے عظیم مثالیں پیش کرنا اگر یہ انتہائے نقطہ قربانی ہوتا تو ہو جانے دیا ہوتا۔ تاکہ قیامت تک کے لئے مثال رہے۔ فدیہ نہ بھیجا جاتا۔ لیکن چونکہ علم الٰہی میں ایک اس سے عظیم تر قربانی آنے والی تھی اور وہ عظیم تر قربانی اسی کی نسل میں آنے والی تھی لہٰذا ضرورت تھی کہ اس وقت عبوری دَورِ دنیا میں ایک مثال قربانی کی عزم و حزم کی حد تک لا کر چھوڑ دی جائے تاکہ پھر وہ نسل آئے جو اس سے زیادہ قربانیوں کی تاریخ مرتب کرے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی زادے کو عافیت پسندی کے لئے نہیں بچایا بلکہ قربانی کو بلند تر قربانی کی خاطر روکا گیا تاکہ وہ بلند تر قربانی آجائے۔ اس وقت اس بیان سے حسین منی وانا من الحسین کے ایک خاص معانی سمجھ میں آتے ہیں۔ حسین مجھ سے ہے وہ تو نسبی طور پر۔ اور میں حسین سے ہوں۔ اگر حسین نہ ہوتے تو اسمٰعیل ذبح ہو گئے ہوتے تو یہ نسل ہی کب ہوتی تو اب میں حسین منی وانا من الحسین کا اردو زبان میں ترجمہ کروں گا۔ کہ حسین مجھ سے ہے یعنی میں نہ ہوتا تو حسین نہ ہوتے اور میں حسین سے ہوں یعنی حسین ہونے والے نہ ہوتے تو میں بھی نہ ہوتا اور بس اہل عزا اب اس سے الگ ایک خلش جو میرے دل کی تھی وہ بھی دُور ہو گئی۔ وہ خلش کیا تھی کہ اقبال نے تو ہمّت کی شکوہ کرنے کی۔ ہر ایک کی ہمّت نہیں ہوتی۔ دل میں شکوے آتے ہیں زبان سے کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ تو میرے تو ذہن میں تھا ایک احساس شکوہ کا پیدا ہوتا تھا کہ پروردگار خلیل کے فرزند کا فدیہ بھیج دیا اور حبیب کے فرزند کا فدیہ تو نے نہیں بھیجا۔ اگر آپ محسوس کریں تو آپ کے ذہن میں بھی چاہے آپ اس کا اظہار نہ کریں۔ یہ خلش پیدا ہونی چاہیئے تھی مگر میری گذشتہ تشریح کی بناء پر یہ خلش بھی ذہن سے دُور ہو گئی۔ خلیل کے فرزند کا فدیہ آگیا

اس لئے کہ اس سے بالاتر درجہ قربانی اللہ کے علم میں تھا۔ حسین کا فدیہ نہ آیا اسلئے کہ اس کے بعد اس سے اُونچا درجہ قربانی اب علم الٰہی میں نہ تھا۔ پس اب باب مصائب ہے۔ اربابِ عزا وہ ہے قربانی اسمٰعیل اور یہ ہے قربانی حسین۔ دیکھئے قربانی اسمٰعیل میں کسکا امتحان ہے۔ باپ کا امتحان ہے کہ وہ قربانی کر رہا ہے بیٹے کا امتحان ہے کہ وُہ قربان ہو رہا ہے۔ کربلا میں حسین۔ بوقت واحد خلیل بھی ہیں اور ذبیح بھی ہیں۔ یہ ذبیح ہیں رسول اللہ کی نسبت سے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے یہ دین کی طرف سے قربان ہو رہے ہیں اور یہ خلیل ہیں اپنے علی اکبر اور اپنے علی اصغر کے لحاظ سے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ انہوں نے اٹھارہ اسمٰعیل راہِ خالق میں نذر کر دیئے۔ کوئی کہے کہ کیا یہ سب اسمٰعیل تھے۔ میں کہتا ہوں کہ میں کیا کروں ؟ سیّد الساجدین کی معصوم زبان پر عجیب جملہ ہے۔ جب منہال نے پوچھا ہے کہ مولا کب تک گریہ کیجئے گا تو سیّد سجاد نے فرمایا کہ یعقوب کے بارہ فرزند تھے ایک فرزند نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا تو اتنا روئے کہ آنکھوں کی بصارت ختم ہو گئی اور میرے سامنے۔ بس یہ جملہ ہے جو عرض کرنا ہے پوری روایت اس وقت عرض نہیں کرنی ہے۔ فرماتے ہیں میرے سامنے تو اٹھارہ جوانان ہاشمی و عقیلی و جعفری جنکا مثل و نظیر روئے زمین پر نہ تھا۔ وُہ سب قربان ہو گئے تو میں گریہ نہ کروں۔ تو اب آپ نے دیکھا کہ وہ اٹھارہ کیسے تھے۔ ایک اور پہلو کی طرف آپکی توجہ دلاؤں۔ وہاں دکھلا چکا ہوں سعی کی منزل میں کہ جب بچہ فلما بلغ معه السعی۔ جب وہ سعی کی منزل میں پہنچا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں دو نوں پہلو ہیں۔ کمسنی کا پہلو بھی کہ ابھی وہ جوانی تک نہ پہنچا۔ ایک عمر کے بڑھنے کا بھی پہلو کہ ایسا چھوٹا نہ تھا۔ ایسا تھا کہ چل پھر سکے باپ کا مددگار ہو سکے۔ یہ دو پہلو تھے۔ اسمٰعیل میں جسے قرآن نے ایک لفظ میں جمع کیا تھا۔ میں دو جملوں میں مصیبت کے

دو دفتر کھولے دیتا ہوں۔ کہ وہ جو ذرا عمر کے بڑھنے کا پہلو تھا وہ ترقی کر کے علی اکبر تک پہنچا اور وہ جو کمسنی کا ہے وہ ترقی کر کے علی اصغر تک پہنچا ما شاء اللہ لجر کم علی اللہ۔ وہ ذرا باپ کے مددگار ہو سکتے تھے کہ چل پھر سکتے تھے اور وہ بیٹا اگر قربان ہو جو باپ کا دست و بازو بن چکا ہو۔ مکمل جوان ہو۔ مشہور روایت کے مطابق اٹھارہ۱۸ برس اور بہت سے علماء کے نزدیک پچیس۲۵ برس اور عباس کی عمر بتیس۳۲ برس یعنی دونوں برابر کے جوان تقریباً۔ میں نے کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا عراق کے منبروں پر سُنا ہے انہوں نے کہیں دیکھا ہوگا کہ یہ عباس و علی اکبر دونوں جوان اور نوجوان کیسے تھے کہ جب مدینہ کے بازار میں نکلتے تھے تو جب تک سامنے رہتے تھے خرید و فروخت موقوف رہتی تھی۔ کاروبار سب بند ہو جاتا تھا لوگ دونوں جوانوں کو دیکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ چچا بھتیجے ایسے برابر کے جوان۔ اب حسین کے دل کی خبر لیجئے کہ عباس جا چکے اور علی اکبر سامنے کھڑے ہیں۔ ماشاء اللہ اجرکم علی اللہ۔ آپ مُتاثر ہو گئے۔ عموماً عشرہ محرم کے بعد وہ اثر نہیں رہتا جو عشرہ محرم کی مجلسوں میں رہتا ہے مگر بحمد اللہ آپ ہر مجلس میں یہ ثبوت دیتے ہیں کہ آپ کے لئے وقت کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ ہر وقت آپ ویسا ہی اثر لے سکتے ہیں۔ ایک پہلو عرض کروں کہ خود کسی مصیبت کا ضبط کرنا اور اٹھا لینا آسان ہوتا ہے لیکن کسی تڑپتی ہوئی ماں کا دیکھنا کسی بلکتی ہوئی بچّی کو دیکھنا کسی روتی ہوئی بہن کو دیکھنا یہ وہ ہے کہ جب صبر و ضبط کا بند لوٹ جاتا ہے ہم نے ایسے متحمل دیکھے ہیں کہ جنازہ لے گئے ہیں قبرستان میں۔ نہیں روئے۔ دفن کر کے آئے نہیں روئے مگر جب گھر پر آ کر کسی بچّی کو تڑپتا ہوا دیکھا۔ کسی ماں کو روتا دیکھ لیا تو اب گریہ طاری ہو گیا اب ذرا غور کیجئے کہ جناب ابراہیم بڑے صاحب عزم مگر جب جانے لگے تو ماں کو نہیں بتایا

کہ کہاں سلئے جا رہا ہوں۔ جناب ہاجرہ نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں تو بالکل صحیح کہا
کہ ایک دوست کے بلانے پر جا رہا ہوں۔ خلیل اللہ تھے ان کو یہ کہنے کا حق تھا کہ
دوست کی فرمائش پر جا رہا ہوں اس کے بعد چھری اور رسّی مانگی تو اب پریشان
ہوئیں جناب ہاجرہ۔ کہا یہ چھری اور رسّی کیا کیجئے گا کہا کہ دوست کے ہاں جا رہا
ہوں ممکن ہے قربانی کی ضرورت پڑے۔ پھر ہاجرہ خاموش ہوگئیں۔ اس کے بعد
وہاں گئے فدیہ آگیا۔ واپس آئے تو خیال کیا کہ اب بیان کر کے کیا کروں اب تو
روز قربانی اسمٰعیل عید بن چکا اب ذکر کر کے کیا کروں۔ چند دن کے بعد جناب
ہاجرہ نے تبدیلی لباس کے لئے جو پیرہن جسم اسمٰعیل سے جدا کیا تو گلے پر ایک خط
نظر آیا پوچھا یا خلیل اللہ یہ خط کیسا ہے اب جناب ابراہیم نے خیال کیا کہ اب تو
کئی دن گزر گئے۔ پورا واقعہ بیان کر دیا۔ صاحب عقل بی بی تھی متوکل علی اللہ بی بی
تھی کہا تو کچھ نہیں مگر نفسیاتی اثر یہ پڑا کہ اسی دن بیمار ہوگئیں اور اسی بیماری میں دُنیا
سے رخصت ہوگئیں یہ تصور کہ اگر فدیہ نہ آتا تو میرا بچہ ذبح ہوگیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں
کہ خبر لیجئے لیلیٰ کی دل کی۔ کیا جب علی اکبر چلے تو لیلیٰ کو نہیں بتایا کہ کہاں جا رہے ہیں
خدا کی قسم جانتی تھیں کہ جہاں سب گئے ہیں اور واپس نہیں آئے وہیں علی اکبر بھی جا
رہے ہیں مگر یہ کارنامہ ہے ان کا۔ ہو لئے زمانہ کے خلاف باتیں ہیں۔ دنیا کردار
کے ان پہلوؤں پر غور نہیں کرتی کہ علی اکبر سا بیٹا چلا جائے جس کے لئے مولا اپنی جگہ
کھڑے نہ رہ سکیں مگر لیلیٰ نے قدم خیمے سے باہر نہیں نکالا۔ بس چند جملے اور
ہاں خیمے کے اندر بھی بیٹھا نہیں گیا۔ در خیمہ پر کھڑی رہیں۔ پس پردہ اس طرح کہ
جیسے مولا پر بھی راز ہے۔ وہ علم نبوت و امامت الگ چیز ہے۔ اسباب ظاہر
سے مولا کو بھی خبر نہ تھی کہ لیلیٰ کھڑی ہوتی ہیں۔ صورت واقعہ سے ظاہر ہے کہ
لیلیٰ پس پردہ کھڑی ہیں امام کی نگاہ سے بھی اوجھل ہیں اور اتنا ہی کارنامہ بہت ہے

مگر ادھر نہیں دیکھتیں جدھر علی اکبر گئے ہیں کیونکہ اُدھر نامحرموں کی فوج ہے مولا کے چہرہ پر نظر ہے کہ امام سہی مگر باپ کا دل ہے میرے بیٹے کو کوئی گزند پہنچے گا تو امام کا چہرہ ضرور متغیّر ہوگا۔ ہاں اربابِ عزا ایک دفعہ امام کا چہرہ متغیّر ہوا اور لیلیٰ نے تڑپ کر پوچھا۔ کیوں مولا میرے بچّے کی تو خیر ہے امام نے فرمایا ہاں تمہارا بچّہ ابھی صحیح و سالم ہے مگر ایک بڑا نامی پہلوان مقابلہ پر آگیا ہے وہ سیر و سیراب ہے میرا بچّہ تین دن کا بھوکا پیاسا ہے مجھے اس کے مقابلہ میں علی اکبر کے لئے خطرہ ہے۔ میں مصائب میں بھی بے سمجھے آگے نہیں بڑھتا۔ میں کہتا ہوں جس کو مرنے کے لئے بھیجا ہے اس کے لئے خطرہ کیسا مگر یاد رکھئے کہ آلِ محمد مظلوم ہونا پسند کرتے ہیں مغلوب ہونا پسند نہیں کرتے ایک کو مل کر ہزار ماریں وہ اور بات ہے مگر علی کا پوتا کسی ایک کے ہاتھ سے دست بدست مقابلہ میں قتل ہو جائے یہ مولا کو پسند نہیں ہے فرماتے ہیں لیلیٰ یہاں کیا کھڑی ہو میں نے نانا سے سُنا ہے کہ ماں کی دعا بیٹے کے حق میں قبول ہوتی ہے جاؤ اپنے فرزند کی فتح کے لئے دعا کرو۔ حکمِ امام سے لیلیٰ خیمے کے اندر گئیں مگر یہ سوچتی ہوئی کہ اگر فقط دُعا ہی کرانا ہوتی تو خود دُعا کر دیتے یہ مجھ سے کیوں کہا۔ محسوس کیا کہ میرا دروازے کے خیمے پر کھڑا ہونا بھی امام کو پسند نہیں آیا اس لئے احترام حکمِ امام میں جا کے دعا تو کر لی پکار کر کہا اے زینب اے امّ کلثوم اے رباب، اے سکینہ آؤ میں اپنے فرزند کی فتح کے لئے دُعا کروں گی۔ لیجئے ہاتھ اٹھا دیئے پروردگار میرے فرزند کو اس دشمن کے مقابلے میں فتح دے ابھی دعا ناتمام تھی کہ علی اکبر نے اپنے دُشمن کو تہہ تیغ کیا مگر اربابِ عزا اب دعا کر کے پھر خیمے کے دروازہ پر نہیں آئیں۔ علی اکبر کی لاش آگئی مگر لیلیٰ نے قدم خیمے سے باہر نہیں نکالا۔

مجلس ششم

اطاعت و اتباع سبب بقا سبب وجود

انا من الحسین اور فاطمۃ بضعۃ منی کی توضیح

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ الخ

پیغمبر خدا سے ارشاد ہو رہا ہے کہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ کل میں نے عرض کیا کہ پیغمبر خدا کی اطاعت کا بھی حکم ہے اور اتباع کا بھی حکم ہے اور یہ عرض کیا کہ اطاعت ہوتی ہے اقوال کی اور اتباع ہوتا ہے افعال کا۔ اب سوال یہ ہے کہ اطاعت اور اتباع کا حکم کیا بس پیغمبر خدا کے زمانے کے مسلمانوں کے لئے تھا انہی پر اطاعت کا فریضہ تھا اور انہی پر اتباع کا فریضہ عائد تھا یہ تو اس وقت ہوتا جب پیغمبر خدا کی رسالت اسی دورِ حیات سے متعلق ہوتی تو بے شک اطاعت کا حکم بھی اسی وقت کے لوگوں کے لئے ہوتا اور اتباع کا حکم بھی اسی دور کے لوگوں کے لئے ہوتا پھر ہم اور آپ بالکل آزاد تھے نہ ہمارے لئے اطاعت نہ اتباع اور پھر جتنے احکام شریعت ہیں ان سب سے آزادی اس لئے کہ تمام احکام شرع یا اطاعت کے ماتحت ہیں یا اتباع کے ماتحت ہیں۔ جب اطاعت و اتباع اسی دور کے لوگوں کے لئے ہے تو پھر ہمارے واسطے نہ کوئی واجب نہ کوئی حرام تمام احکام ہم سے

برطرف۔ لیکن یہ تو ہر مسلمان بلا تفریق فرقہ اس کے نزدیک یہ تصوّر غلط ہے آپ کی رسالت اس دورِ حیات ہی سے متعلق نہ تھی اور جب اسی دَورِ حیات سے متعلق نہ تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حکم اطاعت بھی تا قیامت ہے اور حکم اتباع بھی تا قیامت ہے اور کل تفصیل سے بیان ہوا اور اسکا حوالہ مَیں نے دیا کہ اطاعت ہوتی ہے اقوال کی اور اتباع ہوتا ہے افعال کا لہٰذا اقوال رسول کو بھی تا قیامت محفوظ رہنا چاہیئے اور افعال رسول کو بھی تا قیامت محفوظ رہنا چاہیئے کیونکہ اگر اقوال محفوظ نہ رہے تو اطاعت نہیں ہوسکتی اور اگر افعال محفوظ نہیں رہے تو اتباع نہیں ہوسکتا اب اقوال کیونکر محفوظ رہیں۔ وہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اقوال کی حفاظت کرتی ہیں کتابیں اور جب میں کہتا ہوں کتابیں، تو سرفہرست ہے کتاب اللہ ۔ کوئی کہے کہ بات تو اقوال رسولؐ کی تھی یہ سرفہرست کتاب اللہ کیونکر ہوگئی میں کہوں گا کہ میں نے بھولے سے نہیں کہا ہے سمجھ بوجھ کر کہا ہے میرا بھی ایمان ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے مگر جسے ہم اور آپ اور ہر مسلمان کتاب اللہ کہتا ہے سمجھتا ہے اور مانتا ہے اسکو لوح محفوظ سے اُترتے ہم نے نہیں دیکھا۔ ہم نے تو قرآن کو بھی اسی زبان سے سُنا جس زبان سے حدیثوں کو سُنا ۔ ارے ہم نے تو کچھ بھی نہیں سُنا۔ جس جس نے سُنا قرآن کو بھی اسی زبان سے سُنا جس زبان سے حدیثوں کو سُنا۔ خدا کی قسم یہ تو انکی زبان کا اعتبار ہے جسے اللہ کا کلام کہہ دیا اُسے قرآن مان لیا جسکو اپنا کلام کہا اُسکو حدیث سمجھ لیا۔ صَلوٰۃ

ورنہ ہم کیا جانتے کہ کون کلام اللہ اور کون ان کا اپنا کلام ۔ اب یہ سیرت سے متعلق بات ہے میں کہتا ہوں بخدا یہ بھی امانت داری تھی انکی کہ زبان پر انکی کلام آرہا تھا اور کہہ رہے تھے میرا نہیں۔ جس زبان پر قرآن آیا اسی زبان پر حدیثیں آئیں جسے انہوں نے کلام اللہ کے طور پر پیش کیا یہ کہہ کر کہ یہ کلام اللہ ہے

اُسے ہم نے قرآن مانا جسے اپنا کلام کہہ کر پیش کیا اُسے حدیث مانا۔ اسی لئے یہ ایک جملہ ہے اسے چاہیے حفظ کر لیجئے اور بوقت فرصت اس پر غور کیجئے گا کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جب تک انکی زبان پر اعتبار نہ ہو قرآن پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا تو قرآن مجید ہو یا کتب حدیث یہ سب مجموعہ ہیں ان اقوال کا جو حضرت کی زبان مبارک پر آئے۔ جو اقوال بحیثیت کلام اللہ آئے ان کا مجموعہ قرآن مجید جو بحیثیت اپنے کلام کے آئے ان کا مجموعہ کتب احادیث ہیں۔ تو یہ کتب تو اقوال کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ افعال رسول کیونکر محفوظ رہیں روا روی میں کوئی شخص جواب دے گا کہ افعالِ رسول بھی راوی بیان کریں اور وہ کتابوں میں درج ہو جائیں اس طرح افعال رسول بھی محفوظ ہو جائیں گے مگر ذراسی باریک بات ہے اربابِ فہم مجمع میں ہیں انشاءاللہ کسی کو کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ فعل رسول راوی کی زبان پر آیا تو قول ہو گیا فعل نہیں رہا۔ فعل تو اسی وقت تک فعل ہے جب تک فاعل سے ہے اور جب اسکا بیان کسی سے ہوا تو وہ قول ہوا فعل نہیں رہا یوں تو کسی اور راوی کا کیا ذکر قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کے اقوال بھی موجود ہیں حضرت نوح حضرت عیسےٰ حضرت موسیٰ سب کے اقوال بھی ہیں افعال بھی ہیں۔ قرآن مجید نے بیان کئے ہیں۔ تو کیا ان سب انبیاء کے افعال ہم تک پہنچے۔ افعال نہیں پہنچے ہیں ان کا بیان ہے جو بذریعہ قرآن مجید ہم تک پہنچا ہے اسی طرح اگر حضرتؐ کے افعال کو راویوں نے بیان کیا تو یہ ان کا بیان ہے جو ہم تک پہنچا افعال رسول کہاں پہنچے ہیں۔ یاد رکھئے کہ کتاب فعل کو کبھی نہیں دکھاتی۔ فعل کو آئینہ دکھایا کرتا ہے۔ میرا ہاتھ جنبش کریگا آئینے میں نظر آئے گا۔ بے شک آپ فعل کو دیکھ رہے ہیں۔ میرا ہاتھ ساکن ہوگا آئینے میں نظر آئے گا۔ بے شک آپ فعل کو دیکھ رہے ہیں لیکن ان دُنیا والے

آیئنوں میں ایک بڑی خرابی ہے اور وہ خرابی یہ ہے کہ اسمیں عکس اسی وقت تک نظر آتا ہے جب تک اصل سامنے رہے ادھر اصل نظر سے اوجھل ہوئی اور عکس بھی غائب ہوا۔ ہمیں ایسے آیئنے نہیں چاہیئں ہیں ہمیں ایسے آیئنے چاہیئں کہ پیغمبر تشریف لے جائیں اور افعال پیغمبر ہمیں نظر آتے رہیں صلوٰۃ۔

ایک اور نقص اس آیئنہ میں ہے کہ یہ آیئنہ اسی عمل کو دکھائے گا جو وقوع میں آگیا میں نے عرض کیا کہ میں نے حرکت کی ہاتھ سے اور وہ آیئنہ میں نظر آگئی۔ ہاتھ کو ساکن کیا وہ سکون آیئنے میں نظر آگیا۔ جو کام وقوع میں آجائے وہ نظر آئے گا مگر افعالِ رسول بمقتضائے اسباب ہوتے تھے جیسا سبب جس وقت ہوا ویسا عمل وقوع میں آیا جب تک وہ سبب پیدا نہ ہوگا اس وقت تک رسول کا وہ عمل نہ ہوگا ورنہ خلافِ عقل ہوگا خلاف حکمت ہوگا۔ مثال کے طور پر کوئی مسلمان پیغمبرِ خدا کے ساتھ ابتدائے بعثت سے ہجرت تک جو تیرہ برس کی مدّت ہے یعنی دَورِ رسالت کا آدھے سے زیادہ حصّہ۔ کیونکہ ۲۳ میں سے ۱۳ آدھے سے زیادہ حصّہ ہیں۔ ۱۰ آدھے سے کم ہے۔ تو تیرہ برس پیغمبر خدا کے ساتھ رہتا اور کسی وقت جُدا نہ ہوتا۔ ایسا خاص صحابی ہوتا کہ کسی وقت جُدا نہ ہوتا اور وُہ قسمیں کھا کر کہہ سکتا کہ میں ہر وقت رسول کے ساتھ رہا۔ تیرہ برس مسلسل کسی وقت میں نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا آپ کی سیرت حیات میں تلوار اُٹھانا نہیں ہے۔ اسکا یہ بیان بالکل صحیح ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں سیرۃ رسول کے دائرہ میں تلوار اُٹھانا نہیں ہے۔ اب اس میں سے کوئی نتیجہ نکالے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسول مطلق عدم تشدّد کے قائل ہیں جیسا کہ دُنیا کے بعض رہنماؤں کا اصول ہے، لیکن اب جب ہجرت کر کے آپ مدینہ تشریف لائے تو اب اس کے بعد ایک سال اسی میں شامل کیجئے اب ہو گئے چودہ برس۔ سنہ ۲ھ میں

دیکھئے بدر دیکھئے اُحد دیکھئے خندق دیکھئے خیبر دیکھئے۔ تو تلوار نظر آئے گی۔ ان کے ہاتھ میں ظاہر میں نہ سہی مگر کسی ایسے ہاتھ میں جو انہی کا ہاتھ ہے بہر حال اب تلوار ہے۔ تو معلوم ہوا سیرت رسول کا ایک گوشہ تھا جو چودہ برس تک پردے میں رہا اور جب وہ اسباب ہوئے تب وہ سیرت کا گوشہ سامنے آیا۔ یہ مسلمان جو سیرت نبوی مرتب کر رہا تھا اس نے اب ایک سطر کا اضافہ کیا کہ ہاں ان کی سیرت میں تلوار اُٹھانا بھی ہوتا ہے۔ اب اسی مسلمان سے پوچھئے کہ جن سے جنگ ہو رہی ہے کیا پیغمبر خدا ان سے کبھی صلح بھی فرمائیں گے یاد رکھئے جتنا اُسے بظاہر جوش ایمانی زیادہ ہوگا اور جتنا ایمان کی شدت کا زعم زیادہ ہوگا اتنی شدّت سے وہ انکار کرے گا توبہ توبہ بھلا رسول اور مشرکین سے صلح فرمائیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ارے وقوع میں آجانے کے بعد جب بہت سے مسلمانوں کے حلق سے یہ چیز نہ اترتی ہو تو پہلے کیونکر تصوّر میں آسکتا تھا کہ یہ صلح بھی فرمائیں گے مشرکین کے ساتھ۔ لیکن اب آتے دیکھئے ۶ھ اور حدیبیہ کی منزل اور دیکھئے کہ پیغمبر خدا صلح کر کے واپس تشریف لے جاتے ہیں مکّہ سے یا نہیں۔ اب اس نے کہا کہ ہاں صاحب بے شک سیرۃ نبوی میں صلح کرنا بھی ہے اب حساب لگائیے کہ تیرہ برس وہ قبل ہجرت اور ۶ھ میں یہ واقعہ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بعد بعثت ۱۹ برس تک سیرۃ کا یہ گوشہ پردہ میں رہا اور سامنے نہیں آیا کیونکہ وہ اسباب نہیں ہوئے تھے جن اسباب سے اس سیرۃ کے عمل کا تعلّق تھا۔ اب اسی مسلمان سے یہ پُوچھئے یا اور مسلمانوں سے جو اس کے ساتھ ہوں کہ خیر صلح ہو گئی اب اگر یہ لوگ عہد شکنی کریں اور شرائط صلح کی خلاف ورزی کریں اور پھر رسول فاتحانہ طور پر مکّے میں داخل ہوں تو ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے اب پھر وہی بات کہ جتنا اپنے ایمان کا دعویٰ زیادہ ہوگا اتنی شدّت کے ساتھ سزا

تجویز کرے گا اب جتنی لفظیں آپ کے نزدیک لغت میں زیادہ سخت ہوں اڑے پرخچے اُڑا دیں گے پرزے پرزے کر ڈالیں گے ان کم بختوں کے۔ یہی سب وہ کہتا اور اُسے تقاضائے ایمان سمجھتا لیکن اب آنے دیجئے ۸ھ میں فتح مکہ اور دیکھئے کہ رسول کے سامنے وہی جماعت ہے اور پیغمبر خدا ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار فرماتے ہیں۔ تو سیرۃ کا نیا باب سامنے آیا یا نہیں۔ اب اسی مسلمان سے پوچھئے کہ پیغمبر خدا اپنے مخالفین سے علاوہ تلوار کے کسی اور طریقے سے بھی جنگ کرتے ہیں تو وہ کہے گا کہ یہ تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ جنگ ہو اور تلوار کے بغیر ہو لیکن آنے دیجئے ۹ھ میں مباہلے کا میدان کہ جنگ بھی ہو رہی ہے اور تلوار کہیں نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ سیرۃ کا ایک باب آج سامنے آیا ۹ھ اور ۹ھ کے بعد ۱۰ھ۔ اس مسلمان سے پوچھئے کہ اگر پیغمبر خدا کو کوئی مجمع ایسا ملے کہ اتنا بڑا مجمع نہ اس سے پہلے رسول کے سامنے ہوا ہو نہ اس کے بعد کبھی ہوگا۔ اتنا بڑا مجمع ہو، ایک لاکھ کے قریب مسلمان رسول کے سامنے ہوں تو اس موقع پر پیغمبر کیا فرمائیں گے۔ یہ کہے گا کہ وہی فرمائیں گے جو عمر بھر فرماتے رہے نماز پڑھو۔ روزے رکھو حج کرو زکوٰۃ دو جو ہمیشہ کہتے رہے وہی وہاں بھی کہیں گے مگر اب آنے دیجئے ۱۰ھ میں وہ بھی آخری مہینہ ذی الحج کا مہینہ اور اسکی اٹھارہ تاریخ اسمیں رسول کی سیرۃ کے کتنے گوشے ہیں۔ ہمیشہ دیکھتے تھے وہ منبر آج نیا منبر دیکھا۔ ہمیشہ دیکھتے تھے مسجد میں اور آج کھلا میدان دیکھا۔ اس کے بعد رسولؐ منبر پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد ایک نئی بات دیکھی کہ ہمیشہ منبر پر اکیلے جاتے تھے آج کسی کو منبر پر اپنے پاس بٹھا لیا اور اب نفسیاتی طریقہ پر دیکھئے کہ یہ نئی بات جو ہو رہی ہے تو اب مجمع جو ہے وہ خطبے کے الفاظ کم سُن رہا ہے اور یہ صورت زیادہ دیکھ رہا ہے یہاں چند جملے ہیں۔ یہ یہاں کیسے

ذہنوں میں تصورات تہہ و بالا ہیں کہ کوئی خاص بات ہے یعنی پورا جملہ ہوا میں جا رہا ہے آخری جملہ کا انتظار ابھی سے ہے تو جناب یہ سب باتیں آج نئی نظر آ رہی ہیں اس کے بعد پورا خطبہ ہو جاتا ہے جو لوگوں نے غور سے نہیں سنا ہے اسی لئے تمام مسلمانوں کی تاریخیں دیکھ لیجئے تو وہ پورا خطبہ کہیں ملتا بھی نہیں۔ سنا کس نے تھا غور سے۔ اب وہ وقت آیا جس کے لئے پاس بٹھایا تھا تب پیغمبر نے وہ تاریخی الفاظ فرمائے۔ مَنْ کنت مولاہ فہذا علی مولاہ جسکا میں مولا ہوں اسکا یہ علی بھی مولا ہے۔ ماشاء اللہ صاحبانِ فہم بھی ہیں تو جناب والا فہذا علی مولاہ عربی میں تعیین کے لئے اُن میں سے ہر لفظ کافی ہے اشارہ کر دیا تو تعیین فردِ واحد کی ہو گئی اور نام لے دیا تو تعیین شخص واحد کی ہو گئی رسول نے دونوں طریقے صرف کر دیئے فہذا بھی علیؑ بھی معنی یہ ہیں کہ اگر حاضر ہوں تو یہ دیکھو اور غائب ہوں تو نام سنو صلوٰۃ

پیغمبر کی سیرۃ کا نیا باب سامنے آیا یا نہیں۔ اس کے بعد مدینہ منورہ واپس ہوتے تو علیل ہو گئے دو مہینے کے بعد وفات ہو گئی تو اب پیغمبر خدا کی وفات طیبہ کا جو سال آیا وہ سیرۃ کا ایک نیا باب کھولتا ہوا آیا۔ اور اب جو کتاب سیرۃ اپنے عمل سے مرتب کر رہا تھا اسمیں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ شخصیت وفات کے ذریعہ سے ہمارے سامنے سے ہٹ گئی چلی گئی۔ اور رسالت ہے تا قیامت تاریخ کے طالب علم بھی یہاں ہوں گے۔ تاریخ کا مسلّمہ اصول ہے کہ تاریخ رواں دواں ہے وہ ایک نقطہ پر نہیں پڑتی۔ گوناگوں حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں تو حضور والا کیا تاریخ کا یہ اصول یہاں ٹوٹ گیا یعنی اب ۱۱ھ سے لے کر قیامت تک تاریخ کی سوئی ایک نقطہ پر منجمد ہو گئی کہ ابھی تک تو ہر سال نئے نئے حالات پیدا ہو رہے تھے اور اب کوئی نئی صورت حال پیدا نہیں ہو گی یہ خلاف عقل بات ہے یقیناً زندگی کے کتنے دور ایسے ہونگے کہ پیغمبر خدا کے اس دور

حیات میں پیش نہیں آئے تو اس دورِ حیات میں پیغمبر کا عمل کیا ہوتا وہ پردہ میں رہ گیا لہٰذا اب ہمیں وُہ آیئنے نہیں چاہیئں جو وقوع میں آئے ہوئے افعالِ رسول کو دکھائیں ہمیں وہ آیئنے چاہیئں جو ملکاتِ نفس پیغمبر کو جذب کر لیں ماشاءاللہ لاہور کی سرزمین ہے اور یہاں علمی ذوق بلند پایہ ہے مگر پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے لئے یہ لفظیں قابل فہم نہیں ہیں۔ ایک بات توجہ سے سُن لیجئے۔ جو ہر وقت ہوتا ہے وہ فعل ہے اور وہ طاقت جو فعل کو کراتی ہے اُسے مَلکہ کہتے ہیں۔ یعنی پردہ شب میں جو کچھ پاس تھا وہ سائل کو دے دیا یہ فعل سخاوت ہے اور خود سخاوت وہ ملکہ ہے جس نے نفس سے اس فعل کو کرایا۔ بروقت فعل وہ کام ہے جو منتظر سبب رہتا ہے اور ملکہ نفس کی وہ طاقت ہے جو قائم ہوتی ہے راسخ ہوتی ہے اور بر وقت اس عمل کو کراتی ہے تو اب یہ جملہ غالباً سمجھ میں آگیا ہوگا۔ ہمیں وہ آیئنے نہیں چاہیئں جو افعال رسول کو دکھائیں بلکہ ہمیں وہ آیئنے چاہیئے ہیں جو ملکاتِ نفس رسول کو جذب کر لیں۔ اُردو زبان میں اسکو میں کہہ سکتا ہوں۔ ہمیں وہ آیئنے نہیں چاہیئں جو یہ دکھائیں کہ رسول نے کیا کیا کیا۔ ہمیں وہ آیئنے چاہیئں جو یہ دکھائیں کہ رسول ہوتے تو کیا کرتے، وہ آیئنے ہمارے لئے مفید نہیں ہیں جو یہ دکھائیں کہ رسول نے کیا کیا کِیا۔ ہمیں وہ آیئنے درکار ہیں جو یہ دکھائیں کہ پیغمبر ہوتے تو کیا کرتے۔ اس کے لئے خالق نے اپنے رسول کو آیئنے عطا فرمائے۔ اگر یہ آیئنے دُور دُور سے ہوتے تو کسی وقت کا عکس لیتے اور کسی وقت کا عکس نہ لیتے لہٰذا حکمت الٰہی اسکی متقاضی ہوئی کہ یہ آیئنے رسول کی گود میں رکھ دیئے جائیں تاکہ ملکات نفس پیغمبر کو جذب کر لیں۔ کیا کہنا ان آیئنوں کا۔ جوہر رکھے ہوئے اللہ کے۔ جلا دی ہوئی تربیت رسول کی۔ گویا پیغمبر کا کاشانہ آیئنہ خانہ بنا ہوا تھا۔ بیچ میں پیغمبر چار طرف چار آیئنے جڑے ہیں

جتنی پڑھوں گا وہ متفق علیہ ہونگی۔ ایک آئینہ قدآدم تقریباً برابر کا۔ پیغمبر نے اپنا عکس دیکھا بالکل مکمّل نظر آیا۔ علی منی و انا منہ۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں یہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ اسے سمجھنا ہو تو مجھے دیکھو اور مجھے سمجھنا ہو تو اسے دیکھو۔ علیؑ منی و انا منہ۔ خالق نے فرمایا انفسنا۔ یہ تو ہمارا نفس ہے اور ابھی میں فعل اور ملکہ کا فرق بتا چکا یاد رکھئے کہ افعال کا مرکز اعضا ہوتے ہیں اور ملکہ کا مرکز نفس ہوتا ہے جہاں تک الفاظ کی منزل ہے۔ فعل جدا فاعل جدا۔ اٹھانا ہاتھ کا کام پیروں سے اسکا کوئی تعلّق نہیں۔ کہنا زبان کا کام ہے ہاتھوں سے اس کا کوئی تعلّق نہیں ہے۔ چلنا پیروں کا کام ہے کانوں سے اسکا کوئی تعلّق نہیں سُننا کانوں کا کام ہے زبان سے اسکا کوئی تعلّق نہیں۔ افعال کی منزل میں فعل الگ فاعل الگ مگر نفس کی منزل میں سب افعال ایک۔ دیکھا آنکھوں نے آپ نے کہا میں نے دیکھا اٹھایا ہاتھوں نے آپ نے کہا میں نے اُٹھایا راستہ طے کیا پیروں نے آپ نے کہا میں نے راستہ طے کیا سُنا کانوں نے آپ نے کہا میں نے سُنا۔ سب افعال ایک کے ہو گئے جب تک لسان اللہ کہا زبان کی گفتار اپنی ہوئی۔ جب تک اذن اللہ کہا سماعت اپنی ہوئی جب تک جنب اللہ کہا پناہ دینا اپنا ہوا لیکن جب نفس کہہ دیا تو افعال ان کے نہیں رہے خدا کے ہو گئے۔ دوسرا آئینہ نسبتاً چھوٹا مگر اپنے شعبہ میں مکمّل۔ پیغمبر نے سند عطا فرمائی۔ مسلّم الثبوت۔ صحیح بخاری میں ہے۔ بنظر اختصار۔ فاطمہ کے فضائل میں صرف تین عدد حدیثیں۔ اسمیں سے ایک یہ ہے کہ فاطمہ بضعۃ منی۔ فاطمہ میرا ایک ٹکڑا ہے میرا ایک جزء ہے حضور والا جزء کون ہوتا ہے جزء وہ ہوتا ہے جسے نکال لیجئے تو چیز نامکمّل ہو جائے مِلا دیجئے تو اسکی تکمیل ہو جائے۔ یہ سندِ خاص فاطمہ کے لئے ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب کے لئے بھی نہیں ہے حسن وحسین کے لئے بھی نہیں ہے صرف حضرت فاطمہ

زہرا کے لئے یہ لفظیں ہیں بضعۃ منی میرا ایک جز۔ میں کہتا ہوں میرے گذشتہ بیان کی روشنی میں اس جز کی حقیقت پر غور کیجیے کہ کیا رسالت پیغمبر صرف مردوں کے لئے ہے۔ وہ تو تمام نوع بشر کے لئے ہے اسمیں مرد بھی ہیں عورتیں بھی ہیں اور میں نے کہا کہ فریضہ رسالت دو چیزوں سے ادا ہوتا ہے اقوال سے اور افعال سے۔ اقوال کے لئے اطاعت واجب افعال کے لئے اتباع واجب۔ اقوال رسول تو سب کے لئے ہو سکتے ہیں مرد اور عورت دونوں کے لئے۔ افعالِ رسول دونوں کے لئے نہیں ہو سکتے چاہے موجودہ ترقی پسند زمانہ کتنا ہی کہے کہ ہر میدان میں مرد عورت دوش بدوش مگر میں کیا کروں اسلام میں تو نماز تک میں دوش بدوش نہیں۔ حالانکہ نماز کوئی معاشرتی چیز نہیں وہ تو مابین خدا و خود اک عبادت ہے۔ مگر اسمیں بھی مرد کی نماز اور طرح اور عورت کی نماز اور طرح ہمارے ہاں دینیات کی کتاب مولوی فرمان علی صاحب مرحوم کی ایک وقت میں رائج تھی۔ بچوں کو پڑھائی جاتی تھی مردوں کے لئے کچھ نمازیں جہری کچھ اخفات کے ساتھ لیکن عورت کے لئے جو نمازیں جہری بھی ہیں وہ بھی اخفات کے ساتھ یعنی آہستہ اب ماشاءاللہ آپ صاحبان فہم و نظر ہیں ذرا غور کیجئے کہ نماز میں بڑی ضرورت ہے رجوع قلب کی اور رجوع قلب کا انتہائی درجہ ہے محویت۔ اسکا معیار اور کمال آپ نے سنا ہوگا کہ تیر کھینچ لیا جاتا ہے اور پتہ نہیں ہوتا۔ یہ محویت کا عالم یہ استغراق کا عالم۔ اور یہ روح ہے نماز کی مگر اب میں اہلِ فہم سے اہل عقل سے صاحبان علم و نظر سے سب سے پوچھتا ہوں کہ اگر آدمی میں ایسی محویت ہوئی کہ مرد اپنا مرد ہونا بھول گیا عورت اپنا عورت ہونا بھول گئی تو احکامِ شریعت پر عمل ہی کیونکر ہو سکتا ہے معلوم ہوا کہ نظرِ خالق میں جتنی اہمیت نماز میں استغراق کی ہے اتنی ہی خصوصیت اسکی نگاہ میں ہے اپنی خصوصیت صنفی کے باقی رکھنے کی کہ مرد

یاد رکھے کہ میں مرد ہوں اور عورت یاد رکھے کہ میں عورت ہوں۔ تو پھر کیا مشکل ہے کہ نماز میں یاد رکھے اور زندگی کے سب کاموں میں بھول جائے۔ اس کے بعد لباس نماز میں زمین آسمان کا فرق۔ مرد کے لئے اتنا لباس کہ جس کے بغیر نماز باطل ہوگی۔ بہت مختصر۔ بس اتنا کہ برہنہ نہ ہو اور عورت کے لئے سوا چہرے کے۔ گٹوں سے لے کہ انگلیوں تک اور ہاتھوں کے باقی تمام اجزا پوشیدہ ہوں صحت نماز کیلئے ضروری۔ کتنی ہی ترقی یافتہ خاتون کیوں نہ ہوں لیکن اگر نماز پڑھتی ہیں تو اس وقت یہی لباس اختیار کرنا ہوگا اور اب ایک پہلو کی طرف توجّہ دلاؤں اور صاحبان علم کے لئے بعد میں توضیح ہوگی۔ یہ نامحرم کی وجہ سے نہیں ہے۔ اپنے مکان میں پردہ شب میں گھر کے دروازے بند کر کے سامنے پردے ڈال کے بھی نماز ہو تو اس سے زیادہ کوئی جز جسم کا بے پردہ ہو تو نماز باطل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے خالق کا منشا سمجھئے کہ جو خالق اپنی بارگاہ میں عورت کو بے پردہ دیکھنا نہ چاہتا ہو وہ بھلا اسے پسند کرے گا کہ بولہوس مردوں کے سامنے وہ بے پردہ پھرے۔ ترقی پسند لوگوں نے عورتوں کو یہ درس دیا ہے کہ دیکھو اسلام نے عورتوں کو مصیبت میں ڈالا ہے مردوں کو آزادی دی ہوئی ہے۔ حج پر جا کر دیکھئے کہ مردوں کیلئے مصیبت ہے یا عورتوں کے لئے۔ مرد ذرا سا بھی سایہ سر پر نہیں رکھ سکتے اور وہ اطمینان سے اپنے سر پر چادریں تانے ہوئے مرد ایسا لباس خاص اختیار کریں کہ جس سے مردہ اور زندہ میں بہت کم فرق محسوس ہوتا ہے ہمارے لئے ضرورت ہے کہ ایسا لباس ہو اور عورتوں کے لئے جو عام لباس ان کا ہے۔ یہ وقار خواتین کا تحفّظ ہے جو ان کا عام لباس ہے اسی لباس میں ان کا احرام صحیح ہے۔ ان کے لئے یہ شرط نہیں ہے اور عام احکام میں ان کے لئے کتنی آزادیاں ہیں ہمارے لئے کتنی مصیبت ہے۔ ہم ایک چھلا سونے کا نہیں پہن سکتے وہ بقدر برداشت

پہن سکتی ہیں۔ ہم خاص لباس بھی ریشم کا نہیں پہن سکتے۔ وہ سر سے پیر تک ریشمی لباس پہنیں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ کیا ہے یہ حقیقت میں خالق کی طرف سے صرف احساس باقی رکھنا ہے اور پھر ان کے وقار کا تحفظ ہے ان کی عزت و ناموس کا تحفظ ہے یہ تمام مقاصد ہیں ورنہ اسے ہمکو مصیبت میں ڈالنا نہیں ہے اور نہ انہیں آرام پہنچانا ہے یہ تو جب ہوتا کہ جب ان کا کوئی رشتہ اُن سے زیادہ ہوتا ہم سے کم ہوتا۔ خالق کے نہ تو بیٹا ہے نہ بیٹی ہے خواتین کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کردوں گا کہ جس رسول کی زبان سے یہ احکام پہنچے ہیں اسے اللہ نے بیٹا نہیں عطا کیا ہے بیٹی ہی عطا فرمائی ہے ہم تو ان کے ہر حکم کو حکمِ الٰہی سمجھتے ہیں لیکن جو شخص منکر رسالت ہو وہ بھی ان کے قانون میں یہ تصور نہیں کرسکتا کہ عورتوں کے لئے ناانصافی ہوتی ہوگی اور مردوں کو کچھ ان کے حق سے زیادہ دے دیا ہوگا۔ صلوٰۃ۔

تو اب وہی بات آگئی کہ جب احکام شریعت کے الگ الگ۔ حج کا طریقہ الگ الگ نماز الگ الگ اور جانے کتنی باتوں میں الگ الگ تو رسول کا عمل مردوں کے لئے تو نمونہ بن سکتا ہے عورتوں کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا اس کے معنی یہ ہیں کہ عورتوں پر حجت خدا تمام ہی نہیں ہوتی۔ اور مقصد رسالت ہے حجت تمام کرنا قرآن کہہ رہا ہے رُسلاً مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس حجۃ بعد الرسل پیغمبر اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ خلق خدا کے پاس پیغمبروں کے آجانے کے بعد کوئی عذر نہ ہو۔ اپنی کوتاہی روز قیامت پیش کرنے کے لئے۔ تو اگر فقط رسول کی ذات ہو تو عورتیں بارگاہ خداوندی میں روز قیامت کہہ سکتی ہیں کہ بارالٰہا ہم اگر ایمان و عمل میں ناقص رہے ہیں تو ہمارا قصور تھوڑی ہے۔ ہماری ہدایت ہی پوری نہیں ہوئی اس لئے کہ مردوں کے لئے تو اقوال بھی رہے اور افعال بھی رہے اور ہمارے لئے تو بس اقوال ہی اقوال رہے۔ عمل کا کوئی بے داغ نمونہ ہمارے

سامنے آیا ہی نہیں۔ تو جب حجت تمام نہیں ہوئی تو مقصد رسالت کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ پیغمبر کے خزانہ رسالت میں کوئی گوہر بے بہا ایسا ہو کہ اسکا کردار عورتوں کے لئے ویسا ہی معصوم نمونہ عمل ہو جیسا خود رسول کا کردار مردوں کے لئے نمونہ عمل ہے اس کے لئے خالق نے اپنے رسول کو حضرت فاطمہ جیسی بیٹی کرامت فرمائی۔ اس معنی سے پیغمبر نے فرمایا ہے کہ فاطمہ میرا ایک جز ہے یعنی اگر فاطمہ نہ ہوں تو میرے فرائض کی تکمیل نہیں ہوتی۔ فاطمہ میرے ساتھ مل جائے تو میرے فرائض رسالت مکمّل ہوتے ہیں بغیر اس کے میرے مقصد رسالت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اب معلوم ہوا کہ یہ تھیں فاطمہ جو حضرت پیغمبر خدا تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ بیٹی ہونے کا تقاضا ہی نہیں ہے کہ باپ تعظیم کو کھڑا ہو۔ یہ عمل خود بتاتا ہے کہ فاطمہ صرف بیٹی نہیں ہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں تو یہ فاطمہ کی تعظیم نہیں ہے اس منصب کی تعظیم ہے جو فاطمہ کے سپرد ہے۔ اس سے ایک مشکل میری حل ہو جاتی ہے۔ اپنی کوتاہی معلومات کے اقرار کے ساتھ یہی عرض کر دوں گا کہ میری کوتاہ نظری ہے کہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی وسیع النظر ہو اس کے سامنے کوئی ماخذ ہو۔ جس کے فضائل بے شمار۔ جس کے فضائل کی کوئی انتہا نہیں مگر مجھے حضرت علی ابن ابی طالب کے لئے نہیں ملتا کہ پیغمبر تعظیم کو کھڑے ہوتے ہوں۔ یہ مشکل ہے یا نہیں۔ اب جو حل اسکا میری سمجھ میں آتا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں جو آیا ہے وہ یہ کہ فضائل کا بے شمار ہونا اور بات ہے مگر علی کا جو منصب ہے وہ بعد رسول ہوگا فاطمہ کا جو منصب ہے وہ حیات رسول میں ہے۔ صَلوٰۃ۔

اب جناب دو آیئنے ہو گئے۔ ایک آیئنہ قد آدم۔ دوسرا آیئنہ میں نے کہا کہ اپنے شعبہ میں مکمّل۔ اب دو چھوٹے چھوٹے آیئنے۔ مگر جناب آیئنے میں ایک

خصوصیت ہے ۔ وہ تو اس آیئنے میں بھی ہے جیسے میں بیکار کہہ چکا ہوں ۔ جیسے میں نے کہا کہ مجھے کوئی فائدہ نہیں مگر وہ خصوصیّت اس آیئنہ میں بھی ہے کہ آیئنہ خواہ چھوٹا ہو مگر تصویر پوری دکھاتا ہے بلکہ آیئنہ کے اگر ٹکڑے بھی ہو جائیں تو ہر ٹکڑا آیئنہ ہوگا ۔ ان چھوٹے چھوٹے آیئنوں کے لئے میں کہتا ہوں کہ پیغمبر نے ان میں جُھک کر اپنا نقشہ دیکھا ۔ تصویر مکمّل نظر آئی ۔ سند عطا فرما دی ایک ۔ دونوں کو مشترک اُبنَایَ ھذان اماما ن قاما او قعدا ۔ میرے یہ دونوں بیٹے امام ہیں چاہے کھڑے ہوں چاہے بیٹھے ہوں ۔ یہ امام کہنے پر قرآن مجید کے ماننے والوں کو تو تعجب نہیں ہونا چاہیئے ۔ قرآن نے بتایا کہ گہوارہ کا بچّہ کہہ رہا ہے انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیاً ۔ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے ۔ صیغہ ماضی ہے ۔ تو اب جمہور ملت کی زبان میں بات کرتا ہوں کہ اگر اُمم سابقہ میں گہوارے کا بچّہ نبی ہو سکتا ہے تو افضل الامم میں چار یا پانچ برس کے بچّے امام کیوں نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے امام کہنے میں اور سمجھنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے ۔ اسمیں کوئی مشکل پیش نہیں ہوتی لیکن ہاں یہ آخر کا جملہ کہ یہ دونوں امام ہیں چاہے کھڑے ہوں چاہے بیٹھے ہوں یہ سمجھ میں اس وقت نہ آسکتا کیونکہ یہ تو انسان کے حالات ہیں کبھی جاگتا ہے کبھی سوتا ہے کبھی اُٹھتا ہے کبھی بیٹھتا ہے اسکا امامت سے کیا تعلّق ہے مگر جب مستقبل نے حالات کے رُخ سے پردہ اُٹھایا اور اب وہ اسوقت کا مستقبل میرے لئے ماضی بن گیا تو سمجھ میں آیا کہ پیغمبرِ خدا اللہ کے دیئے ہوئے علم میں سے ماضی کے پردہ پر مستقبل کا نقشہ دیکھ رہے تھے پیغمبر کا مقصد یہ تھا کہ میرے ان دونوں بچّوں کا طرزِ عمل نگاہ ظاہر میں متضاد ہوگا ایک صلح کر کے بیٹھ جائے گا ایک تلوار لے کر کھڑا ہو جائے گا کچھ لوگ اسکی صلح پر معترض ہوں گے کچھ لوگ اسکی جنگ پر معترض ہوں گے اس لئے پیغمبر نے

پہلے سے کہہ دیا کہ یہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں چاہے کھڑے ہوں چاہے بیٹھے ہوں یعنی حسینؑ تلوار لیکر کھڑا ہو جائے تو اعتراض نہ کرنا اور حسنؑ صلح کر کے بیٹھ جائے تو اعتراض نہ کرنا وُہ اُٹھنا بھی حکمِ خُدا سے ہے اور یہ بیٹھنا بھی حکمِ خدا سے ہے وہ بھی امامت کا ایک انداز ہے اور یہ بھی امامت کا ایک شیوہ ہے۔ پھر ایک سند خصوصی چھوٹے کو عطا فرمائی۔ حسین منی وانا من الحسین۔ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ یہ خاص حضرت امام حسینؑ کے لیئے ہے۔ صحاح ستہ میں ہے۔ ترمذی بھی صحاح میں ہے اسکی حدیث ہے کہ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں اگر دُوسرا جملہ نہ ہوتا تو پہلا بالکل صاف تھا کہ حسینؑ مجھ سے ہے وہ نانا ہیں یہ نواسے ہیں۔ نانا کا وجود اسباب میں سے ہوتا ہے نواسے کے وجود کے لیئے۔ یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن اب دُوسرا جملہ کہ میں حسینؑ سے ہوں۔ پیغمبرِ خدا کے کلام کی ایک خصوصیت ہے کہ اُوتِیتُ جَوَامِعُ الْکَلِم یعنی مختصر جملے ہوتے ہیں اور اسمیں کتنے ہی پہلو ہوتے ہیں۔ اکثر جملے تو ایسے ہیں کہ جتنے اوصاف کمال ہیں پیغمبرؐ کے ایک جُملے سے وہ سب ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ کلامِ رسولؐ کی خصوصیت ہے تو آپ نے فرمایا حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ ان دونوں جملوں میں آخر ربط کیا ہے۔ پہلے میں کچھ اور ہو اور دوسرے میں کچھ اور ہو تو وہ تو ایسے ہے جیسے شعر دولخت ہوتا ہے۔ ویسے بے جوڑ فقرے ہو جائیں گے۔ لہٰذا ضرورت اسکی ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہو۔ اس وقت جو پہلو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے شے کا وجود اور ایک ہوتی ہے شے کی بقا۔ پہلا جُملہ جو ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے وہ وجود کے لحاظ سے ہے دوسرا جملہ جو ہے وہ بقا کے لحاظ سے ہے یعنی حسینؑ کا وجود میرے وجود سے ہے اور میری بقا حسینؑ کی وجہ سے ہے اور اب میں اُردو

میں ایک جملے میں ترجمہ کر سکتا ہوں کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ یعنی اگر میں نہ ہوتا تو حسینؑ نہ ہوتا اور اگر حسینؑ نہ ہوتا تو میں نہ رہتا جس وقت سے حسینؑ پیدا ہوئے۔ ۳/ شعبان ۳ھ سے لے کر ۱۰ محرّم ۶۱ھ تک حسینؑ رسولؐ سے اور ۱۰ محرم ۶۱ھ سے لیکر قیامت تک رسولؐ حسینؑ سے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک انسان کی بقا اس کے نام اور کام کی بقا سے ہے ۶۰ھ میں رسولؐ کا نام بھی خطرہ میں تھا اور کام بھی خطرہ میں تھا تو اب جس نے اپنی قربانی دیکر رسولؐ کے نام اور کام کو باقی رکھا وُہ رسولؐ کی بقا کا سبب ہے یہی تو اتنا بڑا مقصد ہے جس کے لئے اتنی قربانیاں پیش کی گئیں ایک روز کہہ چکا ہوں کہ استدلال کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ یہ ہے کہ سبب کو دیکھو اثر کو سمجھو دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ اثر کو دیکھو سبب کو سمجھو۔ یہ دو طریقے ہیں۔ یہاں بھی دونوں طریقے دیکھ سکتے ہیں پہلے سمجھئے کہ مقصد کتنا عظیم تھا۔ اس کے لئے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ بڑے مطالعہ کی ضرورت ہے اور میں دُوسرا طریقہ آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ دیکھئے کہ قربانیاں کیسی پیش ہوئیں اور ان قربانیوں کو دیکھ کر فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ قربانیاں کسی معمولی مقصد کی خاطر دی جاسکتی ہیں۔ وہ مقصد کتنا عظیم ہوگا کہ جس کے لئے یہ قربانیاں پیش کی گئیں۔ علی اکبر کی جوانی ایسی نہ تھی کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر دے دی جائے عباس کا شباب ایسا نہ تھا کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر دے دیا جائے۔ چھ مہینے کی جان وہ بچّہ ایسا نہ تھا کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر اسکی قربانی دے دی جائے اور اربابِ عزا آخر میں کہوں گا کہ زینب کی چادر ایسی نہ تھی کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر دے دی جائے۔ اب میں آپ کو اس چادر کی اہمیّت بتاؤں کہ مولا نے ہر قربانی اپنی نگاہوں کے سامنے پیش کی وہ ہر لاشہ آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے مگر یہ چادرِ زینب کی قربانی مولا اپنی نگاہوں کے سامنے گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔

اب ایک اور واقعہ عرض کروں گا بڑا دلدوز۔ کربلا کی ترتیب یہ تھی کہ ہر غیر اہم اشرف پر قربان ہو رہا تھا۔ اصحاب جب تک رہے عزیزوں کی باری نہیں آئی اعزّہ میں جب تک ایک بھی رہا۔ اشرف کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ سب امام پر قربان ہو گئے اور درمیان کی مسافت چھوڑ کر۔ خطابت نہیں کرنی چاہتا۔ میں کہتا ہوں کہ اب اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ حسینؑ جس کے لئے خود کو خطرہ میں ڈال دیں۔ تو اسکی اہمیّت محسوس کرنی پڑے گی کہ مولا کی نظر میں اسکی اہمیت کیا ہے۔ اب ایک نازک مرحلہ ہے مصائب کی منزل وہ ہے کہ راکبِ دوشِ رسول اب زمین پر ہے اور عالم یہ ہے کہ فوج میں اختلاف ہے کہ روح نے جسم سے مفارقت کی یا ابھی زندہ ہیں۔ ان میں سے ایک شقی نے یہ کہا وہ بڑا شقی تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ دشمن مزاج حسین سے واقف تھا اس نے کہا کہ میں ایک ترکیب بتاتا ہوں گھوڑوں کی باگیں خیموں کی طرف موڑ دو اگر زندہ ہیں تو برداشت نہیں کر سکیں گے ہاں اربابِ عزا یہ ہو گیا گھوڑوں کا رُخ خیام کی طرف کر دیا گیا مولا کے کانوں میں جو آواز گھوڑوں کی ٹاپوں کی اپنے سے دُور ہوتی ہوئی نظر آئی اور خیموں کے رُخ کی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں آئیں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا تھا اس کے پیشِ نظر اس جُملے پر غور کیجئے۔ دیکھئے خطرہ مولا سے دُور ہو رہا ہے، مگر مولا نے جونہی دیکھا کہ گھوڑوں کا رُخ خیموں کی طرف ہے۔ کہنیوں پر زور دیکر کہا ابھی میں زندہ ہوں ابھی میرے خیموں سے کیا مطلب۔ ماشاء اللہ مجلس ہو گئی ہے مگر مجھے یاد ہے کہ آج کی مجلس میں حضرت سیّد الساجدین کے مصائب کا کچھ تذکرہ ہونا چاہیئے۔ مَیں کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کہ یہ عظیم امتحان کس نے دیا ہے۔ یہ ہمارا چوتھا امام ہے۔ یہ امتحان اس کے لئے مخصوص ہو گیا اور یہ عظیم امتحان کِس کا تھا اور کتنا عظیم امتحان تھا کہ پھوپھی سرہانے کھڑی ہیں بیٹا

بتاؤ خیموں میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے تم بتاؤ جل کر مر جائیں یا باہر نکلیں میں کہتا ہوں تیر و خنجر نیزہ و تلوار جتنے حربے ہیں وہ سب بڑے مصائب ہیں مگر ان مصائب کی نوعیت کو دیکھئے۔ چند جملوں سے زیادہ عرض نہیں کروں گا۔ یہ دیکھئے کہ مولا کو بحیثیت امام پہلا حکم کیا دینا پڑتا ہے۔ یہ جانشین کے طور پر پہلا حکم دے رہے ہیں کہ پھوپھی اب خیموں سے نکلئے۔ ہاں اربابِ عزا اب وہ بی بیاں جن کی ماں کا جنازہ رات کو اُٹھا تھا وہ روز روشن میں اس طرح نکلتی ہیں کہ ان کے سر کے بال کھلے ہوئے ہیں۔

مجلس ہفتم

نظامِ اسلام کے تقاضے

حقوق النّاس کی اہمیّت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

ھَلۡ اَتیٰ علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکوراً۔

اس آیت کی پہلی لفظوں کی مناسبت سے نام اسکا ھل اتیٰ ہوگیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اس سورہ کا پس منظر یہ ہے کہ شہزادے بیمار ہوئے۔ حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ۔ میرا ایمان یہ ہے کہ ان میں سے ہر ہستی ایسی تھی کہ اگر صرف وہ بارگاہ الٰہی میں دُعا کر دیتی تو خداوند عالم ان کی دُعا کو قبول فرماتا اور حصول مقصد کیلئے انکی دُعا کافی ہوتی۔ مگر ہمیں ایک ذریعہ اجابت دعا کا سکھلانے کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ پیغمبر خدا کے ارشاد کے مطابق بعض روایات میں یہی ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ تم تین روزے نذر کرو۔ اسکو عرف عام میں منت ماننا کہتے ہیں۔ یہ نذر کرو کہ خداوند عالم حسنین کو صحت عطا فرمائے گا تو ہم تین روزے رکھیں گے۔ خداوند عالم نے صحت عطا فرمائی۔ ہم اکثر منتیں مان لیتے ہیں اور نذریں کر لیتے ہیں۔ لیکن اس وقت نذر کر لینے میں تو اپنی ضرورت ہوتی ہے۔ وفائے نذر میں پھر تاخیر سے کام لیتے ہیں طرح طرح کے حیلے حوالوں سے کہ یہ بات ہو جائے تو اس نذر کو پورا کریں گے اور وہ بات ہو جائے تو اس نذر کو پورا کریں گے۔ لیکن یہ آلِ رسول ہیں۔ بالکل نمایاں چیز جو ہمارے ذہنوں میں تاخیر کی متقاضی ہے

وہ یہ کہ ابھی تو صحت ہوئی ہے۔ صحت کے بعد ایک قوت آنے کی منزل ہوتی ہے
کہ مریض میں طاقت آجائے مگر وہاں چونکہ نذر صحت کی تھی۔ طاقت آنے کی تو شرط
تھی نہیں۔ لہٰذا ابھی میں عرض کروں گا کہ بچے کتنے ناتوان ہیں کمزور ہیں لیکن وفائے
نذر کی فکر ہو گئی۔ اب ایک پہلو پر اہلِ نظر غور کریں کہ شہزادوں کی صحت کے لئے
نذر کی تھی ماں باپ نے۔ خود شہزادوں نے تو نذر نہیں کی تھی مگر یہ ان کا ذوق
عبادت ہے کہ نذر کرنے والی صرف دو ہستیاں تھیں اور وفائے نذر میں خود وہ
شہزادے بھی شریک ہو گئے جن کی صحت کے لئے نذر مانی گئی تھی اور اب اس گھر
میں رہنے کا صدقہ ہے کہ وفائے نذر میں گھر کی کنیز بھی شریک ہو گئی یعنی جناب
فضہؑ جو اس گھر کی کنیزِ خاص ہیں۔ اس زمانہ میں اس قسم کے رشتہ کا نام کنیز ہی
ہوتا تھا ورنہ ظاہر ہے کہ دُنیا کی بہت سی ملکاؤں کے نام ہمیں یاد نہیں ہیں مگر
خانہ سیدہ کی اس کنیز کا نام لوح دل پر نقش ہے اور اگر خود فضہؑ سے پُوچھا جاتا کہ
تمہیں تاجدار ہونا پسند ہے یا یہاں کی کنیز ہونا تو وہ بھی اس کنیزی کو ترجیح دیتیں۔
تو اب تین روزے رکھنے میں حضرت امیرالمومنین نے وفائے نذر کے لئے گویا بس
اتنی آسانی اختیار فرمائی کہ معلوم تھا کہ تین روزے رکھنے ہیں اور تین دن افطار
ہو گا لہٰذا اب روز کہاں انتظام کرتا پھروں گا ایکدم سے تین روزوں کے افطار کا
سامان پانچ آدمیوں کا کر لیا جائے۔ اب اس کے لئے آلِ رسول کی وہ زندگی کہ جس
طرح سے یہاں انتظام ہوتا تھا اسی طرح امیرالمومنین نے انتظام فرمایا ایک یہودی
کے ہاں تشریف لے گئے اور وہاں سے صُوف بہ اُجرت حاصل فرمایا کہ اسکو
درست کیا جائے گا اور اس کے معاوضہ میں اتنا اناج جو تین دن تک پانچ روزہ
داروں کے لئے کافی ہو وہ حاصل کیا گیا اور وہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا
کے سپُرد ہو گیا وہ اناج بھی اور وہ صوف بھی۔ میں کہتا ہوں کہ ان ہستیوں کے

جو روزمرّہ کے کام ہیں انہی سے ہمارے لئے وہ نظامِ حیات مرتب ہوتا ہے جو درحقیقت نظام اسلام کا جزُ ہے۔ دُنیا کہتی ہے کہ اسلام نے پردہ میں رکھ کر ایک طبقہ کو بیکار بنا دیا میں کہتا ہوں کہ دُنیا دیکھے کہ بیکار کوئی طبقہ نہیں ہوتا صرف نظامِ عمل میں تقسیم عمل ہے اور وہ یہاں بھی نمایاں ہے کہ گھر کے باہر کا جتنا کام تھا وہ حضرت علی ابن ابی طالب نے کیا اور گھر کے اندر کا جتنا کام ہوگا وہ حضرت فاطمہ زہرا کریں گی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ غذا جو دہن تک پہنچے گی اس میں فقط امیرالمومنین کی کارگزاری شریک ہے اور اسمیں حضرت خاتون جنّت کی کارگزاری شریک نہیں ہے یہی نظام عمل ہے کہ مَرد مَرد رہتے ہوئے کارآمد ہو اور عورت عورت رہتے ہوئے کارآمد ہو۔ حضور والا یہ تو ہر ایک کی سمجھ میں آئے گا اور وہ تائید کرے گا کہ مرد کے لئے یہ کمال نہیں ہے کہ اسمیں نسوانیت پیدا ہو جائے اور عورت کے لئے بھی یہ کمال نہیں ہے کہ اس میں مردانگی پیدا ہو جائے بلکہ مَرد مرد رہتے ہوئے ترقّی کرے اور عورت عورت رہتے ہوئے ترقی کرے۔ اس کے لحاظ سے جو مناسب ہو وہ وہ کام کرے اور جو اس کے مناسب حال ہو یہ وُہ کام انجام دے۔ اناج اور صوف یہ دونوں چیزیں رکھ لی گئیں۔ حضرت فاطمہؑ نے صوف کے تین حصّے کئے اور اس اناج کے بھی تین حِصّے کئے ایک حِصّہ صوف کا دن بھر میں درست فرمایا اور ایک حِصّہ اناج کا درست کیا اور غذا بننے کی حد تک جو منزلیں ہیں وہ سب سیّدہؑ نے طے فرمائیں اس کے بعد افطار وہی روٹیاں جو اس اناج کی تھیں اور اسکے ساتھ کوئی چیز رکھ دی گئی سامنے۔ اب افطار کرنا چاہتے ہیں کہ دروازے پر سے آواز آئی انا مسکینؑ من مساکین المدینہ۔ میں ایک مسکین ہوں مدینہ کے مساکین میں سے لس یہ آواز آنا تھی کہ روزہ داروں نے ہاتھ روکے امیرالمومنین نے اپنی روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا سیّدہ عالم نے اپنی روٹی

اُٹھائی حسینؑ نے اپنی روٹیاں بڑھائیں اور فضہؑ جب روزہ کی منزل میں مالکوں سے پیچھے نہیں رہی تھیں تو انفاق کی منزل میں کیوں پیچھے رہتیں لہٰذا فضہؑ نے بھی اپنی روٹی بڑھائی۔ کوئی ضروری نہیں کہ امیر المومنین نے ہر ایک سے کہا ہو کہ تم بھی اپنی روٹی دیدو۔ تم بھی اپنی روٹی دیدو اس لئے کہ سائل ایک تھا اس کے سوال کو پورا کرنے کے لئے ایک آدمی کی غذا کافی تھی مگر یہ تو ماشاء اللہ علمی درسگاہ ہے شعرا بھی ممکن ہے کہیں بیٹھے ہوئے ہوں۔ شاعری میں جناب ایک، ہوتا ہے توارد یعنی وہی مصرع کسی ایک نے کہا اور وہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں بھی آگیا۔ اگر واقعی یہی ہو کہ اسکو اسکا علم نہیں تھا تو کہتے ہیں یہ توارد ہوگیا یعنی ایک ہی مصرع اتفاق سے دونوں کے ذہن میں آیا اس نے بھی وہی کہا اُس نے بھی وہی کہا تو وہ تو، ہوتا ہے شاعری میں توارد۔ میں کہتا ہوں چونکہ ان سب کی نیتیں یکساں تھیں ان سب کی فطرت ایک ہی تھی ان سب کا ذوق عبادت ایک ہی تھا تو یہ توارد عمل ہے یہاں ضرورت ایک کو دوسرے کے تحریک کرنے کی نہیں ہے کہ یہ ان سے کہیں کہ تم اپنی روٹی انہیں دیدو اور وہ ان سے کہیں کہ تم اپنی روٹی اسے دیدو۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی اسکی ضرورت تو ایک، ہی روٹی سے پوری ہو جاتی مگر ایک ساتھ ہر ایک انفاق پر تیار ہے۔ تو اب سوال یہ کہنے کا نہیں ہے کہ ایسا کرو اب تو مانع خیر ہونے کا سوال ہے کہ کوئی دوسرے کو روکے کہ نہیں تم نہ دو ضرورت کیا ہے تو ان میں سے کوئی مانع خیر ہونے والا بھی نہیں تھا لہٰذا ایک روٹی کے سائل کو پانچ روٹیاں چلی گئیں پانچ آدمیوں کی غذا چلی گئی۔ روزہ پانی سے افطار کرلیا گیا۔ اب دُوسرا دن ہوا۔ یہاں ایک پہلو پر توجہ فرمائیے کہ ابھی اناج رکھا ہوا ہے۔ کیا سیّدہ عالم اپنے بچّوں کی بھوک کو دیکھتے ہوئے معاذاللہ محنت سے جی چُرا تیں اس وقت۔ ظاہر ہے کہ رات اتنی طولانی ہوتی ہے کہ سحر کے وقت تک دوسرا حصّہ غذا کا

تیار ہو سکتا تھا لیکن یاد رکھیئے کہ یہ حقوق الناس کی اہمیت ہے۔ چونکہ وُہ اُجرت عمل میں نہیں آئے ہیں یعنی جتنا عمل ہوا ہے اتنے ہی ملکیت میں آئے ہیں۔ باقی اناج گھر میں رکھا ہوا ہے مگر اپنی مِلک نہیں ہے لہٰذا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اسکو اس وقت اپنے پیٹ بھرنے کے لئے استعمال کیا جائے لہٰذا روزے پر روزہ ہو گیا۔ اب دُوسرا روز جب ہوا تو وہی منزلیں عمل کی طے ہوئیں اور پھر افطار کے وقت سامان آیا اور عین افطار کے وقت دروازے پر سے آواز آئی کہ انا یتیم من یتامیٰ المدینہ۔ میں مدینہ کے یتیموں میں سے ایک یتیم ہوں۔ اندازہ فرمایئے کہ آل محمد یتیم کی آواز سنیں اور انہیں قرار آئے لہٰذا جو پہلے دن ہوا تھا وہی آج دُوسرے دن ہوا اور وہ روٹیاں اس یتیم کو دے دی گئیں پھر پانی سے افطار ہوا۔ اب تیسرا دن ہوا۔ یہاں اندازہ فرمایئے کہ ہر دن جو دوسرا آیا ہے اسمیں بھُوک کا ایک درجہ اُونچا ہو رہا ہے۔ یعنی پہلے دن جتنی خواہش غذا تھی اس سے دوسرے دن زیادہ خواہش غذا ہے اور اب یہ جو تیسرا دن ہے تو اس سے بھی زیادہ خواہش غذا ہے جو انتہائی نقطہ ہے خواہش غذا کا۔ مگر آج جب افطار کا وقت آتا ہے تو دروازہ پر سے آواز آتی ہے کہ انا اسیر من اساری المدینہ میں مدینہ کے اسیروں میں سے ایک اسیر ہوں۔ قرآن مجید نے اسی ترتیب کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے یطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً و یتیماً و اسیراً۔ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت میں۔ اب مفسّرین میں اختلاف ہے کہ اللہ کی محبت میں یا طعام کی محبت میں۔ یعنی یہ ضمیر طعام کی طرف راجع ہے کہ باوجود خواہش طعام کے باوجودیکہ خود بھُوکے ہیں پھر بھی کھلاتے ہیں۔ کِس کو پہلے دن چونکہ مسکین آیا تھا تو پہلے لفظ مسکین دوسرے دن یتیم آیا تھا تو دوسرے نمبر پر لفظ یتیم اور تیسرے دن اسیر آیا تھا تو تیسرے نمبر پر لفظ اسیر۔ یہاں

ایک پہلو پر غور کر لیجئے۔ ادب کی ایک اصطلاح ہے اور معانی و بیان ہمارے طلبہ کو بھی پڑھایا جاتا ہے اسمیں ایک صفت ہے لف ونشر مرتّب۔ یعنی چند چیزیں ایک ساتھ بیان ہوں اور اس کے بعد اس کے متعلق جو چیزیں ہوں دوسری جگہ وہ اسی ترتیب سے بیان ہوں۔ میں کہتا ہوں ان معصومین کے عمل اور قرآن مجید کے الفاظ میں لف ونشر مرتب ہے۔ لف ہے ان کے عمل میں نشر ہے قرآن کے الفاظ میں۔ صَلوٰۃ۔

ماننا پڑے گا کہ خدا نے یا تو اپنے علمِ وجوبی کے آئینہ میں ان کے کردار کی تصویر دیکھتے ہوئے قرآن کے الفاظ رکھے یا ماننا پڑے گا کہ تنزیل سے پہلے یہ الفاظ قرآن کو دیکھ رہے تھے۔ صَلوٰۃ۔ مگر زیادہ صحیح یہی پہلی توجیہ ہے کہ آنا تو دوسروں کا کام ہے۔ پہلے دن آیا مسکین دُوسرے دن آیا یتیم اور تیسرے دن آیا اسیر۔ تو اس لئے یہی صحیح ہے کہ اللہ اپنے علمِ غیب سے ان کے عمل کی ترتیب کو دیکھ رہا تھا لہٰذا اس نے لوح محفوظ میں جو ان کا عمل ہوگا اسی ترتیب سے الفاظ درج فرما دیئے۔ صَلوٰۃ۔

اب ایک خاص پہلو کی طرف توجّہ دلانا ہے کہ مسکین کے معنی تو معلوم ہیں عرفی معنی تو مطلق غریب ہونے کے ہیں۔ ایک فقہی اصطلاح ہے مسکین اور فقیر کی۔ اسمیں کیا فرق ہے یہ سب فقہ کی باتیں ہیں جو ہمارے طلبہ پڑھتے ہوں گے۔ تو اُسے اس وقت پیش کرنا نہیں ہے لیکن عام طور سے غریب آدمی کو مسکین کہتے ہیں غرض یہ کہ وہ جس معنی سے بھی مسکین ہو۔ پہلے دن مسکین تھا دوسرے دن یتیم۔ یتیم کے معنی بھی سب عام طور سے جانتے ہیں۔ تیسرے دن کون ہے اسیر ہے۔ اسیر کسے کہتے ہیں عام تصوّر یہ ہے کہ قیدی۔ لیکن کسی جُرم کی سزا میں قید کیا جائے تو اسے اصطلاح قرآن میں اور عربی میں اسیر نہیں کہتے اسیر کہتے ہیں جنگ کے قیدی کو۔

جنگ میں جو قید ہو اسکو اسیر کہتے ہیں۔ اب ایک اور پہلو کی طرف توجہ فرمایئے۔ ایک تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیغمبر خدا کے زمانہ میں جیل خانہ نہیں تھا ورنہ جو جیل خانے میں ہو وہ کہاں آئے گا۔ تو اس زمانہ میں جیل خانہ نہیں تھا قیدی کے معنی تھے بس کچھ حدود دیں جسے نظر بند کہتے ہیں کہ اس سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ عام قیدی نہیں ہے۔ اسیر ہے یعنی جنگی قیدی ہے اسیر جنگ جو ہوتا تھا اسکو بھی بند کر کے نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ وہ کچھ حدود کے اندر مقیّد ہوتا تھا۔ اب ان حدود کے اندر چاہے تو محنت مزدوری کر کے کسبِ معاش کرے چاہے تو کسی سے سوال کر کے پیٹ بھر لے بہرحال اگر وہ بند کر کے رکھا جاتا تو غذا کی ذمہ داری اس بند کرنے والے پر تھی چونکہ وہ آزاد رکھا جاتا تھا۔ حدود خاص کے اندر۔ تو یہ اپنا اپنا ذوق تھا۔ آج بھی ہے۔ کچھ محنت کر کے کھاتے ہیں کچھ سوال کر کے کھاتے ہیں تو ایسا ہی اس وقت بھی تھا۔ اب جو خاص پہلو ہے توجہ دلانے کا وہ یہ کہ زمانہ رسول میں قیدی جنگ کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اسیر ہے تو کوئی غیر مسلم ہے تو جناب وہاں تو میں اتقاد دکھا سکا یتیم کے معاملہ میں لب و لہجہ سے میں نے اتقاد دکھایا کہ آلِ محمد یتیم کی آواز سنیں اور انہیں قرار آئے مگر آج تیسرا روزہ ہے اور معراج ہے خواہش غذا کی۔ دو دن تھا امتحان حق ایمانی کا اور آج ہے امتحان حق انسانی کا۔ یہ چیزیں غیر مسلم دُنیا کے سامنے پیش کرنے کی ہیں کہ یہ ہے اسلام کی فراخ حوصلگی اور یہ ہے رہنمایان دین کی فیاضی۔ جس طرح خالق کی عطا مومن و کافر نہیں دیکھتی اسی طرح یہ اس کے نمائندہ ہیں جنکی عطا مومن و کافر نہیں دیکھتی۔ اب ایک چیز پر غور۔ الفاظِ قرآنی پر غور کرنے سے جو چیز سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اصل نذر تھی روزہ رکھنے کی۔ کھانا کھلانے کی نذر نہیں تھی۔ اس کے معنی ہیں وفائے نذر تو ہو گئی روزوں سے یہ فاضل عمل ہے جو اس

صورت سے ہو رہا ہے۔ ماشاء اللہ آپ حضرات صاحبانِ علم ہیں اور یہ مرکز تدریس ہے یہاں ان باتوں کی طرف زیادہ توجّہ کیوں نہ ہو ارشاد ہوتا ہے کہ یوفون بالنذر ویخافون یومًا کان شرہ مستطیرا یہ لوگ نذر پوری کرتے ہیں اور اندیشہ آخرت رکھتے ہیں۔ اگر کھانا کھلانا متعلق نذر ہوتا تو پھر بیچ میں واؤ نہ آتا۔ یوں کہا جاتا کہ یوفون بالنذر و یخافون یومًا کان شرہ مستطیرا یطعمون الطعام تب یہ اطعام یہاں ہوتا اسی وفائے نذر کا کہ وہ نذر پوری کرتے ہیں اور کس طرح کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں۔ مگر چونکہ نذر کے پورا کرنے میں تو روزے ہو گئے۔ اب یہ مزید اطاعت تھی خالق کی لہٰذا بیچ میں واؤ آئی یعنی وفائے نذر ایک عمل ہے اور اطعام طعام یہ دُوسرا عمل ہے اب اس کے بعد ایک نتیجہ نکلے گا تھوڑی دیر کے بعد اور تھوڑی دور پر۔ اسکو ابھی سے ذہن نشین رکھئے گا کہ وفائے نذر روزوں کے ساتھ ہے اور یہ کھانا کھلانا جو ہے یہ بغیر نذر ہے۔ یہ مزید طاعت و عبادت ہے جو اس صورت سے انجام پائی۔ اب اس کے بعد خالق نے جزائیں بیان کرنی شروع کیں اور جتنے نعمات جنّت ہیں سب کو سمیٹ کر۔ قرآن مجید میں یہ سب نعمتیں متفرق طور پر مذکور ہیں کہیں حوریں ہیں کہیں قصور ہیں کہیں چشمے ہیں لیکن یہاں سب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں جتنے نعمات جنّت ہیں سب اکٹھے کر دیئے گئے ہیں لیکن باریک بین نگاہوں نے جو دیکھا تو اس سورہ میں سب نعمتیں جمع ہیں مگر حور کا ذکر نہیں ہے تو اب فکر ہوئی کہ یہ کیا بات ہے کہ جنت کی تمام نعمتوں کا ذکر ہے مگر یہاں اس سورہ میں حور کا ذکر نہیں ہے تو سمجھ میں یہ آیا کہ چونکہ صاحبانِ کردار میں حضرت فاطمہ زہرا بھی تھیں اس لئے حور کا تذکرہ خلافِ بلاغت تھا۔ صَلوٰۃ۔

جہاں سے جزائیں شروع ہوئیں وہاں سے ایک لفظ ہے جزا ھم

بما صبروا۔ اللہ نے انہیں جزا یں عطا کیا اسکی کہ انہوں نے صبر کیا۔ اب اس کے بعد سب نعمات جنت کی فہرست ہے ایسے چشمے ایسے قصر ایسے لباس ایسے زیور۔ سب تفصیلات ہیں کا ہے پر یہ جزا ہے بما صبروا۔ اب اصطلاح قرآن دیکھی تو پتہ چلا کہ صبر روزہ کا نام ہے یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلٰوۃ اے صاحبان ایمان صبر و صلوٰۃ سے سہارہ حاصل کرو تو صلوٰۃ کے تناسب سے وہ صبر جو میدان جنگ کا ہے وُہ تو کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا پتہ چلا کہ صبر صوم کا نام ہے تو اب جو ارشاد ہوا کہ جزاءً بما صبروا اللہ نے یہ سب جزا ان کے صبر کے بدلے دی اس کے معنی یہ ہیں کہ جنت کی سب نعمتیں تو روزوں کی جزا میں صرف ہو گئیں وہ تمام نعمتیں ختم ہو گئیں صرف روزہ کی جزا میں مگر کردار تو ابھی ان کا فاضل ہے۔ اس کے بعد بھی سب نعمتیں بیان کر کے یہ مناسبت ہے ابتدائے خطاب میں۔ جزاءً بما صبروا۔ جزا سے جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ پُورا ہوا۔ اب اس سلسلہ کے بعد کیا کہا جا رہا ہے ان ھذا کان لکم جزاء۔ ابھی تک تو غائب کے انداز میں بات ہو رہی تھی۔ یہ وہ انداز ہے جو سورۂ الحمد میں ہے کہ پہلے اللہ کا ذکر بطور غیبت۔ الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اللہ کی بارگاہ سے بندہ غیر حاضر ہے اسکی تعریف کر رہا ہے اس کے اوصاف بیان کر رہا ہے لیکن اوصاف بیان کرتے کرتے گویا اس کے تقرب کا درجہ اتنا اُونچا ہو گیا۔ گویا معبود کا جلوہ بالکل سامنے نظر آ رہا ہے اور یہ بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو گیا تو کہتا ہے اِیاک نعبُدُ وایاک نستعین۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اب اس غیبت نے حضور کی شکل اختیار کر لی۔ بالکل اسی طرح یہاں یہ اُدھر سے ہے کہ ابھی تک تو ان بندوں کا بطور غیبت ذِکر ہو رہا تھا سب الفاظ غائب کے تھے یوفون بالنذر جمع مذکر غائب کا صیغہ اور جزاھم بما صبروا جمع

مذکر غائب کا صیغہ۔ اب تذکرۂ جزا میں بندہ کا تقرب نظر قدرت میں ایسا سمایا کہ آپ اسے مخاطب بنالیا ان ھذا کان لکم۔ ابھی تک تو ان کا ذکر ایسے ہو رہا تھا جیسے کسی اور سے کیا جا رہا ہے مگر اب خود انہیں مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے۔ ان ھذا کان لکم۔ لھم نہیں ہے۔ ان کے لئے نہیں۔ اے آلِ رسول۔ یہاں مخاطب فقط رسول نہیں ہیں بلکہ سب ہیں تو اب جو یہ وحی آئی ہے یہ ایک ذات پر نہیں ہے۔ صَلوٰۃ۔

اب خالق خود ان سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ ان ھذا کان لکم جزاءً اے آلِ محمد یہ تمہارے لئے۔ یاد رکھئے کہ آیہ تطہیر میں منزل آیہ تطہیر جو ہستیاں ہیں ان میں پیغمبر بھی داخل ہیں لیکن ھل اتیٰ کی منزل میں پیغمبر خدا شامل نہیں ہیں۔ صَلوٰۃ

ماشاء اللہ عربی داں حضرات کے لئے تو کوئی نئی چیز نہیں ہے آپ حضرات کے لئے توضیح کی ضرورت ہے کہ اس جملے کے دو انداز ہو سکتے تھے ایک یہ کہ ان ھذا جزاءکم۔ یہ تمہاری جزا ہے۔ ان الفاظ کے معانی یہ ہوتے کہ جزا پوری مل گئی۔ ارے تم نے یہ کیا تھا لو یہ تمہاری جزا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ حق جزا ادا ہو گیا لیکن متکلم قرآنی الفاظ کا اضافہ بلا وجہ نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ یہ تمہاری جزا ہے۔ عربی میں تنوین ہوتی ہے تقلیل کے لئے۔ رضوان من اللہ اکبر یعنی اللہ کی ذرا سی مرضی بڑی سے بڑی چیز ہے۔ یہ ذرا سی کس چیز کے معنی ہوئے یہ رضوانٌ میں جو دو پیش ہیں اس تنوین سے یہ صورت پیدا ہوئی۔ کہ تھوڑی سی مرضی بھی۔ اب ذرا دیکھئے کہ وہی تنوین ہے ان ھذا کان لکم جزاءً۔ اے آلِ رسول یہ تو تمہاری تھوڑی سی جزا ہوئی۔ صَلوٰۃ۔

کیا عادل خالق بندہ کے پلّے کو گراں رہنے دے اور اس کے عوض میں کچھ عطا نہ کرے مگر سرمایہ جزا تو ختم ہو گیا اب اور کچھ کہاں سے آئے تو عادل نے

توازن قائم کیا کان سعیکم مشکورًا۔ تمہاری کوشش قابل شکرگزاری ہے صلوٰۃ
باب فضائل میں یہ تین دن ھل اتیٰ والے اور باب مصائب میں تین دن کربلا
والے۔ وہ بھی بس تین دن ہی تھے کیونکہ تین روزے ختم ہو گئے اب چوتھا دن
ہوا تو اب روزہ تو نہیں ہے لیکن غذا بھی تو ابھی نہیں ہے پھر امیرالمومنین انتظام
فرمائیں گے تب غذا ہو گی تو یہ چوتھا دن بھی شامل ہے یہ روایت بین الفریقین
مسلّم ہے یہاں تک کہ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں بھی یہ پورا واقعہ درج
کیا ہے۔ تفسیر میں درج تو کر دیا ہے لیکن لوگوں نے اسکو اصل منزل سے ہٹانے
کے لئے اوپر مکیہ لکھ دیا ہے۔ اٹھا کر دیکھئے قرآن مجید کہیں کے بھی چھپے ہوئے
ہوں تو اسکی پیشانی پر سورۃ الدھر کے نیچے مکیہ لکھا ہوا ہے تاکہ جو اصل منزل ہے
اُس سے دور ہو جائے۔ تلاش کرنے سے مل جاتے ہیں ایسے قرآن جن میں "مدنیہ"
لکھا ہوا ہے مگر عام طور سے "مکیہ" لکھ دیا گیا ہے تاکہ ذہن شانِ نزول کی طرف
جائے ہی نہیں۔ مفسرین مجبور ہیں کہ اس کے ضمن میں شانِ نزول کا تذکرہ کریں۔
بہرحال اب چوتھا دن ہے روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باوجودیکہ پیغمبرؐ خدا
روز بیت الشرف میں تشریف لاتے تھے فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے مگر
جیسے یہ بھی قدرت کا انتظام ہے کہ اس تین دن میں۔ میں کہتا ہوں کہ جب یہ
حضرات راہِ عمل میں تھے۔ پیغمبرؐ خدا تشریف نہیں لائے چوتھے روز حضور
تشریف فرما ہوئے۔ اور اب حفظ آداب ہے اس گھرانے کا کہ جونہی رسول
تشریف لائے تو سب تعظیم کو کھڑے ہوئے۔ تو یہاں میں نے حوالہ دیا تھا کہ بچے
کتنے ناتواں ہیں یہ بعد میں پتہ چلے گا۔ تو اب سب کھڑے ہوئے ہیں تعظیم کو۔
حسنؑ اور حسینؑ بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں راوی نے انکی کیفیت بیان کی ہے
کہ حسنؑ اور حسینؑ جو کھڑے ہوئے تو ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، تھرتھرا رہے تھے

روایت میں یہ ہے کہ اس طرح لرز رہے تھے جس طرح چوزہ مرغ جو تازہ پیدا ہوا ہو جس کے پاؤں کھڑے ہونے میں تھراتے ہیں۔ پیغمبرِ خدا نے جو بچوں کی یہ کیفیت دیکھی۔ میں کہتا ہوں کہ راوی کی نظر جو پہلے پیروں پر پڑی تو پیغمبرِ خدا کی نظر بھی پہلے پیروں ہی پر پڑی ہوگی اس کے بعد سب کے چہرے دیکھے ہوں گے تو اس کے بعد خاص تغیّر محسوس ہوا ہوگا۔ فرمایا یہ کیا عالم ہے امیرالمومنینؑ نے عرض کیا کہ خدا ورسول زیادہ واقف ہیں۔ یہ کیا بات ہوتی کہ وہ اپنی رُوداد عمل خود سناتے۔ کہا کہ خدا ورسول زیادہ واقف ہیں۔ اتنی دیر میں جبرئیل امین بسم اللہ سمیت ۳۱ آیتیں مدحیہ لئے ہوئے اُترے اور وہ سورہ پڑھ کر پیغمبرِ خدا نے تمام اہلِ بیت کو سُنایا کہ لو تم لوگ بیان کرو یا نہ کرو خالق نے تمہاری ساری رو داد سُنا دی ہے اب بتایئے جنکا ذکر خدا رسول سے کرے ان کا ذکر اگر ہم کریں تو عبادت نہ ہو۔ صَلوٰۃ

غرض یہ کہ ظاہر میں تو وہ تین دن ہیں لیکن حقیقت میں چوتھا دن بھی ان کے ساتھ شامل ہے اسی طرح کربلا میں ساتویں کو پانی بند ہوا تو سات آٹھ نو عاشور دس۔ صبح عاشور تین دن پورے ہو گئے۔ اب یہ عاشور کے دن کا حساب تو ان تین دن میں نہیں ہے۔ یہ تو فاضل حِصّہ ہے۔ جیسے وہاں کا چوتھا دن فاضل تھا ویسے ہی یہاں کا چوتھا دن فاضل ہے۔ اربابِ عزا اب آپ کے لئے یہ مصائب کافی ہیں کہ وہاں وہ چوتھا دن تھا کب تک۔ جب تک کوئی غذا کا سامان ہو یہاں وہ چوتھا دن کب تک ہے۔ کسی کے لئے تلوار کے زخم تک کسی کے لئے نیزے کے زخم تک اور کسی کے لئے تیر کے زخم تک۔ اس وقت حدِ عطش ختم ہو گئی۔ اس سے پہلے تک تو نایابی آب ہے۔ وہاں تین دن تھے ان کے درمیان میں کم سے کم پانی تو ملا تھا مگر کربلا کے تین دن اس میں نہ پانی ہے نہ غذا۔ اب یہاں

ایک حقیقت پر شیخ جعفر شوستری اعلی اللہ مقامہٗ نے خصائص حسینیہ میں توجہ دلائی ہے کہ کربلا میں اصحاب حسینی اعزّائے حسینی جس طرح تین دن کے پیاسے تھے اسی طرح تین دن کے بھوکے بھی تھے بلکہ ممکن ہے کہ پانی کے قبل سے غذا نہ ملی ہو مگر کربلا میں سوال آب تو طرح طرح ہوا۔ پیاس کا اظہار طرح طرح مگر بھوک کا نام ایک دفعہ بھی کسی کی زبان پر نہیں آیا۔ اب یہ میں اضافہ کر رہا ہوں کہ بعد میں زینب کبریٰ نے کہا کہ قتل اخی جائعا قتل اخی عطشانا۔ میرا بھائی دنیا سے بھوکا اُٹھا میرا بھائی دنیا سے پیاسا اُٹھا۔ انہوں نے پیاس کے ساتھ بھوک کا بھی تذکرہ فرمایا ہے مگر کربلا میں بڑوں کا کیا ذکر کسی بچّے تک نے بھوک کا نام نہیں لیا۔ یہ کیوں۔ انہوں نے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ بات یہ ہے کہ امام اور ان کے اصحاب بھی اعزّہ بھی باوجود انتہائے مصائب کے عزّت نفس کی منزل سے نیچے نہیں اُترے۔ پانی کا مانگنا عیب نہیں ہے۔ خود داری کے خلاف نہیں ہے۔ راہ گیر پیاسا ہوتا ہے تو اجنبی سے پانی مانگ لیتا ہے۔ اسمیں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر سوال غذا یہ بلند نفوس کے خلاف ہے لہٰذا کربلا میں پانی کا سوال طرح طرح ہوا اور ابھی عرض کروں گا کس کس طرح ہوا ان کا ارشاد۔ شیخ جعفر شوستری کا۔ یہاں تک ہے۔ بڑی بلند حقیقت تک ان کی نظر گئی مگر میرا دل اس سے آگے بھی کچھ کہتا ہے۔ میرا ضمیر اس کے آگے بھی رہنمائی کرتا ہے میں کہتا ہوں کہ اگر پانی بھی ان کا جمع کردہ ذخیرہ ہوتا تو شاید امام سوال نہ کرتے۔ چونکہ اللہ کی بنائی ہوئی نہر سامنے تھی یہ سوال آب نہ تھا حقوق انسانی کے لئے احتجاج تھا۔ بے شک سوال آب کیا اور جو جو کیا وہ ہم تک پہنچا۔ یہ کہا کہ تمہارے نبی کا نواسہ ہوں اور پیاسا ہوں۔ یہ کہا کہ علی و فاطمہ کا بیٹا ہوں اور پیاسا ہوں۔ یہ کہا کہ تمہارا بلایا ہوا مہمان ہوں اور پیاسا ہوں اور اہل عزا روایت مشہور کی بنا پر عرض کر رہا ہوں کہ جب سوال آب میں اپنی زبان نے

کام نہ کیا تو لے زبان کی زبان سے بھی کام لیا۔ پانی کا سوال طرح طرح کیا جو جو کہا وہ میں نے عرض کیا مگر یہ ایک دفعہ بھی نہیں کہا کہ میں نے تمہیں پانی پلایا تھا اس لئے کہ احسان کر کے یاد دلانا شان کریم نہیں ہے۔ ارے کسی ایک بچے تک نے آپس کی گفتگو تک میں نہیں کہا کہ یہ کیسے لوگ ہیں ہم نے تو انہیں پانی پلا دیا تھا اور یہ لوگ ہم کو پانی نہیں پلاتے یہاں تک کہ سکینہ جو اتنی کم سن ہے کہ شاید میں پورے طور پر نہ بتا سکوں کہ کے برس کی تھیں اس لئے کہ ایک تذکرہ تو آپ نے سُنا ہوگا وہ بچی کی کمسنی ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ جب مولا رخصت ہو کر جا رہے تھے تو سکینہ نے کہا کہ بابا ہمیں نانا کے روضہ پر پہنچا دیجئے۔ میرے خیال میں تو یہ سوال ان کی کمسنی اور نادانی کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے مگر اتنی کمسنی ہوتے ہوئے انہوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ پھوپھی بابا نے تو انہیں پانی پلایا تھا اور یہ ہمیں پانی نہیں دیتے ہیں۔ اس گھر کے بچے بھی اتنے بلند ظرف تھے کہ یہ تذکرہ نہیں کر سکتے تھے میں نے تین دن کہے حل اتی کے اور تین دِن کہے کربلا کے اور چوتھا دن کہا کہ وہاں بھی شامل تھا اور یہاں بھی چوتھا دن شامل ہے مگر اب ایک حقیقت کی طرف توجہ دلاؤں کہ کربلا میں کس کی حد عطش کب تک ہے جو پہلے چلا گیا اس کی پیاس جلدی بجھ گئی؛ اور جو زیادہ دیر تک رہا وہ زیادہ پیاسا رہا اس لئے ترتیب شہدا یہ قرار دی گئی تھی۔ ممکن ہے آپ نے واعظین سے سنا ہو مگر میرا جہاں تک مطالعہ ہے یہ نہیں ہوا ہے کہ اعزہ نے جانا چاہا ہو اور اصحاب نے پیروں پر سر رکھ دیئے ہوں کہ ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے کربلا کے اقدامات تکلفات کے ماتحت نہیں ہو رہے تھے۔ میرا تو تصور ہے کہ مولا نے حکماً یہ نظام قائم کیا تھا کہ پہلے اصحاب جائیں اور گویا تاکید کی تھی کہ خبردار اصحاب میں سے جب تک ایک بھی ہے عزیز کوئی نہ جائے۔ یہ کیوں اس لئے کہ جو پہلے گیا اسکی مسافت مصیبت مختصر ہوگئی۔ عطش کا

طوفان کربلا کے آفتاب کی تمازت کے ساتھ ساتھ سیلابی رفتار سے بڑھ رہا ہے گویا مولا کہہ رہے ہیں کہ علی اکبر تمہیں کیا حق ہے کہ تم کوثر پر جا کر سیراب ہو جاؤ اور میرا حبیب پیاسا رہے تو کربلا کی ترتیب یہ ہے کہ جو نو وارد ہے وہ پہلے جائے کیونکہ امام کو تو یہ تصور ہوگا کہ جب دشمن فوج کا سردار ہو کر آیا تھا تب تو ہم نے پانی پلا دیا تھا اور اب جب دوست ہو کر آیا ہے تو ایک جرعہ آب نہیں ہے کہ مہمان کی ضیافت ہو سکے تو اگر پانی نہیں پلا سکتے تو پیاسا بھی کیوں رکھیں لہٰذا ابھی آیا ہے تو ابھی جائے اور خاص الخاص اصحاب حبیب ابن مظاہر اور زہیر قین وغیرہ وہ ظہر تک رہیں۔ اصحاب میں سے جب تک ایک بھی ہے اس وقت تک عزیز نہ جائیں۔ جب عزیزوں کی باری آئے تو دُور کے عزیز پہلے چلے جائیں۔ پسران عقیل چلے جائیں۔ اولاد جعفر چلی جائے پھر بھتیجے چلے جائیں برابر کا بھائی بعد کے لئے رہے اور یہ جوان بیٹا روایت مشہور کے مطابق بعد تک رہے۔ یہ کیا ہے۔ سمجھ میں آیا۔ یعنی مولا کو جسکی قوت برداشت پر زیادہ بھروسہ ہے جس سے شدت وقت کا مقابلہ زیادہ کرانا ہے اسکو آخر کے لئے رکھا گیا ہے۔ بس میں بارگاہ سیّد الشہداء میں عرض کروں گا کہ اے میرے مولا یہاں تک میں نے سمجھا اور مجمع کو سمجھایا مگر اب میری منطق ساتھ چھوڑتی ہے اب میرا فلسفہ ہتھیار ڈالتا ہے مولا یہ عباس کے بھی بعد علی اکبر کے بھی بعد یہ چھ مہینے کی جان یہ شہزادہ علی اصغر۔ اسے مولا نے بس اپنا پیش خیمہ رکھا۔ بات تو بظاہر انتہا کو پہنچ گئی۔ اب کربلا کے جو شہدا ہیں ان میں سب سے زیادہ پیاسے کون ہمارے مولا حسینؑ اس لئے باوجودیکہ بہتّر پیاسے تھے مگر جب مرثیہ پڑھا گیا تو حسینؑ کی پیاس کا۔ سیّد سجادؑ بھی کہتے رہے کہ میرا باپ دُنیا سے پیاسا گیا زینب نے بھی یہی کہا کہ میرا بھائی دُنیا سے پیاسا گیا ارے یہانتک کہ رباب نے بھی یہ پُوچھا کہ میرے مالک کو پانی بھی پلا تھا یا نہیں۔ ماشاءاللہ اجرکم علی اللہ۔ تو بے شک اسمیں

کوئی شک نہیں کہ کربلا کے مجاہدین میں سب سے زیادہ پیاسے امام حسینؑ مگرامام حسینؑ کی بھی حدِ عطش عصرِ عاشورہی جس وقت ہم آپ فاقہ شکنی کر لیتے ہیں اسوقت مولا کی عطش ختم ہو چکی ہے مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ زینب کب تک پیاسی رہیں امِ کلثوم کب تک پیاسی رہیں اور اہل حرم کب تک پیاسے رہے۔ ایک روایت کبھی کبھی پڑھی جاتی ہے اور میں کیا کہوں کہ کتابوں میں کہیں نظر نہیں آتی وہ زوجہ حرُ کا پانی لانا ارے حرُ اکیلا آیا تھا اس کے ساتھ زوجہ کہاں تھی میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان کے ظرف شرافت میں اتنی گنجائش تھی کہ وہ فتح مناتے وقت یہ تصور کرتے کہ ہم انہیں پانی بھیجیں۔ اہلِ عزا جو پیاسوں کی طرف آگ بھیجیں وہ بھلا پانی بھیجیں گے۔ میری سمجھ میں جو آیا ہے وہ یہ کہ پانی کبھی آیا ہو مگر شب یازدہم کوئی ثبوت نہیں بس اتنا ہے کہ عصر کے بعد وہ پہرہ جو فرات پر بیٹھا تھا وہ پہرہ ہٹ گیا اس لئے کہ وہ شیر نہیں رہے جن کا ڈر تھا۔ اب فرات بہہ رہی ہے جس پیاسے کا دِل چاہے وہ پانی پی لے مگر میں آپ سے محبتِ حسینؑ کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کہ فاقہ شکنی کے وقت جب آپ کے سامنے فاقہ شکنی کا سامان آتا ہے تو کیا واقعی آپ کا دل پانی پینے کو چاہتا ہے۔ بخدا حکم شرعی کی پابندی ہے کہ کامل روزہ نہیں ہونا چاہیئے ورنہ پانی پینے کو کس محبِ حسینؑ کا دل اس وقت چاہتا ہو گا۔ اب انصاف کیجئے کہ فرات بہہ رہی ہے مگر کیا لیلیٰ کا دل چاہا ہو گا کہ علی اکبر کے بعد جا کے پانی پیئں۔ کیا امِ کلثوم کا دل چاہا ہو گا عباس کے بعد کہ جا کے پانی پیئں کیا بیوۂ حسن کا دل چاہا ہو گا قاسم کے بعد کہ جا کے پانی پیئں کیا زینب کا حسینؑ کے بعد دل چاہا ہو گا کہ جا کہ پانی پیئں بظاہر تو بات انتہا تک پہنچ گئی مگر اہل عزا میں کہتا ہوں کہ کیا علی اصغر کے بعد سکینہ کا دل چاہا ہو گا کہ پانی پیئں میرا تو تصور ہے کہ دریا بہہ رہا ہو گا پیاسے منہ پھرائے بیٹھے ہوں گے کہ ہمیں اب اس پانی کی ضرورت نہیں ہے۔

مجلس ہشتم

قانون اخلاق اور دین

اصولِ دین میں وجوب تحقیق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۔

ایمان دین کے ساتھ وابستہ ہے اور خلق کی اصلاح کے لئے تین چیزیں سامنے آئی ہیں۔ اخلاق، قانون اور دین۔ اخلاق اور قانون میں کچھ خوبیاں اور کچھ مفادات مضمر ہیں اور ان کا مقصد یہی ہے کہ خلق خدا بھلائیوں کے قریب آئے اور برائیوں سے دُور ہو مگر ہر ایک میں کچھ خامیاں اور کچھ نقائص ہیں۔ مثلاً یہ کہ اخلاق کے اُصول اپنے امکان بھر تو صحیح بنائے جاتے ہیں لیکن چونکہ عقل انسانی کمال کی منزل پر نہیں ہے، اس لئے اس کے بنائے ہوئے اُصول اچھائیوں اور بُرائیوں کے تمام پہلوؤں پر کس طرح حاوی ہو سکتے ہیں۔ دُوسری بات یہ کہ اخلاق کے اُصول جن لوگوں نے بنائے ہیں وہ خود ہَوا وہوس سے بری نہیں ہیں خود ان کے پیش نظر کچھ مفادات ہو سکتے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ عقل کے محدود ہونے کی وجہ سے نادانستہ غلطیوں کا امکان تھا دُوسرے یہ کہ چونکہ وہ خود ان جذبات سے بری نہیں ہیں جو بے راہ روی کی طرف لے جاتے ہیں تو اب دانستہ غلطیوں کا بھی امکان ہے۔ اس کے علاوہ ایک کمی اخلاق میں یہ ہے کہ اس میں قوت محرکہ نہیں ہے یعنی بس ایک علم ہے کہ یہ خوبی ہے یہ بُرائی ہے اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ

جو سر کو اس کے سامنے جُھکائے اور اس کے ماننے اور عمل میں لانے پر آمادہ کرے۔ پھر اخلاق کے معلمین خود اپنے اصول کا نمونہ بن کر پیش نہیں ہو سکتے یعنی وہ خود اس منزل پر نہیں ہیں کہ جو اصُول انہوں نے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں قانون کو لیجیئے اس میں بھی قوت محرکہ کی کمی نظر آتی ہے۔ اس نے سزائیں مقرر کر کے اور ان چیزوں سے جن سے بچانا مقصود تھا ان کو بتا کر ایک کام کیا لیکن وہ سب باتیں قائم رہیں۔ پھر قانون بھی تو خود محدود عقل والے آدمی بنا رہے ہیں اسی لیے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ اسی وجہ سے قانون پر برابر نظر ثانی ہوتی رہتی ہے ہر دفعہ قانون کو از سرِ نو مرتب کیا جاتا ہے تاکہ جو نقائص پہلے رہ گئے تھے وہ دُوسری دفعہ دُور ہو سکیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے تو جو بات اخلاق میں تھی وہ قانون میں بھی موجود ہے قانون کے بنانے والے بھی سب نیک نیت نہیں ہوتے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان کے بھی کچھ مفادات مضمر ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ قانون بنا دیا گیا کہ تمام افراد انسانی میں سے کچھ یعنی نیچی ذات والوں کو اُونچا کام کرنے کا حق نہیں ہے اس طرح مستقل طور پر پیام بلندی ایک طبقہ کے لئے ہو گیا۔ کسی ملک والوں نے رنگت کے لحاظ سے تقسیم کر دی کہ ایک رنگ والوں کو وہ حق نہیں ہے جو دوسرے رنگ والوں کو حق ہے۔ تو اس طرح قانون کے ذریعہ اپنا مفاد جو تھا وہ پُورا کیا گیا۔ تیسرا نقص قانون میں یہ ہے کہ اس کا واقعاً ہر فرد کو اچھا بنانے کا مقصد نہیں ہے بلکہ قانون کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک فرد کو دوسرے سے نقصان نہ پہنچنے دے۔ جس حد تک قانون کہتا ہے۔ اپنی جگہ جھوٹ کوئی خواہ کتنا ہی بولے قانون کو اس سے مطلب نہیں ہے کسی دُوسرے کو دھوکہ نہ دے اگر دھوکہ دیگا تو وہ جُرم ہو جائے گا۔ اسی طرح اپنی جگہ کیسی ہی ہوسناکی غلط طور پر ہو قانون کو اس سے بحث نہیں ہے لیکن اگر جبر شامل ہو گیا تو وہ قابل سزا ہو گا۔ اِس طرح اُسے افراد

کے سدھارنے سے مطلب نہیں ہے وہ تو افراد کو بُرا کہتا ہے یعنی یہ کہ افراد اچھے نہیں ہیں تو وہ اب قانون کے دباؤ سے اچھے ہوں گے اچھائیوں کے پابند ہوں گے اور وہ اسی وقت تک پابند ہوں گے جب تک قانون کی گرفت مضبوط ہوگی۔ ادھر قانون کا شکنجہ ڈھیلا ہوا ادھر افراد بے راہ روی کرنے لگے۔ اس لئے کہ قانون کو صرف بیرونی زندگی سے مطلب ہے اندرونی زندگی سے دل چسپی نہیں ہے بالفاظ دیگر اسکو لوگوں کے افعال سے مطلب ہے اُن کے اوصاف سے غرض نہیں ہے تو یہ بہت بڑی کمی قانون میں موجود ہے اور قانون انسان کو اس وقت تک پابند کرسکتا ہے جب تک منبروں کا اندیشہ ہے یا جب تک سراغ رسانوں کا ڈر ہے لیکن جب اطمینان ہوجائے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو اس وقت یہ ضروری نہیں کہ انسان قانون کی پابندی کرے۔ قانون میں یہ سب نقائص ہیں اور پھر وہی بات ہے کہ قانون کے ساتھ نمونے نہیں ہیں یعنی قانون ساز افراد خود ایسا نمونہ بن کر پیش نہیں ہوسکتے۔ دین جو آیا اس نے اس کمی کو دُور کیا۔ جو جو خوبیاں تھیں وہ سب لیں جو جو مفادات تھے ان سب کا تحفظ کیا جو نقائص تھے ان سب کو دُور کیا۔ دین سے میرا مطلب دین صحیح ہے۔ بنام دین کوئی چیز ہو تو اس سے مجھے مطلب نہیں ہے۔ یاد رکھئے کہ جو کچھ فائدہ کسی شے سے وابستہ ہوتا ہے وہ دراصل اسکی حقیقت سے متعلق ہوتا ہے اسکی مصنوعی نقل سے متعلق نہیں ہوتا۔ پانی پیاس بجھاتا ہے۔ کاغذ پر پانی کا لکھا ہوا نام پیاس نہیں بجھا سکتا اسی طرح سے دُنیا والے کہتے ہیں۔ ارے آپ کہتے ہیں کہ دین امن کا ذمّہ دار ہے لیکن دین کی وجہ سے جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں جتنی خوں ریزیاں ہوئی ہیں وہ شاید کسی اور وجہ سے نہ ہوئی ہوں۔ تو میں کہتا ہوں کہ نقل اس چیز کی بنائی جاتی ہے جو قیمت رکھتی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ سراب بہت سے پیاسوں کو اپنی چمک دمک سے دھوکہ دیتا ہے اب اگر سراب نے آپ کو

زحمت و مشقت میں ڈال دیا تو اسکی وجہ سے پانی تو فنا کر دینے کے قابل نہیں ہے۔
مجھے معلوم ہے کہ امیٹیشن بنلائے جاتے ہیں مگر امیٹیشن اسی چیز کا بنایا جاتا ہے جو قیمتی ہو اگر آپ نے بہت دفعہ نقلی پتھر خرید نے سے گھاٹا اُٹھایا ہو تو اسکی وجہ سے اصلی پتھر دُنیا سے فنا کر دینے کے قابل نہیں ہو جائیں گے اور ایک جانی ہوئی چیز بیان کروں کہ جھوٹ جب تک سچ بنکر پیش نہ ہو تب تک جھوٹ نہیں ہے۔
لیکن اسکی وجہ سے سچائی تو فنا کرنے کے قابل نہیں ہو گی اسی طرح اگر بنام دین فسادات ہوئے ہیں اگر بنام دین بے راہ رویاں ہوئی ہیں اور بنام دین تفرقے پڑے ہیں تو اس وجہ سے اصل دین فنا کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ اگر نگاہ نے غلط چیز کو یاقوت سمجھ کر لے لیا ہے تو یاقوت کو کوسنے نہ دیجئے بلکہ اپنی نگاہ کو کوسنے دیجئے کہ اس نے دھوکا کھایا۔ اسی طرح بنام دین اگر آپ غلط نتائج کو اختیار کریں اور مشاہدہ کریں اور خود بھی اس میں پڑ جائیں اور مصیبت اٹھائیں تو اصل دین پر تو حرف نہیں آئیگا اگر آپ کو دھوکہ ہوا ہے تو کوشش کیجئے کہ نگاہِ امتیاز میں قوت پیدا ہو اسی طرح اگر غلط دین کے نعرہ سے آپ کبھی گمراہی میں پڑے ہیں تو اپنی بصیرت کو قوت دیجئے۔
تاکہ صحیح دین اور غلط دین میں امتیاز ہو سکے۔ اسی لئے تحقیق واجب ہے اور سُنی سنائی باتوں پر عمل درست نہیں ہے بلکہ خود دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ سچی بات ہے یا جھوٹی بات ہے۔ یہ راستہ صحیح ہے یا غلط ہے تو اگر تحقیق نظر سچے راستے کو بتائے تو پھر آپ کا فریضہ یہ ہوگا کہ جس کو آپ سچا سمجھتے ہیں اسکو اختیار کیجئے۔ لیکن جسکو آپ سچا سمجھتے ہیں اس میں دیکھئے کہ وہ خطرے تو نہیں ہیں۔ حقیقت میں آپ یوں کہیئے کہ دنیا والے جو دین کے خلاف بات کرتے ہیں کہ ایک دین ہوتا تو اختیار بھی کر لیتے دین تو اتنے زیادہ ہیں، تو کوئی اس جھگڑے میں کیوں پڑے تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ کا یہ اُصول ہو کہ جب

کوئی دوراہا آئے تو گھر واپس آجایا کیجئے تو پھر ٹھیک ہے آپ کا یہی طریقہ ہے آپ سٹیشن پر گئے اور دیکھا کہ دو پلیٹ فارموں پر دو گاڑیاں کھڑی ہیں کہنے لگے کہ ایک گاڑی ہوتی تو اس میں بیٹھ بھی جاتے۔ اب دو گاڑیاں ہیں تو کون اس جھگڑے میں پڑے لہٰذا واپس چلے جائیں تو پھر ہر شعبۂ زندگی میں پابند ہو جئے بچہ بیمار ہو تو کہیئے کہ شہر میں ایک ڈاکٹر ہوتا تو خیر علاج کر بھی لیتے اب اتنے ڈاکٹر ہیں کوئی کسی کو اچھا کہتا ہے کوئی کسی کو اچھا کہتا ہے تو بچہ بلا سے مر جائے میں اس جھگڑے میں نہیں پڑتا تو پھر اب کسی چیز میں تخصیص نہیں رہ جائے گی۔ لباس سب ایک پہنتے ہوتے تو خیر کچھ پہن لیتے لیکن جب لباس اتنی قسم کے ہوں تو کون اس جھگڑے میں پڑے لہٰذا لباس فطرت ہی بہتر ہے۔ ترقی یافتہ دور میں کچھ جماعتیں ایسی ہیں اس بنا پر آپ اس اصول کے پابند ہو جئے۔ لیکن لباس سے فارغ ہو جانا تو آسان ہے ایک اور مصیبت بھی تو ہے کہ سب یکساں غذا کب کھاتے ہیں۔ ایک کوئی غذا پسند کرتا ہے دوسرا کوئی اور غذا پسند کرتا ہے تو پھر آپ کہیئے کہ ہم اس جھگڑے میں کیوں پڑیں پھر نظری اختلافات موجود ہیں۔ صرف عملی اختلافات ہی نہیں ہیں کوئی ایک غذا کو صحیح سمجھتا ہے کوئی اس غذا کو غلط سمجھتا ہے۔ کچھ سبزی خور ہیں کچھ غیر سبزی خور ہیں۔ غذاؤں میں مذہبوں کا اختلاف ہے نظریات کا اختلاف ہے تو اب کہیئے کہ ان جھگڑوں میں کون پڑے۔ لہٰذا کچھ نہ کھائیں گے صرف ہوا ہی کھائیں گے مگر اس اصول کو بنا کر پھر زندہ رہ کر دکھایئے تو میں جانوں۔ لاکھ قسم کی غذائیں ہوں آپ خود غور کیجئے کہ آپ کے لئے کونسی غذا مناسب ہے کونسی آپ کے لئے خوشگوار ہے اور کونسی آپ کے لئے ناگوار ہے۔ آپ اس غذا کو اختیار کیجئے کہ جو آپ کے لئے خوشگوار ہے۔ وہ جو پلیٹ فارم پر گاڑیاں کھڑی ہیں۔ تو جو واقف راہ ہوں اور جو اس اسٹیشن سے باخبر ہوں۔ ان لوگوں سے پوچھیئے کہ

ہماری منزل کو لے جانے والی گاڑی کونسی ہے۔ یاد رکھئے آپ نے پُوچھا اور کسی نے اتفاق سے غلط بتا دیا تو پھر آپ موردِ الزام نہیں ہوں گے اس لئے کہ آپ نے جو امکانی طور پر ممکن تحقیق تھی وہ کرلی۔ لیکن اگر آپ نے دریافت کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اور واپس آ گئے تو آپ گمراہ بھی ہوتے اور موردِ الزام بھی۔ بس یونہی سمجھ لیجئے کہ راہ تحقیق میں قدم زنی کیجئے۔ اپنے امکان بھر۔ تن آسانی کا محاورہ ہے ذہن انسانی کا نہیں ہے کہ میں کیا کروں۔ ذہنی کاہلی سے کام نہ لیجئے کہ بس تحقیق کا شگون پُورا کر دیجئے۔ جی نہیں۔ واقعی امکانی جدوجہد کیجئے۔ راہِ حق میں قدم زنی کیجئے۔ دریافت کیجئے۔ تو پھر اگر آپ راہِ تحقیق میں منزل تک پہنچے بغیر دُنیا سے اُٹھ گئے تو میرے نزدیک خدا عادل ہے۔ اگر اس کے علم میں آپ نے تحقیق میں امکانی کوتاہی نہیں کی ہے تو پھر وہ آپکو گمراہی کی سزا نہیں دیگا لیکن آپکا فریضہ تو ادا ہو جائیگا۔ پھر آپ موردِ الزام عقلاً نہیں ہوں گے اُرے عقلاً تو بہت سے مواقع پر عقل سے کام نہیں لیتے آپ موردِ الزام عقل نہیں ہوں گے اور دُنیا کے علاوہ آخرت جس کے ہاتھ میں ہے وہ بھی آپ کو سزا نہیں دے گا۔ کیونکہ جس حد تک آپ پہنچ سکتے تھے اس حد تک تو آپ نے کوشش کی۔ اب اس کے بعد راہ طلب میں دُنیا سے اگر آپ اٹھ گئے تو یہ نادانستہ آپ کے امکان سے باہر ایک نتیجہ جو ہے کہ آپ منزل تک نہیں پہنچ سکے۔ اگر یہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آپ تھک کر بیٹھ رہے تو منزل پر نہ پہنچنا یقینی ہے لیکن اگر تحقیق کرتے کرتے اُٹھ گئے تو امکان تو تھا منزل پر پہنچنے کا۔ اس لئے یہی اصُول ہے کہ علاج کیا اور طبیب صحیح دوا نہ دے سکا۔ تو یہ آپ کی عملی کوتاہی نہیں ہے۔ لہٰذا آپ موردِ الزام نہ ہوں گے۔ لیکن اگر دوا نہ دی اور مریض مر گیا تو آپ موردِ الزام ہونگے بہر حال راہ حق تک پہنچنے کے لئے انسان کے

واسطے ایک رہنما خود ذاتی طور پر عقل کو قرار دیا کہ عقل سے کام لو اس کے بعد باہر سے سہارہ معلّمین نے دیا۔ کیونکہ جو باتیں عقل نہیں سمجھ سکتی تھی ان میں ان معلّمین کا کام تھا بتانا اور جو باتیں عقل سمجھ سکتی تھی مگر روایات قدیمہ کے بوجھ کی وجہ سے آنکھیں نہ کھلتی تھیں اور تقلید آباؤ اجداد کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتا تھا تو وہاں ان معلّمین نے یہ کام کیا کہ عقل کے فیصلے کی دبی ہوئی چنگاری کو اوہام کے خاکستر سے نکال کر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اسے حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب نے انبیاء و مرسلین کے فرائض اور ان کے کارنامہ کو بیان کرتے ہوئے اپنے بلیغ انداز میں ارشاد فرمایا ہے۔ لیثیروا دفائن العقول۔ یعنی خالق نے انکو بھیجا تاکہ عقل کے دبے فینے جنکے اوپر انبار ہے۔ توہمات وتقلیدات کا۔ اس انبار کو ہٹا کر ان دفینوں کو ابھار کر دنیا کے سامنے پیش کر دیں اس لئے حقیقی عقل اور انکی تعلیم کا کبھی کہیں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت میں ناقص عقلیں ہیں جن کی وجہ سے ٹکراو ہوتا ہے۔ یعنی یہ عقل میں آتا نہیں ہے یہ نہیں کہ اختلاف عقل ہے یہ عقل میں نہ آنا اس شخص کی کوتاہی کی وجہ سے ہے جسکی عقل کامل درجہ پر نہیں ہے اس بنا پر عقل میں نہیں آتا۔ ورنہ جو حقیقی رہنما تھے ان کا ہر فیصلہ صحیح ہے اور اگر عقل خالص عقل ہو تو وہی کہے گی کلما حکم بہ العقل حکم بہ الشرع وکلما حکم بہ الشرع حکم بہ العقل۔ جو شریعت کا فیصلہ ہو حقیقت میں عقل کا فیصلہ بھی وہی ہے اور جو عقل کا فیصلہ ہو حقیقت میں شرع کا فیصلہ بھی وہی ہے۔ مگر اس کے لئے رہنما بھی وہی ہونے چاہیئے تھے کہ جو خالق کی طرف سے عقل کامل لے کر آئیں اور جن میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ اب وہ ایک نقص جو اخلاق اور قانون میں بھی تھا یعنی ان کے ساتھ ایسے افراد نہیں ہیں کہ جو خود مثال یا نمونہ بن سکیں۔ دین کے ساتھ وہ اشخاص و افراد وابستہ کیئے گئے کہ جو خود نمونہ بن سکیں۔ لفظی تعلیم بعد میں آئی اور معلّم پہلے بھیجا گیا یعنی جو معلّم ہے

وہ جب چالیس برس کی عمر کا ہے تب مامور ہوتا ہے قرآن کو پہنچانے پر۔ یعنی چالیس برس تک معلّم موجود ہے صاحب کتاب حامل کتاب۔ مگر کتاب خلق خدا تک نہیں پہنچتی ہے۔ وہ معلّم کون ہے بحمداللہ بلا تفریق فرقہ تمام مسلمان اسکو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی وہ ہمارے رسول ختمی مرتبت محمد مصطفےٰ اور تاریخ کی بدیہی بات ہے کہ آنحضرتؐ چالیس برس کی عمر میں مبعوث برسالت ہوئے اور مبعوث برسالت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن اُترنا شروع ہوا اور سب سے پہلے سورہ اقرأ نازل ہوا۔ یہی سورہ اقراء بعثت کا اقرار ہے۔ دُنیا والے سب بعثت کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ سورہ اقراء اترا۔ میرے نزدیک اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو منصب رسالت اس دن مِلا۔ بہر حال دعویٰ رسالت پر سرکار نبوّت اسی دن مامور ہوتے۔ میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہوئے کہ چالیس برس تک رہنما موجود ہے مگر کتاب موجود نہیں ہے۔ رہنما چالیس برس پہلے آیا ہے اور کتاب چالیس برس بعد ہے۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کو رہنما بغیر کتاب ہونا گوارہ ہے مگر کتاب کا بغیر رہنما ہونا گوارہ نہیں ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ سُنّت الٰہیہ کی رُو سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ناطق رہنما کا وجود اگر ہے اسکی پیروی اگر ہے اسکا نقش قدم اگر ہے خلق خدا کے مرکز اتباع بنانے کے لئے تو اسے از روئے عمل الٰہی کہا جا سکتا ہے کہ کافی ہے مگر اسکو چھوڑ کر کتاب کو کبھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کافی ہے

اور میں کہتا ہوں کہ کتاب کو کافی کہنا خود کتابِ خدا کے خلاف ہے کیونکہ ارشاد ربّانی ہے ھوا لذی بعث فی الامیین رسولاً منہم یتلوا علیہم ایتہ۔ وہ وہی ذات ہے جس نے ام قریٰ کے رہنے والوں میں ایک رسول مبعوث کیا تاکہ وہ اسکی آیات پڑھے۔ اگر یہ کافی ہوتا تو فرائض رسالت اسی آیت پر ختم ہو جاتے مگر یہ ناکافی

تھا تبھی تو اور کام بتلائے کہ یزکیھم و یعلمھم الکتاب و الحکمۃ جو ان کے نفوس کی اصلاح بھی کرتا ہے اور انہیں تعلیم کتاب بھی دیتا ہے اور انہیں تعلیم حکمت بھی دیتا ہے۔ اس دور میں جبکہ بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں کہا گیا ہے کہ ماخذ دین کے لئے ہمیں کتاب کافی ہے اور سنّتِ رسولؐ کی ضرورت نہیں بس کتاب ہونی چاہیئے۔ یہ جو مسلمان کہتے ہیں کتاب و سنّت تو کتاب ٹھیک ہے مگر سنّت کو مرکزِ دین بتانا یہ غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کتاب کافی ہوتی تو یتلوا علیھم ایٰتہٖ کافی تھا اس کے بعد یزکیھم ہے معلوم ہوتا ہے یہ کتاب کے حدود میں سے نہیں ہے بلکہ ان کے عمل سے ہے۔ اب جو کتاب کی تعلیم ہے۔ وہ الفاظِ قرآن جنکی تلاوت ہو رہی ہے وہ تو ہے کتاب اس کے آگے جو ہے وہ سنّت ہے کتاب نہیں۔ اور حکمت کی تعلیم جن الفاظ میں دیں گے وہ کتاب نہیں ہے وہ سنّت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یتلوا علیھم تو کتاب ہے اور اس کے آگے جو ہے۔ وہ سنّت ہے۔ تو اب ہیئے تلاوتِ قرآن پہلا کام ہے۔ تزکیہ دُوسرا کام ہے۔ تعلیم کتاب تیسرا کام ہے اور تعلیم حکمت چوتھا کام ہے۔ تو اگر کتاب کو لے لیا اور سُنّت کو چھوڑ دیا تو چوتھائی دین ملا۔ تین حصّے دین کے ہاتھ سے نکل گئے۔ تو یہ تو اس کے فرائض سپرد کرنے سے ظاہر ہے کہ کتاب کافی نہیں ہے اور پھر کتاب خود کہہ رہی ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللہُ۔ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرےگا اگر خدا کے نزدیک کتاب کافی ہوتی تو قرآن میں رسول سے "میرا اتباع کرو" کہلوانے کی بجائے "قرآن پڑھتے رہو" کا حکم ہوتا مگر قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے نقشِ قدم پر چلو (یعنی رسولؐ کے نقشِ قدم پر) معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ وہاں قرآن کی بات ہے اور یہاں نقشِ قدم کی بات ہے تو کسی کے جذبہ

عقیدت کو ٹھیس لگے گی میں کہتا ہوں کہ ذرا بار معلوم ہوگا مگر چونکہ از روئے قرآن حقیقت ہے تو کیا عرض کروں کہ جو ان کے نقشِ قدم میں ہے وہ قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں ہے مگر اسی طرح کہ وہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور جان سکتے ہیں۔ ہمیں قرآن میں وہ نظر نہیں آئے گا جو ان کے نقشِ قدم میں ہے اگر قرآن کو حفظ کر لیں اور عمر بھر وظیفہ کے طور پر پڑھتے رہیں۔ قُلْ ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی۔ قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی۔ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو بے سوچے سمجھے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ سمجھ کے پڑھئے ترجمہ اسکا اُردو میں کہیئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے نقشِ قدم پر چلو۔ اسکو دہرایئے آپ عربی نہیں سمجھتے تو اُردو میں دہرایئے کسی اور زبان میں جو آپ جانتے ہوں۔ پشتو میں سندھی میں یا پنجابی میں دہرایئے کسی زبان میں اسکا ترجمہ یاد کر لیجئے لاکھ دفعہ عمر میں جتنی وہ وفا کرے اتنی دفعہ دہراتے رہیئے مگر نقش قدم کو ایک مرتبہ بھی نہ دیکھئے تو بتایئے آیت یا اس کا ترجمہ منزل تک پہنچا دے گا لیکن اگر قرآن کے حکم کو ایک دفعہ سُن کر نقش قدم پر نظر جما دی تو پھر محویت کے عالم میں چاہے ان لفظوں کو بھول بھی جائیں مگر نقشِ قدم منزل تک پہنچا دے گا۔

اب رسول جب دنیا میں موجود ہیں اور قرآن پڑھ رہے ہیں اور قرآن سُنا رہے ہیں اور یہ آیت سُنا رہے ہیں اس کے معنی یہی ہیں کہ قرآن کی رہنمائی انہی کے لب سے مِل رہی ہے کہ تم ان کے نقشِ قدم پر چلو۔ اس دوران میں بے شک اس (قرآن) نے اپنا کام کر لیا کہ رہنما کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا۔ اس کا کام ہے منزل تک پہنچنے کا سامان کر دینا۔ ایک رہنما کی طرف اشارہ کر کے بتا دیا کہ اس کے نقشِ قدم پر چلو۔ اب یہ اس وقت دو ہیں۔ ایک رہنما قرآن ہے اور ایک خود رسول۔ میں کہتا ہوں جیسے بعد میں نعرہ لگاتا ہو وہ آخر وقت کیوں لگائے

پہلے ہی نعرہ لگا دے کہ ہمارے لئے کتاب کافی ہے۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہمیں رسول کی ضرورت نہیں ہے۔ اب سمجھ کر نعرہ لگائیے اسلام کو سنبھالتے ہوئے اس وقت قرآن کو کافی کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں رسول کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اب واقعی مسلمان چاہیے صرف اسلام کی روشنی میں بحث کریں وہ ان کے ناموس رسالت کی حفاظت کے ماتحت ہے کہ اس وقت قرآن کافی ہے یا نہیں۔ مگر اسلام کے زیرِ سایہ جو اختلافات ہیں اصول میں۔ اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ بحثیں رسولؐ کے بعد پیدا ہوئی ہیں اور اب یہاں رسالت ہی کی بات آ گئی تو سب مسلمان مل کر یہ بحث کریں گے کہ قرآن کافی ہے یا نہیں۔ لیکن قرآن نے رسول کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا اب اگر رسول نے دنیا سے جاتے وقت اور رہنمائی کے ہاتھوں میں ہاتھ پکڑا دیئے تو اب یہ کہنا قرآن کافی ہے سمجھ میں نہیں آتا میں کہتا ہوں اگر کافی تھا تو اتنے دن کیوں کافی نہ ہوا۔ اگر کافی تھا تو قرآن تو وہی ہے۔ رسولؐ کی ضرورت نہیں تھی۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس وقت بھی قرآن اکیلا نہیں ہے دو ہیں ایک قرآن اور ایک خود رسول ہیں۔ اب دُنیا سے اُٹھتے وقت پیغمبر فرما رہے ہیں کہ انی تارك فیکم الثقلین میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور ایک میری عترت جو میرے اہلِ بیت ہیں۔ میں کہتا ہوں دُنیا ذرا غور کرے عقل کی آنکھوں سے کہ پیغمبر کا اصل اعلان کیا ہے اور کِس کے لئے ہے تو کہا جائے گا دو چیزوں کے متعلق کہہ رہے ہیں ایک قرآن اور ایک اہل بیت دو چیزوں کو فرما رہے ہیں۔ دو چیزوں کے متعلق اعلان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پھر غور کر کے دیکھئے کہ اصل اعلان کیا ہے۔ کہنے لگیں گے کہ آپکے سوال کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا میں کہتا ہوں کہ آپ جو فرما رہے ہیں کہ دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک قرآن اور ایک اہل بیت تو اسکا مطلب یہ ہے کہ

دیکھو اب تک تو قرآن کے ساتھ میں ہوں لیکن جب میں دُنیا سے اُٹھ جاؤں تب بھی قرآن کو اکیلا نہ سمجھنا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس وقت ہدایت کی دو کرُسیاں بچھی ہوئی ہیں ایک پر ہے قرآن اور ایک پر خود رسول ہیں۔ وہ کرُسی جس پر قرآن ہے وہ خالی نہیں ہو رہی ہے وہ کرسی جس پر رسول ہیں وہ نگاہ ظاہر میں آپ کی وفات کے وقت سے خالی ہو رہی ہے تو رسول فرما رہے ہیں کہ میرے بعد یہ دو ہیں یعنی اب بھی اس کرُسی کو خالی نہ سمجھنا اب تک اس کرُسی پر میں تھا اور اب میرے بعد میرے اہل بیت ہیں۔ اب دُنیا سے میرا سوال یہ ہے کہ غور کیجیئے کہ قرآن تو اپنی جگہ پر ہے اب رسول کی جگہ کون ہوا رسول فرما رہے ہیں کہ اب تک میں تھا یعنی قرآن اب بھی کافی نہ تھا اور میرے بعد میرے اہل بیت ہیں۔ اب یہ کہنا کہ قرآن کافی ہے جیسے قرآن تھا اور میں تھا اب قرآن ہے اور میرے اہل بیت ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ کوئی جملہ بعض لحاظ سے درست ہوتا ہے بعض لحاظ سے غلط ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں بھی کسی وقت کسی لحاظ سے نعرہ لگا سکتا ہوں کہ قرآن کافی ہے مگر ہر چیز کا کافی ہونا اسکی جنس میں ہوتا ہے میں اگر صبح کو بوقت ناشتہ یہ کہوں کہ ایک پیالی چائے کافی ہے اور کسی نے دُوسری پیالی بڑھائی میں نے کہا کافی ہے۔ اب دوپہر کا وقت آیا۔ کھانا بھی غائب۔ بھائی وہ کس لئے کہ آپ ہی نے تو فرمایا تھا کافی ہے سونے کا وقت آتے تو بستر بھی نہ ہو کہیں کہ آپ نے فرمایا تھا کافی ہے۔ کافی نہ ہوا مصیبت ہو گیا۔ بے شک چائے کافی تھی مگر اس کے معنی یہ تھے کہ اور چائے کی ضرورت نہ تھی یہ معنی نہیں تھے کہ اب کھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور یہ معنی بھی نہیں تھے کہ اب اوڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تو اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ قرآن کافی ہے یعنی اب توریت کی ضرورت نہیں ہے انجیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی آپ کی بنائی ہوئی کتاب

کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہ ناطق رہنما کی ضرورت نہیں ہے مثال عمل کی ضرورت نہیں ہے یہ نہ اسوقت کافی تھا نہ اس وقت کافی ہے اب پیغمبر خدا صلعم فرما رہے ہیں کہ میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں یعنی ابھی تک تو فرد ہے۔ فرد ایک ہوتی ہے۔ بس جتنی عمر بھی اللہ کی طرف سے ہو۔ اتنی عمر پوری ہو جائے گی تو وہ تمہارے سامنے سے اُٹھ جائے گا۔ مگر میرے بعد ایک سلسلہ ہے۔ اہل بیت کسی ایک آدمی کا نام نہیں۔ عترت کسی ایک فرد کا نام نہیں۔ یہ ایک سلسلہ ہے۔ اہل بیت میں ہر فرد کو اس معیار پر ہونا چاہیئے کہ جو قرآن کا ساتھی بن سکے اور اس کے بعد یہ فرما دیا لن یفترقا۔ ان میں کبھی تفرقہ نہیں ہوگا اور یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کسی طرف لے جائے اور اہل بیت دوسری طرف لے جائیں مقام رہنمائی میں تفرقہ نہیں ہو سکتی اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ قرآن رہے اور اس سلسلہ کی کوئی فرد نہ رہے۔ جب تک قرآن ہے اس وقت تک ان افراد کا سلسلہ موجود رہے گا اور میں کہتا ہوں کہ اس سلسلہ سے متعارف کروانا فریضہ رسالت تھا اس لئے کہ اگر انکی رسالت فقط اپنی زندگی بھر کے لئے ہوتی تو دُنیا کو لاوارث چھوڑ کر چلے جاتے اور یہ خیال فرما لیتے کہ میرا کام اپنی زندگی بھر ہدایت کرنا تھا وہ میں کر چکا۔ اب مجھے کیا مطلب۔ مگر یہ اس وقت ہوتا جب پیغمبر کی رسالت عین حیات ہوتی یعنی بس اس زندگی بھر کے لئے آپ رسول ہوتے لیکن یہ تو ہر نقطۂ نظر کا مسلمان ماننے پر مجبور ہے کہ رسول کی رسالت اس عمر سے وابستہ نہیں تھی اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عمر رسول ہے بہ حیثیتِ بشر اور ایک عمر رسول ہے بحیثیتِ رسول۔ وہ عمر جو بحیثیت بشر ہے وہ تو صرف تریسٹھ برس اور بعثت کے بعد صرف تیئس برس اور ایک عمر رسول بہ حیثیت رسول ہے وہ ہے تا قیام قیامت اور یہ میں نے محدود محاورے کے ماتحت کہا کہ تا قیامِ قیامت ورنہ کون کہتا ہے کہ قیامت کے

آنے سے آپ کی رسالت ختم ہوجائے گی۔ اگر قیامت کے آنے سے رسالت ختم ہو تو پھر شفاعت کس اعتبار سے ہے تو جسکی لامحدود رسالت ہو اس کا کام بس اس زندگی سے وابستہ نہیں ہے جو اس دار دُنیا میں لوگوں کے سامنے ہے اسکا کام تاقیام قیامت ہے اس جہت سے کہ جن کا کام ہدایت حاصل کرنا ہے قیام قیامت تک حاصل کرسکتے ہیں۔ تو جب ہدایت قیامت تک ہے تو ان کو انتظام قیامت تک کاکرکے جانا ہے اگر یہ جانا بھی چاہیں بالفرض تو مسلمانوں کو دامن پکڑ کر پوچھنے کا حق ہے کہ اپنے بعد کا انتظام بھی تو بتاجایئے کہ آپ کے بعد کیا ہوگا تو . . .

اب کوئی ضعیف روایت بھی نہ بتلائے کہ یہی دلیل ہے کہ رسالت مآب نے بتایا۔ اب بتایئے کہ کیا بتایا یا جو میں بتادوں وہ مان لیجئے۔ بلا فصل جو تھا اسکا نام لے لیکر بتایا اور کبھی بعد کا جو سلسلہ تھا قیامت تک جانے والا ان کے نام لے لے کر بتلایا اس سلسلہ میں کی جو پہلی کڑی تھی اور آپ کے بعد بلا فاصلہ ہونے والی تھی اسکا تعارف عمر بھر کرایا۔ مگر چونکہ جانتے تھے کہ دنیا اسے بھول جائے گی اور بھولنے پر مصر رہیگی لہٰذا اتمام حجت کے لئے ان کے متعلق طرح طرح سے عمر بھر بتلایا اور اتمام حجت اس بڑے اجماع میں بھی کیا کہ جس سے بڑا مجمع رسول کی زندگی میں کبھی نہیں ہوا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ یہ ایک متفقہ تاریخی حقیقت ہے کہ غدیر خم میں جتنے بڑے مجمع میں پیغمبر نے خطبہ پڑھا اتنے بڑے اجتماع کے سامنے رسول اس سے قبل اپنی زندگی میں بھی نہیں گئے تھے۔ تو میں کہتا ہوں مسلمانو! سیرۃ النبی کے ایک واقعہ کی حیثیت سے اس خطبہ کو یاد رکھو اس موقع پر قدرت نے کچھ اسباب اس طرح فراہم کردیئے کہ بھولنے والا بھولنا بھی چاہے تو نہ بھول سکے بلکہ انتہائی بھول جس پر غالب ہو وہ بھی نہ بھول سکے کیونکہ بہت سی غیر معمولی باتیں اس دن پیش آئیں مثلاً جانے والے آگے بڑھ گئے اور جو رہ گئے تھے وہ پیچھے رہے

ایسے موقع پر رواں سفر کو روکنا ہی یاد رکھنے کی بات ہے جو آگے بڑھ گئے تھے ان کو پیچھے بُلانا یہ ان کے یاد رکھنے کی بات ہے۔ جو پیچھے رہ گئے تھے انہیں تیز رفتاری سے بلانا یہ اُن کے یاد رکھنے کی بات ہے جس موقع پر یہ خطبہ دیا گیا دھندلکا نہیں تھا۔ آفتاب نیم روز میں یہ اجتماع بہم پہنچا۔ تاکہ کسی جانب سے کمزوری نظر کی شکایت نہ ہونے پائے اور پھر ایک غیر معمولی بات کہ نئے قسم کا ممبر بھی یاد رہے اور اسکے بعد یہ واقعہ کہ ہمیشہ منبر پر تنہا جاتے تھے مگر آج ایک فرد کو منبر کے قریب زینے پر بٹھا لیا ہے۔ خطبہ وہ چند جملے ہی نہیں ہیں کافی طولانی ہے تمہید کے ساتھ ہے تو میں کہتا ہوں کہ دُنیا اتنے غور سے خطبہ نہیں سُن رہی ہے جتنے غور سے بار بار یہ دیکھ رہی ہے کہ آج یہ کیوں بیٹھے ہیں۔ آج کوئی خاص بات ہے۔ یہ یہاں کیوں بیٹھے ہیں نفسیاتی طور پر ان کا چہرہ زیادہ دیکھ رہے ہیں اور خطبہ کی طرف لازماً توجہ کم ہے یعنی جس نیت سے بھی سہی عبادت بہت خلوص سے ہو رہی ہے اور جب وہ وقت آیا کہ جس مقصد سے بٹھا رکھا تھا اور وہ جُملے رسول فرمائیں گے۔ تو کیا کیا۔ اب رسول نے امیرالمومنین کو ہاتھوں پر بلند کیا۔ بچپنے میں ہاتھوں پر بلند کیا ہی کرتے تھے مگر میں کہتا ہوں کہ دُنیا رسول کی قوت کو دیکھے کہ جو خیبر کے در کو سنبھال چکا ہو آج اسکو رسول سنبھالے ہوئے ہیں۔ پیغمبر خدا صلعم نے انکو اُٹھا کر مجمع کے سامنے پیش کیا۔ ذرا نگاہ صادق سے دیکھئے۔ کوئی بچہ ہو اسکا قد و قامت مختصر ہوتا ہے اس لئے وہ کسی کے اتنے ہی حصہ جسم کو چھپائے گا لیکن پوری عمر کے انسان کو کوئی بلند کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود پورا حجاب میں آگیا۔ میں کہتا ہوں کہ نور حجاب نور میں ہو گیا۔ میں کہتا ہوں کہ رسول کا جو کچھ کہنے کا مقصد ہے بغیر لفظوں کو استعمال کئے رسول عملاً اسکو دکھلا رہے ہیں۔ خود پیچھے ہیں اور ایک آگے ہے مطلب یہ ہے کہ جب میں نہ ہوں تو یہ ہے اور اب خالق یہ ارشاد فرما رہا ہے

الیوم اکملت لکم دینکم۔ آج میں نے تمہارے دین کو مکمّل کیا۔ اس اعلان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ رسول نے تبلیغ میں کسی قسم کی کوتاہی کی تھی۔ نہیں رسول کو جو پیغام پہنچانے تھے وہ انہوں نے سب پہنچا دیئے تھے مگر مقصد خالق یہ ہے کہ یہ جو تم نے تبلیغ کی ہے گویا قیامت تک کا انتظام کر دیا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو پھر تریسٹھ برس دُنیا کے لحاظ سے ہیں ہی کیا۔ تو اگر یہ نہ کرتے تو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب دنیا اس جُملہ پر غور کرے اور فیصلہ خود کرے کہ جو تبلیغ ایسی ہو کہ بغیر اس کے پہنچائے ہوتے تمام احکامِ خدا پہنچا دینے کے باوجود کارِ رسالت نہ پہنچانے کے برابر متصوّر ہو سکتا ہو تو پھر بغیر اس کے مانے ہوئے ہمارا ایمان کیا رہے گا۔ اور یہ تو اس کڑی کا تعارف تھا جو اس اہتمام سے ہوا اس کے بعد یہ بھی خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ انی تارک فیکم الثقلین یعنی میں تم میں ایک سلسلہ اپنے خلفاء کا چھوڑے جا رہا ہوں اور دُوسری جگہ تعداد بھی بتا دی کہ بارہ ہونگے۔ دنیا والوں نے جس جس طبقہ کو مانا اسمیں گنتی بڑی مشکل ہو گئی کسی صحیح معیار کے مطابق صحیح افراد مقرر ہو گئے تو تعداد چار سے آگے نہ بڑھی اور بغیر کسی صفات کے لحاظ سے مقرر کیا تو نہ جانے کتنے درجن ہوئے۔ بارہ کا عدد کسی طرح پُورا نہیں ہوتا بغیر اس سلسلے کے ماننے کے جو حضرت علی سے لیکر حضرت مہدیؑ تک منتہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو حضرات امامت کو اُن معنوں میں نہیں مانتے جن معنوں میں کہ اہل بیت کے صحیح ماننے والے عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی اب ان بارہ کو مان رہے ہیں اور ان کے متعلق مستقل تصانیف لکھ رہے ہیں۔ لکھنے والوں کے اعتقاد کو آپ اُن کی کتابوں کے ناموں سے سمجھ سکتے ہیں کوئی ان کے حالات میں کتاب لکھتا ہے انہی بارہ اماموں کے حالات پر مشتمل جنہیں ہم امام مانتے ہیں تو اسکا نام رکھتا ہے الفصول المہمۃ فی معرفۃ الائمہ۔ یعنی ائمہ کی معرفت میں

اہم باب۔ یہ کتاب انہی آئمہ کے بارے میں ہے جنکو رسول نے اپنے بارہ خلفا کہہ کر متعارف کرایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کی زبان کو چھوڑ کر یہاں بات کر لی ہے۔ یہ کتاب علامہ ابن صبّاد مالکی نے تحریر فرمائی ہے۔ کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی کی کتاب مطالب السئول فی مناقب آلِ رسول بھی انہی ہستیوں کے حالات میں ہے اسی انداز میں محمد طارقہ بخاری نے کفایت الطالب یعنی متلاشی کے لئے کافی ہوجانے والی کتاب انہی ہستیوں کے تعارف میں تحریر فرمائی ہے اور فرنگی محل لکھنؤ میں ایک دینی مرکز ہے وہاں کے ایک عالم محمد مبین نے ایک کتاب فارسی میں وسیلۃ النجات۔ آخرت میں نجات کا ذریعہ کے نام سے تحریر کی ہے جس سے لکھنے والے کے ضمیر کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ منشی نولکشور کے مطبع میں چھپی تھی۔ اسمیں بھی انہی آئمہ اثنا عشر کے حالات درج ہیں جو رسول کے نائب بزبان رسول رہے ہیں حافظ محب الدّین فرنگی محل لکھنؤ نے بھی ایک کتاب ذخائرالعقبیٰ کے نام سے تحریر کی ہے۔ آخرت میں کام آنے والے ذخیرے۔ اسی قبیل کی ایک کتاب صواعق محرقہ ہے جو علاّمہ ابن حجر مکّی نے تحریر فرمائی ہے اور انہوں نے اسمیں آئمہ اہلبیت کے حالات درج کیئے ہیں۔ رسول نے کہا تھا کہ میرے بعد بارہ امام ہونگے۔ میں دُنیا سے کہتا ہوں کہ کسی خاندان میں اتنے کمالات دیر تک نہیں رہتے مگر ایک صادق ہے جس نے اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بارہ تک کا تعارف کرادیا کہ میرے بعد بارہ ایسے ہونگے اب گیارہ تو آنکھوں کے سامنے آئے اور دُنیا نے دیکھا۔ مطالعہ کی پوُری ذمّہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ چاہے عہدہ مانیں یا نہ مانیں منصب مانیں یا نہ مانیں لیکن جو ہے۔ چاہے اپنے وقت میں علی ابن الحسین ہوں چاہے محمد ابن علی ہوں چاہے پھر جعفر ابن محمد ہوں پورے سلسلہ کے متعلّق ہر دَور میں جو حالات لکھے گا۔ اوصاف سب متفق علیہ ہیں۔ وُہ کہے گا کہ اپنے دَور میں ان سے بڑھ کر

کوئی عابد نہ تھا اپنے دور میں اُن سے بڑھ کر کوئی واعظ نہ تھا۔ اپنے دور میں اُن سے بڑھ کر سخی کوئی نہ تھا جو آد کوئی نہ تھا۔ ان کے علم کے واقعات لکھے گئے عبادت کے واقعات درج ہوئے ان کے صبر کے واقعات قلمبند ہوئے۔ عہدے کا نام لے یا نہ لے مگر کردار جو ہے اوصاف جو ہیں ہر ایک کے مان رہے ہیں میں کہتا ہوں گیارہ تو دنیا کے سامنے آئے برائے خدا انصاف کرو کہ جس سچے کی سچائی گیارہ تک آنکھوں کے سامنے آچکی ہے اب ایک کے لئے اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالتے ہو مگر دُنیا والوں نے کوشش شروع کر دی کہ ہم اس سلسلہ کو رہنے ہی نہیں دیں گے رسول نے فرمایا کہ میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک قرآن اور ایک میری عترت اہلبیت۔ یہ قیامت تک جُدا نہ ہوں گے۔ دُنیا نے کہا کہ رہنے دینا یا نہ رہنے دینا یہ ہمارا کام ہے آپ نے کہا ہے کہ رہیں گے ہم نہیں رہنے دیں گے تو کیسے رہیں گے اس لئے جو آیا اس کو مٹانے کی کوشش کی جو آیا اس کی زندگی کا خاتمہ ظلم وستم کے حربہ سے کیا کربلا میں کونسا دقیقہ اُٹھا رکھا تھا کہ یہ سلسلہ باقی نہ رہے کربلا میں اس سلسلے کی جس کڑی کو باقی رکھنا تھا اسکی حفاظت کا انتظام قدرت نے یہ کیا کہ کربلا کے حالات کو اس سے پردہ میں کر دیا۔ یہاں سب کچھ ہو رہا ہے مگر وہ غش میں ہے میں کہتا ہوں کہ بیماری کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اُن کو لے ہوش کر سکے مگر یہ حکمت الٰہی ہے اور مصلحت باری ہے کہ حالات ان کے سامنے رہیں اور وہ اس فریضہ کو ادا نہ کریں جسکو علی اکبر نے ادا کیا۔ یہ انکی بلندی کردار کے خلاف تھا اس لئے دن بھر اصحاب تک چلے گئے امام زین العابدین بیہوش رہے صرف آپکے غلام ترکی نے آپکو ہوش میں لاکر اذن جہاد طلب کیا پھر بیہوش ہو گئے یہاں تک کہ امام حسینؑ رخصت آخر کے وقت آئے تو ہوش میں لاکر وصیت کی یا انکے استغاثے کے وقت ہوش میں آئے مگر پھر بیہوش ہو گئے۔ خیموں میں کہرام برپا رہا مگر انکو خبر نہ ہوئی کہ کہرام ہے۔

مجلس نہم ۹

اہمیّتِ زکوٰۃ۔ مفہوم قربانی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۔ الخ

ارشاد ہو رہا ہے کہ یقیناً اللہ نے خرید لیا مومنین سے ان کے جان و مال کو اس عوض میں کہ ان کے لئے جنّت ہے کہ وُہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں اور یہ اللہ پر لازمی طور سے وعدہ ہے توریت انجیل اور قرآن سب کتابوں میں اور اللہ سے زیادہ وعدہ کا پُورا کرنے والا اور کون ہے صدق اللّٰہ

اعلان ہو رہا ہے خریداری کا۔ کا ہے کی خریداری۔ نفوس اور اموال کی خریداری۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مال کو بھی ذلیل نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے جس طرح جان کا خریدار وہ ہے اسی طرح مال کا بھی خریدار وہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ جان بھی اس قابل ہو کہ وہ خریدار ہو اور مال بھی اس لائق ہو کہ وہ خریدار ہو۔ کوئی زاہد تارک الدنیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جو کہے کہ مجھے مال کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پیسے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اب ایک تو یہ کہ یہ کہنا صدق دل سے بھی ہے یا نہیں یعنی مال مل سکتا ہو اور پھر کہے کہ ضرورت نہیں ہے تو تو ایک بات ہے بہر حال اگر صدقِ دل سے بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے اسکی ضرورت نہیں ہے تو میں

عرض کرتا ہوں کہ از روئے قرآن مجید یہ کوئی صحیح بات نہیں ہے کہ مال کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر خالق کی نگاہ میں انسان کی مثالی زندگی یہی ہوتی کہ مال اس کے پاس ہو ہی نہیں تو قرآن مجید میں ہر جگہ یقیمون الصّلوٰۃ کے بعد یوتون الزکوٰۃ نہ ہوتا۔ حالانکہ ہم قرآن مجید میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں جہاں جس جس انداز میں صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ زیادہ تر اسی انداز میں اس کے ساتھ۔ اگر اقاموا الصلوٰۃ مدح کے طور پر ہے فعل کے ساتھ تو اس کے ساتھ واتوا الزکوٰۃ ہے۔ یا مقیمون الصلوٰۃ ہے تو اس کے ساتھ معطون الزکوٰۃ ہے۔ تو جہاں جہاں صلوٰۃ کا ذکر وہاں وہاں زکوٰۃ کا ذکر۔ ماشاءاللہ یہاں کا تو حال معلوم نہیں مگر ہندوستان میں تو میں اپنی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ نماز تو ہر آدمی پر واجب ہے لیکن زکوٰۃ جن پر واجب ہے انکو میں پوری مردم شماری کے لحاظ سے تناسب قائم کروں تو فیصدی میں کوئی نہ نکال سکوں۔ فی ہزار نکالوں کوئی عدد۔ تو اگر معاشرہ ایسا ہو کہ ہزار میں دس کے پاس اتنا ہو کہ اس کے لئے شرائط زکوٰۃ حاصل ہوں تو بلاغت قرآن کے خلاف ہے۔ کہ ہر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا نام لے۔ اگر فرض کیجئے کہ سو جگہ صلوٰۃ کا ذکر ہوتا تو دو ایک جگہ زکوٰۃ کا ذکر ہو جاتا کیونکہ یہ ہر ایک کی ضرورت کی چیز نہیں ہے۔ شاذ و نادر کوئی ایک ہیں کہ جن پر زکوٰۃ واجب ہو۔ تو ان کے لئے ایک دو جگہ حکم آ جاتا لیکن یہ کہ ہر جگہ جہاں صلوٰۃ کا ذکر وہاں زکوٰۃ کا ذکر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کی نظر میں۔ یعنی اسلام جس معاشرہ کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا وہ کوئی قلاش معاشرہ نہیں تھا وہ مفلوک الحال معاشرہ نہیں تھا وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں ہر شخص پر جس طرح صلوٰۃ واجب ہے اس طرح زکوٰۃ واجب ہے۔ یہاں تک کہ جنکی ہمارے نزدیک ترک دُنیا کی سب سے بڑی مثال ہے یعنی حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ ان کے بارے میں وسائل الشیعہ جو حدیث کی ایک معتبر کتاب ہے۔

ہماری کتابوں میں سے۔ اجازات جو علما کے ہوتے ہیں ان میں جن کتب حدیث کا نام لیا جاتا ہے کہ انکی بھی ہم نے اجازت دی احادیث کی روایت کی۔ ان میں متقدمین کی کتابیں ہیں کافی اور تہذیب۔ من لا یحضر اور استبصار۔ اسی طرح بعد کے علما کی جو کتابیں ہیں ان میں وسائل الشیعہ بھی شیخ حر عاملی کی ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے احادیث امامیہ جمع کی ہیں تو وسائل الشیعہ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت علی نے اپنی قوت بازو کی کمائی سے چار سو غلام راہِ خدا میں آزاد کیئے۔ اب اس زمانے میں کتنی ہی کم قیمت فرض کیجئے غلام کی۔ لیکن پھر بھی چار سو غلاموں کے لئے ظاہر ہے کہ زر خطیر کی ضرورت ہے مگر یہ کہہ دیا گیا کہ جتنے بھی غلام خرید کئے گئے وہ اپنی ذاتی محنت کے پیسے سے خرید کر آزاد کیئے۔ صلوٰۃ

تو معلوم یہ ہوا کہ مال پیشِ خدا اتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا برابر سے دونوں چیزوں کو کہ جان کا بھی وہ خریدار اور مال کا بھی وہ خریدار۔ لیکن اب ایک خاص چیز سوچنے اور سمجھنے کی جو اس آیت میں مجھے محسوس ہوتی ہے کہ اس پر تبصرہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ خریداری کا درجہ فروخت کے بعد ہے اور فروخت کرنا بندوں کا کام ہے۔ قرآن مجید میں حکم ہونا چاہیئے تھا کہ تم فروخت کرو۔ جب ہم فروخت کرتے تو وہ ارشاد فرماتا کہ ہم نے خریدا اور پھر وہ اگر حکم دیتا کہ فروخت کرو تو فروخت کرنا نہ کرنا ہمارے اختیار سے وابستہ ہوتا۔ کہا تو اس نے سب سے ہے کہ نماز پڑھو۔ کیا سب نماز پڑھتے ہیں۔ کہا تو اس نے سب سے ہے کہ روزہ رکھو۔ کیا سب روزہ رکھتے ہیں۔ اسکی طرف کا حکم سب کے لئے ہے کہ ایمان لاؤ کیا سب نے ایمان اختیار کیا ہے۔ اسکا حکم ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو کیا سب اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جتنے احکام اسکی طرف سے ہیں وہ تمام احکام ایسے ہیں کہ کچھ اسکی تعمیل کرتے ہیں اور کچھ اسکی

تعمیل نہیں کرتے بلکہ تعمیل کرنے والے کم ہوتے ہیں اور تعمیل نہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ کیوں ہے۔ اس لئے کہ اس نے اطاعت جبری نہیں چاہی تھی اگر جبری اطاعت کرانی ہوتی تو قرآن مجید میں جو یہ کہہ دیا ہے کہ لَوْشَاءَ اگر وہ چاہتا تو لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیْعًا جتنے بھی رُوئے زمین پر ہیں سب ہی ایمان لے آتے۔ اگر وہ چاہتا۔ تو کیا وہ چاہتا نہیں ہے۔ چاہتا ہے مگر یہ چاہتا ہے کہ بندہ ارادۃً ایمان لائے۔ یہ نہیں چاہتا کہ وُہ جبر سے کام لے۔ جبری طور سے یعنی خود مومن بنا دے۔ ایمان کے راستے کا دکھانا اسکا کام ہے اور ایمان کو دِل میں ڈال دینا۔ جبری طور سے یہ اسکا کام نہیں ہے۔ اور یہ تو بہت ہی معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جبر و اختیار کا علم کلام میں۔ اس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس وقت تو میں ایک جملہ کہتا ہوں کہ کافر و نافرمان کا وجود خود دلیل اختیار ہے صلوٰۃ تو اگر وہ جتنے نماز کا حکم دیا روزہ کا حکم دیا اسی طرح حکم دیتا کہ تم فروخت کر دو اپنے جان و مال کو تو پھر ہمارے بس میں ہوتا چاہے فروخت کریں چاہے نہ کریں۔ اگر ہم فروخت کرتے تب وہ قیمت کا اعلان کرتا کہ تم نے اپنا جان و مال فروخت کیا اب میں بتلاتا ہوں کہ اسکی قیمت جنت ہے تاکہ تمہارا جان و مال اس کے قبضہ میں جاتے اور اسکی جنت وقت آنے پر ہمارے قبضہ میں آئے اور اگر ہم فروخت نہ کرتے تو ہماری جان ہمارے پاس اسکی جنت اس کے پاس۔ ہم جا کر جنّت کا کوئی دعویٰ نہ کرتے کیونکہ ہم نے وُہ معاملت ہی نہیں کی جس کی قیمت میں جنت ملتی مگر یہ تو مجھے عجیب بات معلوم ہو رہی ہے کہ ہم سے نہیں کہتا کہ فروخت کرو اور خریداری کا اعلان کئے دیتا ہے جو بعد کی منزل ہوتی ہے اسکا اعلان اور جو قبل کی منزل ہے اسکا ذکر ہی نہیں تو اب یہ کچھ انوکھی بات ہوئی کہ اللہ نے خرید لیا۔ اب ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں تو

مسئلہ حل ہو جائے کہ کن سے خریدا - یہ تو نہیں کہا کہ لوگوں سے خریدا ناس کی لفظ یہاں نہیں ہے- ان اللہ اشتریٰ من الناس - اللہ نے خرید لیا آدمیوں سے یہ نہیں کہا ہے یہ کہا ہے کہ ان اللہ اشتریٰ من المومنین- اللہ نے خرید کیا مومنین سے ان کے جان و مال کو اس بنا پر کہ ان کے لئے جنت ہے- اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت ایمان لاتے اسی وقت ہم نے اپنے جان و مال کو فروخت کر دیا- بس ادھر ہم نے اقرار ایمان کیا اور یہ کہا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں - ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے یہ اقرار کر لیا کہ اب ہمارا مال ہمارا نہیں ہے ہماری جان ہماری نہیں ہے- یہ جان بھی اسکی ہے اور یہ مال بھی اسکا ہے- حقیقت میں جتنی پابندیاں ہیں احکام شریعت کی- وہ تمام پابندیاں اب اس بیع کے تقاضے پر ہیں- ہم نے اپنی جان کو فروخت کر دیا اب وہ ہم سے مطالبہ رکھتا ہے کہ دن میں اتنا وقت تم میرے اس کام میں صرف کرو جسکا نام نماز ہے اور ہم اس پر عمل نہیں کرتے اس کے معنی یہ ہیں کہ اتنی دیر ہم اپنی جان اور اپنے اوقات حیات پر تصرف غاصبانہ کر رہے ہیں- اس نے کہا گیارہ مہینے شوق سے کھانے پینے کی چیزیں کھاؤ لیکن دیکھو ایک مہینے میں اور وہ بھی رات کو نہیں دن کو ہماری طرف سے یہ پابندی ہے کہ ان چیزوں کو استعمال نہ کرو اب یہاں ظاہر ہے جو چیز ہم نے کھائی ہے وہ مال سے خریدی ہے تو وہ مال بھی ملک غیر تھا اسلئے یہ تصرف ناجائز ہوا اور دن بھر جو کام، ہم نے روزے کے تقاضے کے خلاف کئے اور روزہ نہیں رکھا تو وہی بات ہوگئی کہ ہم نے تصرف غاصبانہ کیا- جتنے بھی احکام شرع ہیں وہ اسی کے تحت آتے ہیں- اسی طرح جو محرمات ہیں جو ناجائز چیزیں ہیں- ہمارا اچھے کپڑے پہننا خالق کو ناپسند نہیں ہے وہ کوئی دوسرا دین ہوگا جس میں لٹا پٹا رہنا خالق کے تقرب کا باعث ہوتا ہے یہاں تو ایک مقدار میں لباس جزو صحت نماز

بن گیا۔ اب نہ جانے کن چور دروازوں سے مسلمانوں میں بھی یہ تصوّرات داخل ہوگئے ہیں کہ برہنہ رہنا مقتضائے ولایت خدا ہوگیا۔ یہاں تو نماز صحیح نہیں ہوگی جب تک کہ اتنا لباس نہ ہو کہ جس کے بعد آدمی برہنہ نہ کہلائے یہ تو مرد کے لئے لباس ہے۔ عورت کی نماز تو اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ہاتھوں اور چہرے کے سوا سب اعضاء چھپے ہوئے نہ ہوں تو معلوم ہوا کہ ہمارا لباس پہننا خالق کو ناپسند نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لباس پہنو تو بوسیدہ اور خراب پہنو۔ جی نہیں کہا گیا کہ جب نماز کے لئے آؤ تو جو بہتر سے بہتر لباس تمہارے پاس ہو وہ پہن کر آؤ اُسے ہماری پریشاں حالی منظور ہوتی تو عطر لگا کہ نماز پڑھنے کا ثواب کیوں ہوتا آج کل بال پریشاں رکھنا اور گویا ہر وقت مصیبت زدہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا گویا ترقی پسندی کی علامت بن گیا ہے اور وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کی جا نمازوں میں کنگھا موجود ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ محاسن میں شانہ کرنا شامل ہے یعنی آراستہ ہو کر بارگاہِ الٰہی میں آئے پریشاں حالی کفرانِ نعمت الٰہی ہے۔ صَلوٰة

ہاں کسی بلند مقصد کی خاطر انسان پیوند دار لباس پہنے تو صحیح ہے۔ حضرت امیرالمومنین بے شک پیوند دار لباس پہنتے تھے آپ نے اسکا فلسفہ نہج البلاغہ میں خود بتایا ہے۔ آپ کے اصحاب میں سے ایک نے۔ عاصم ابن زیاد حارثی نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے بھائی نے گھر کے کپڑے پہننے چھوڑ دیئے ہیں گھر میں پکا ہوا کھانا کھانا چھوڑ دیا ہے۔ ٹاٹ کے کپڑے پہن لئے ہیں اور روکھا سوکھا کھانا کھا لیتا ہے آپ نے فرمایا میں آؤں گا اُسے سمجھاؤں گا نصیحت کروں گا۔ آپ خوش نہیں ہوئے کہ اس نے بڑا اچھا کیا۔ حضرت تشریف لائے اور بڑے سخت انداز میں کہا یا هذا اے شخص یہ کیا زندگی اختیار کی ہے۔ کیا

تیرے گھر میں پکنے والی غذا مالِ حرام سے ہوتی ہے کیا تیرا پہننے کا لباس مالِ ناجائز سے ہے پھر یہ کس طرح کی زندگی تو نے اختیار کر لی۔ اور پھر خود ہی فرمایا کیا تم خیال کرتے ہو کہ خدا نے خود ہی لذائذ اور طیبّات کو حلال قرار دیا ہے اور پھر خود ہی ان پر سزا بھی دیگا یہ عدل الہٰی کے خلاف ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ اتنے سخت الفاظ میں کہا کہ اُسے تاب مقاومت نہ رہی فوراً کہا سمعًا وطاعۃً۔ جو آپ ارشاد فرما رہے ہیں میں اس پر عمل کروں گا جو کھانا کھاتا تھا وہی کھاؤں گا جو کپڑا پہنتا تھا وہی پہنوں گا دیکھئے مقتضائے اطاعت یہی ہے کہ حکم کی تعمیل تو کیجئے پھر اگر اس کی مصلحت کو سمجھنا بھی ہے تو اُسے سمجھتے رہیئے مگر اطاعت کو اس سمجھنے پر موقوف نہ رکھئے اس نے فوراً اقرار اطاعت کیا اور حضرت کا غیظ و غضب کا انداز بدل گیا مگر اصحاب رسول اور اصحاب آئمہ طالب علم بھی تو تھے اور طالب علم کو حق ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ پُوچھ لے تو پس جب اقرار اطاعت کر لیا تو اس نے دبی زبان سے کہا حضور میں نے اقرار تو کر لیا مگر یہ حضرت کا لباس جو ہے۔ دیکھئے کتنی بڑی خلش آپ کے ذہن کی بھی اس نے دُور کرا دی۔ یہ آپ جو اس رُوکھی سُوکھی غذا اور موٹے جھوٹے لباس میں نظر آتے ہیں۔ یہ کیا ہے۔ بظاہر پھر حضرت کی تیوریوں پر بل آگئے فرماتے ہیں اے شخص میری تیری برابری نہیں ہے۔ اب بات کہوں گا کہ حضرت نے کیا معیار مقرر فرمایا۔ میں کہتا ہوں یہی جُملہ کہ ہماری تمہاری برابری نہیں ہے۔ آپ دُنیا کے کسی بھی ملک میں جایئے اور بڑے بڑے عہدیداروں سے اور بڑے بڑے مسند اقتدار پر بیٹھنے والوں سے پُوچھئے کہ سرکار والا یہ آپ کے پاس اتنی کوٹھیاں اور ہمارے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے وہ یہاں کہیں گے کہ کیا ہماری تمہاری برابری ہے۔ کسی سے یہ کہیئے کہ آپ کے پاس اتنی موٹریں ہیں اور ہمارے پاس سائیکل تک

نہیں ہے وہ کہیں گے کیا ہماری تمہاری برابری ہے۔ محل استعمال اس جملے کا دُنیا میں یہ ہے مگر امیر المومنین علیہ السلام کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ ارے جنہیں اقتدار حاصل ہو جاتے ان سے اللہ کا عہد و پیمان یہ ہے کہ وہ اپنا معیار زندگی اپنی رعایا میں سے کمزور ترین فرد کے برابر رکھیں آپ نے اپنے انفرادی عمل کا جو فلسفہ بتایا اس سے پتہ چلتا ہے کہ اور معصومین نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا حالانکہ وہ سب نور واحد تھے ایک سلسلہ کی کڑی تھے مگر ہر دفعہ امیر المومنین کا کردار اس محل پر کیوں پیش ہوتا ہے۔ اب اس ارشاد کی روشنی میں میرا ذہن گیا اپنے حدود مطالعہ کی طرف کہ یہ سادگی کے جتنے واقعات ہیں سب کوُفہ کے ہیں یعنی اس دَور کے نہیں ہیں جب گوشہ نشین تھے یہ زندگی جو جزوِ تاریخ بنی ہے یہ اس دَور کی ہے جب آپ کرسی اقتدار پر متمکن تھے آپ کے سامنے دو نمونے موجود ہیں کہ ایک سائل آیا مسجد میں اور اس نے سوال کیا حضرت نے بھُوسی بھرا ہوا آٹا جَو کا جو آپ نوش فرما رہے تھے وہی اسکی طرف بڑھا دیا اس نے کہا کہ اے بندہ خدا یہ تو میرے حلق سے نہیں اُترے گا آپ نے فرمایا یہ مجھ کو دیدو میں ہی اسکو کھاؤں گا۔ میرے پاس تو یہی ہے اور اگر اچھی غذا کی تلاش ہے تو حسن مجتبےٰ کے دروازے پر جاوَ وہاں مہمانوں کے لئے غذائے لذیذ موجود ہوگی وہ وہاں گیا اور فوراً اس کے لئے کھانا آگیا وہاں کے معیار زندگی کے لحاظ سے وہ پُر تکلّف کھانا تھا۔ اس نے کھانا اس طرح کھایا کہ ایک نوالہ کھاتا ہے اور ایک رکھتا جاتا ہے حضرت نے توجہ کی کہا یہ کیا کر رہے ہو اگر تمہارے ساتھ اہل وعیال ہیں تو یہاں کوئی ممانعت نہیں ہے تم لیتے جانا اس نے کہا میں اکیلا آیا ہوں مگر مسجد میں ایک سائل کو دیکھ آیا ہوں۔ ایک محتاج کو دیکھ آیا ہوں۔ میں نے سوال کیا تو وہ سخی تو ایسا تھا کہ جو اس کے پاس تھا وہ اس نے اُٹھا کر مجھے دیدیا مگر میں

نے دیکھا تو بھوسی بھرا ہوا آٹا ہے جسے میں کھا ہی نہیں سکتا۔ یہ میں اس کے لئے لئے جا رہا ہوں اس فقیر کے لئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ ارے وہ فقیر نہیں ہیں وہ تو مالک دین و دُنیا ہیں ہمارے والد بزرگوار حضرت علی ابن ابی طالب ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ایک ہی وقت میں دونوں نمونے موجود ہیں اگر معاذ اللہ یہ ترکِ اولیٰ بھی ہوتا تو امیر المومنین کے علم و رضا کے ساتھ امام حسنؑ کے ہاں وہ غذائیں تیار کیوں ہوتیں اور آپ سائل کو وہاں کیوں بھیجتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی حکم شرعی بحد احتساب نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا انفرادی عمل تھا آپ کے موقف کے لحاظ سے۔ اسی لئے یہ بھی یاد رکھیئے کہ یہ بڑا نازک مرحلہ ہے کہ کہدیں کہ اتباع کرنا چاہیئے۔ اتباع کرنا چاہیئے۔ کسی ایک معصوم کا نام لے دیا کہ اتباع کرنا چاہیئے۔ مثلاً کوئی ہنگامہ ہوا کہا کہ امام حسینؑ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے اور ایسی کوئی منزل آئی تو کہا کہ حضرت علی ابن ابی طالب کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔ یاد رکھیئے کہ آنکھیں بند کر کے اتباع بھی نہیں کرنا چاہیئے اس لئے کہ چودہ سیرتیں ہیں۔ کس محل پر کس معصوم کی سیرت کا اتباع ضروری ہے اس کے لئے بھی وہ نظر حقیقت شناس ہونی چاہیئے جسکا اصطلاحی نام اجتہاد ہے کہ کس محل پر کس کی سیرۃ پر عمل ضروری ہے کیونکہ سیرتیں سب صحیح ہیں مگر ہر ایک ہر ایک محل کے لحاظ سے صحیح ہے ہر ایک کے مؤقف کے لحاظ سے ٹھیک ہے۔ کسی ایک کو لے لینا اور ہر جگہ اسی کا حوالہ دے دینا یہ کل کو جزو میں محدود بنانا ہے۔ غرض یہ کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارا اچھا پہننا اللہ کو ناپسند نہیں ہے مگر پھر بھی کچھ پابندیاں عائد کردیں۔ خالص ریشم نہ ہو آرائش کرو مگر سونا نہ پہنو۔ وہ بھی مردوں کے لئے۔ عورتوں کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارا اچھا کھانا اسے ناپسند نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے احل لکم الطیبات۔ تمہارے لئے سب طیبات حلال ہیں۔ یہ اور

بات کہ کسی کو حرام ہی میں مزہ ملے۔ ورنہ جو حلال غذائیں ہیں اس میں ذائقے کی کمی نہیں ہے۔ اس میں لذیذ سے لذیذ تر غذائیں کھانے کا آپ کو حق ہے اور کوئی الزام نہیں مکروہ نہیں ہوگا سوائے چند خاص چیزوں کے کہ جنہیں کہدیا کہ مکروہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ لذیذ غذا کھانا مکروہ ہے۔ یہ کسی عالم نے نہیں کہا ہوگا۔ پس ہمارا اچھا کھانا اسے ناپسند نہیں ہے پھر بھی کچھ پابندیاں ہیں گوشت حلال ہے مگر ذبیحہ کا ہونا چاہیئے تب جائز ہوگا۔ یہ سب کیا ہے۔ سب چیزیں پسندیدہ ہیں۔ اللہ کو ناگوار نہیں ہیں مگر اس میں پابندیاں ہیں یہ صرف اسلئے کہ تمہیں مطلق العنان ہونے کا احساس نہ ہو کہ جان ہماری ہے مال ہمارا ہے جو چاہیں کھائیں جو چاہیں پیئیں۔ ہر وقت ایک بالادست صاحب اقتدار کا احساس ہونا چاہیئے۔ اسلام نے اپنے حکیمانہ نظام شریعت کے لحاظ سے وہ مشکل کام انجام دیا کہ دُنیا میں جو ہمیشہ متضاد چیزیں سمجھی گئیں ان کو اکٹھا کر دیا یعنی ہمیشہ جسم اور روح دو الگ الگ چیزیں سمجھی گئیں۔ ہمیشہ جسمانی ترقی کو روحانی ترقی کے خلاف سمجھا گیا۔ رُوحانی ترقی ہے تو پھر جسم کے تقاضے محفوظ نہیں رہیں گے اسی کا ایک رُخ ہوگیا دنیا اور دین کہ دنیا و دین ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا دُنیا کو لو یا آخرت کو لے لو۔ یا دُنیا کو لو یا دین کو لو۔ یہی تصوّر عام تھا لیکن اسلام نے اپنے حکیمانہ نظام شریعت کے لحاظ سے دین و دُنیا کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ کسی اور مذہب میں۔ بفرضِ محال ایک عیسائی کو لیجئے اگر وہ ڈاکٹر ہے تو چھ دن تک ڈاکٹر ہے ساتویں دن جب وہ گرجا جائیگا تب معلوم ہوگا کہ عیسائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ڈاکٹر ہونے میں عیسائیت کا کوئی دخل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کام سے اس کے مذہب کا کوئی سوال نہیں ہاں جب وہ عبادت کے لئے جائیگا تو اس وقت مذہب کا سوال ہوگا۔ اسی طرح ان کی عبادت بس گرجا میں جا کر ہوگی اپنے گھر

میں نہیں ہوسکتی نہ روزہ ہوسکتی ہے جب گرجا پہنچیں گے تو وہاں عبادت کریں گے۔ وہاں پھر خدا کو یاد کریں گے۔ اسلامی نظام نے یہ کام کیا کہ خدا کو یاد کیا نہیں جاتا ہے بلکہ خدا کو یاد رکھا جاتا ہے اسکا نتیجہ یہ ہے کہ تم ڈاکٹر ہو تو بھی مسلمان ڈاکٹر ہو۔ اگر تم تاجر ہو تو تم کو مسلمان تاجر ہونا ہے۔ اگر تم کسی اور شعبہ کو اختیار کیئے ہوئے ہو تو بھی تم کو مسلمان ہونا ہے۔ لہٰذا ہر شعبۂ حیات میں یادالٰہی کارفرما ہوگئی دیکھئے روزمرّہ کی زندگی میں کہ آپ بزاز کی دوکان پر گئے اور اس سے کہا کہ اچھے سے اچھا کپڑا دکھاؤ۔ نئے ڈیزائن دکھاؤ۔ نئی وضع دکھاؤ۔ اس سے مطلب نہیں کہ خوشنما ہے یا بدنما ہے۔ اس نے نئی وضع دکھانی شروع کی۔ اب تک جتنا کام ہو رہا ہے یہ مادی ضرورت کے لئے یعنی تن آسانی کی خاطر۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن ادھر ایک کپڑا آیا اور اگر آپ پابند شرع ہیں اور آپ نے پوچھا یہ خالص ریشم تو نہیں ہے بس پتہ چل گیا کہ انسان اپنی تن پوشی کی راہ میں خالق کو نہیں بھولا ہے۔ اسی طرح بازار گئے۔ طرح طرح کی لذیذ غذائیں نظر آئیں پوچھا کہ یہ ذبیحہ ہے۔ پتہ چل گیا کہ شکم پُری کی خاطر اللہ کو فراموش نہیں کیا جا رہا۔ یہ تو روزمرّہ کی بات ہے۔ اب ایک شعبہ ہے جسکا مجھے تجربہ تو نہیں ہے مگر اندازہ تو ہے ہی کہ کچھ لوگوں کو شکار کا شوق ہوتا ہے۔ شکار پر گئے۔ شکار ملا کتنی دوڑ دھوپ اور تگ و دَو کے بعد۔ آخر میں وہ زد پر آیا اسے گولی لگائی۔ گولی نشانے پر لگی شور مچ گیا۔ فوراً گئے جا کر دیکھا کہا کہ ارے یہ تو مَر گیا۔ تو ادھر کہا کہ ارے یہ تو مر گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ضرورت مادی کے اس تگ و دَو کے عالم میں بھی بندہ خدا کو نہیں بھولا۔ اور جناب اب وہ ناقابلِ بیان مرحلہ۔ میرا تجربہ نہیں ہے اور یہ مقام منبر کا تقاضا بھی نہیں ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ایسی نفسانی خواہش جسکی تکمیل میں انسان اور حیوان میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے تمام شرائط حاصل اور تمام موانع

ختم اور اس کے ساتھ تراضی طرفین حاصل دونوں بالکل آمادہ لیکن فوراً احساس ہوتا ہے کہ جب تک خاص الفاظ زبان پر جاری نہ کریں اسوقت تک ایک پردہ درمیان میں ہے۔جب ایجاب وقبول کے صیغے جاری ہوں گے تب جاکر یہ ہمارے لئے حلال ہے بس معلوم ہو گیا کہ طوفانی خواہشات کے اس تموج میں بھی بندہ خدا کو نہیں بھُولا۔یہی وہ راز ہے جسکو وہ لوگ نہیں سمجھتے جنہوں نے شریعت محمدی میں حلال طریقہ کو حرام کردیا اور جو یہ کہتے ہیں کہ اس میں اور ناجائز تعلقات میں کیا فرق ہے۔ وہ بھی خواہش نفس کا پُورا کرنا ہوتا ہے یہ بھی خواہش نفس کا پُورا کرنا ہوتا ہے۔اس کو بہت ہولناک طریقہ پر پیش کرتے ہیں کہ جس سے سُننے والا قائل ہوجائے اور واقعی آدمی سوچنے لگتا ہے کہ یہ تو ہماری طرف بڑی کمزوری ہے لیکن، یہ بالکل غلط ہے۔ یہ اس فلسفہ کی ناسمجھی پر مبنی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ناجائز تعلقات بھی تو کبھی دائمی رہتے ہیں۔عمر بھر ناجائز تعلقات رہے کیا ایسا نہیں ہوتا تو جو فرق دائمی ناجائز تعلقات میں اور عقد دائمی میں ہے وہی فرق عارضی ناجائز تعلقات اور عقد عارضی میں ہے اس کے وقتی ہونے سے خصوصیت تھوڑی پیدا ہوتی ہے فرق باضابطہ اور بے ضابطہ ہونیکا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اپنے کو مطلق العنان نہ سمجھو۔یہ سمجھو کہ ہماری جان اصل میں کسی اور کی ہے اور ہمارا مال اصل میں کسی اور کا ہے۔جس وقت ایمان اختیار کیا اسی وقت اسکا اقرار ہوگیا کہ اب ہمارا مال ہمارا نہیں ہے اور ہماری جان ہماری نہیں ہے۔ اسی میں درحقیقت اسلامی سیاست بھی مضمر ہے۔جس وقت ایمان لے آئے اسوقت اقرار ہو گیا کہ اس کے مقابلے میں نہ ہماری جان ہماری نہ ہمارا مال ہمارا تو اس کے اقتدار کے مقابلے میں نہ شوریٰ کا حق رہا نہ اجماع کا حق رہا۔اس لئے کہ شوریٰ میں چھ سات آدمی جمع ہوئے وہ سب کیا ہیں ایمان لائے ہوئے ہیں یا نہیں اگر

ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں تو ان کے شوریٰ کو معتبر نہیں سمجھتا خواہ پانچ چھ ہوں۔ اب عددبھی یاد ہے کیونکہ تاریخ میں یہی آیا ہے۔ پس خواہ پانچ ہوں یا چھ ہوں سو دو سو ہوں ہزار دو ہزار ہوں دس ہزار ہوں۔ جتنی مردم شماری اس وقت کی کوئی سمجھے اسکا نام اجماع ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب ایمان رکھنے والے بحمداللہ بہ اقرارِ خود سب مومن ہیں ورنہ مسلم ہی نہیں ہیں کیونکہ بغیر اقرار ایمان کوئی مسلمان بھی نہیں ہوتا اگر مسلمان ہے تو مدعی ایمان ضرور ہے۔ جب مدعی ایمان ہے یعنی جماعت ہے مومنین کی اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت ایمان لائے تھے اسی وقت اللہ کے مقابلے میں بے اختیار ہو گئے تھے۔ بے اختیار با اختیار۔ با اختیار کیا ہے ثبوت اختیار۔ بے اختیار کیا ہے نفی اختیار۔ تو اب وہ دس ہزار ہوں دس لاکھ ہوں دس کروڑ ہوں دس ارب ہوں وہ سب بے اختیار بے اختیار۔ تو بے اختیاروں کے مجمع سے با اختیار کیونکر نکلے گا۔ اس کو معمولی ریاضی کے طالب علم حساب پڑھنے والے بچے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے سے بڑا تختہ کاغذ کا ہو اس پر جتنے زیرو بن سکتے ہیں بنا دیجئے تو کیا ان سب سے کسی عدد کی تشکیل ہوگی کوئی عدد بنے گا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تو جناب اپنی جان اپنی نہیں اسکی۔ اپنا مال اپنا نہیں اسکا۔ یہی فلسفۂ قربانی ہے۔ اپنا نہیں اسکا ہے تو اس کی راہ میں صرف ہونا چاہیئے اس لئے حقیقت میں ہر حکم شرع ایک حد تک قربانی کا مطالبہ ہے۔ نماز جو ہم پڑھتے ہیں اس میں بھی کچھ اپنے اوقات کچھ اپنی مصروفیتوں اور کچھ اپنے مشاغل کی قربانی ہے۔ روزنے میں کتنی خواہشوں کی قربانی ہے اسی طرح زکوٰۃ میں کچھ مالی قربانی ہے اور حج میں تو ہر قسم کی قربانی ہے۔ مالی قربانی الگ رکھ رکھاؤ اور وقار کی قربانی الگ اپنی وضع قطع اور اپنے لباس کی قربانی الگ۔ معاف کریں آج کل کے نوجوان۔ بال بڑھانے پر کچھ لوگ بڑے ریاض کرتے ہیں۔ بڑی محنت کرتے ہیں طرح طرح

سے بناتے ہیں۔ حج کیا تو منیٰ میں جاکر فارغ البال ہونا پڑے گا۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی قربانیاں ہیں جنکا پوری زندگی مطالبہ ہے اور اگر انسان اسے پورا کر رہا ہے تو وہ حقیقت میں قربانیاں پیش کر رہا ہے اگر محل شہادت نہیں آیا تو یہی قربانیاں اسکو پیشِ خدا بلند سے بلند مرتبے حاصل کرانے کے لئے کافی ہیں کیونکہ شہادت تو وابستہ ہے ایسے کچھ حالات سے جو سینکڑوں برس پیدا نہیں ہوتے اور اگر انسان نے شوقِ شہادت میں کوئی اپنی طرف سے ایسا کام کیا جو اس کے خیال میں اسکے تقاضائے شہادت کو پیدا کرے تو یاد رکھئے کہ پھر وہ ہلاکت ہوگی شہادت نہیں ہوگی۔ بڑا نازک مرحلہ ہے۔ شوقِ شہادت میں اگر کوئی غلط قدم اُٹھ گیا تو شہادت کی منزل دُور ہوگئی ہلاکت ابدی رہ گئی۔ جان جب حقیقت میں اسکی دی ہوئی ہے تو جتنی قربانی جس وقت وہ چاہ رہا ہے اتنی ہی کرو۔ اگر اس سے زیادہ قربانی کرو گے تو وہ تو اپنے جی کی خاطر ہوگی۔ یعنی شوقِ شہادت میں قربانی پیش کر رہے ہیں تو وہ تو آپ کے شوق کی راہ میں قربانی ہوئی وہ اللہ کی خاطر تو نہیں ہوئی تو شوقِ شہادت کوئی غلط قدم نہ اُٹھوائے ورنہ پھر شہادت کی منزل بہت دُور ہو جائیگی مجھے یہ بات اس لئے کہنے کی ضرورت ہوئی کہ جب تک کوئی ہوا چلتی ہے تو لوگ اندھا دھند قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ ایک لفظ چلی شوق شہادت کی۔ ہر جگہ اگر یہ ہوا چلنے لگی تو نہ جانے کتنے غلط قدم اُٹھ جائیں گے۔ وہ بڑا خطرناک ہوگا۔ اس کی وجہ سے ہلاکت ابدی ہوسکتی ہے لہٰذا بہت سمجھ بُوجھ کے قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ شہادت کا مرحلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ یاد رکھئے کہ خونریزی سے بہت لوگوں کو نفرت ہوگئی ہے۔ ایسے خونریزی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر معرکہ جہاد میں آنا ہے تو ہر آدمی کو قاتل ہونے کے لئے آنا چاہیئے اگر شوقِ شہادت میں کوئی کمی رہ گئی قاتل ہونے کی کوشش میں تو پھر وہ ہلاکت ہوگی شہادت نہیں ہوگی۔ ہم نے زیادہ سے

زیادہ افراد کو تہہ تیغ کریں اور اگر ہم نے کوئی کمی کر دی کہ بہت اچھا ہے شہید ہو جائیں تو بہت بُرا ہو گا کہ شہید نہیں ہوں گے۔ یہ بڑی سخت منزل ہے اسی لئے ہر منزل پر ضرورت ہے زندہ رہنمائی۔ صَلوٰۃ۔ مَیں کہتا ہوں روز عاشور دیکھئے کیا مسلم ابن عوسجہ کو شوقِ شہادت برادرانِ حسین سے زیادہ تھا کیا حبیب ابن مظاہر کو شوق شہادت حضرت ابوالفضل العباس سے زیادہ تھا۔ پھر کیا ہے کہ وہ اتنے جلدی شہید ہوئے اور یہ اتنی دیر میں۔ تو کیا جس وقت وہ شہید ہوئے تو ان کا درجہ ان سے اُونچا ہو گیا کہ جو ابھی شہید نہیں ہوئے۔ میں کہتا ہوں اُن کا بڑھ جانا ان کا جہاد تھا اور ان کا رُکا رہنا ان کا جہاد تھا۔ اگر جوش میں آکر یہ آگے بڑھ جاتے تو تقاضائے شہادت کے خلاف ہوتا اور سب سے بڑا امتحان تو حضرت ابوالفضل العباس کا تھا جو دوسری محرّم سے بے چین تھے۔ جس وقت نہر سے خیمے ہٹائے گئے ہمارے مرثیہ نگاروں نے نظم کر دیا ہے کہ حضرت ابوالفضل العباس اسوقت بے تاب تھے اور انہوں نے عرض کیا مگر نہیں تاریخی روشنی میں حضرت ابوالفضل العباس کا نام اس منزل میں نہیں ہے۔ جناب زہیر ابن قین ان کی بارگاہ میں معافی مانگوں گا مگر جو تاریخی حقیقت ہے وہ کیوں نہ عرض کروں کہ اس جماعت میں یہ نووارد تھے یہ ابھی پورے طور پر نظام کار امام کو نہیں سمجھے تھے اس لئے جب خیمے ہٹائے جانے لگے تو جناب زہیر ابن قین نے عرض کیا کہ مولا یہ ابھی ایک ہزار ہیں ان سے ہمیں نمٹ لینے دیجئے اس کے معنی ہیں کہ ان کی نظر میں ایک ہزار تو کچھ ہیں ہی نہیں۔ یہ ابھی ایک ہزار ہیں ان سے ہمیں نمٹ لینے دیجئے ورنہ پھر اتنے آجائیں گے کہ ہمیں تابِ مقاومت نہ رہے گی۔ میں نے عرض کیا کہ کیا یہ شان کے مطابق ہے حضرت ابوالفضل العباس کی۔ کوئی اور۔ جناب حبیب ابن مظاہر یا مسلم ابن عوسجہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے یہ نووارد ہیں اس لئے انکی نظر اسباب پر ہے۔ ان ہستیوں کو اس سے مطلب نہیں ہے

کہ دس ہزار آجائیں گے یا دس لاکھ آجائیں گے انہیں تو فرض کو پورا کرنا ہے۔ تو جب زہیر ابن قین نے یہ کہا اس وقت عباس کی نظر تو امام کے لبوں پر جم گئی کہ یہ کیا جواب دیتے ہیں زہیر ابن قین کو۔ حضرت امام حسینؑ نے یہ مختصر جواب دیا کہ میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جنگ میں ابتدا کروں۔ بس انہوں نے امام کے جواب کو یوں کہوں کہ گرہ میں باندھ لیا ورنہ آپ ذرا عباس کے دل میں دل ڈال کر دیکھئے کہ پانی بند ہو جائے اور عباس خاموش رہیں۔ اب یہ نہیں کہتے کہ مولا اجازت دیجئے ہم جا کر دریا چھین لیتے ہیں۔ جو تن تنہا چھین لے اس کے لئے تمام اصحاب کی مدد کے ساتھ کیا دشوار تھا مگر امام کا وہ جملہ یاد رہا۔ اس کے تحت یہ فلسفہ مضمر ہے کہ اگر پانی پر جنگ کرنا ہوتی تو خیمے ہی کیوں ہٹائے جاتے۔ یاد رکھئے کہ اگر اس وقت جہاد ہو جاتا تو واقعہ کربلا کی تاریخ بدل جاتی کہ پانی پر جھگڑا ہوا تھا۔ حسین یہ چاہتے تھے کہ جو میری جنگ ہو وہ اصول پر ہو تو جب بپا شدہ خیمے ہٹا لئے اور جنگ نہیں کی تو پانی بند بھی کر دیا تو کیا محل ہے کہ ہم کہیں مولا سے کہ ہمیں اجازت جہاد دیجئے یہ وہ کہے جو فلسفہ اقدام حسینی کو نہ سمجھتا ہو۔ اب آپ ان کے دل کی کیفیت کا اندازہ کیجئے کہ سکینہ العطش کہہ رہی ہو اور یہ خاموش رہیں اور بچے خالی کوزے لئے بیتاب پھر رہے ہوں اور یہ خاموش رہیں اور محمد باقر کا کملایا ہوا چہرہ دیکھیں اور یہ خاموش رہیں مگر ہاں بالکل خاموش تھوڑی ہیں کنوئیں کھود رہے ہیں یعنی وہ قوت جو تلوار پہ صرف ہوتی وہ بیلچے پر صرف ہو رہی ہے۔ اب کہیں پانی نہیں نکلتا میں کہتا ہوں وہ جنگ وفائے عباس نہیں ہے یہ خاموشی وفائے عباس ہے۔ چنانچہ تین دن گزر گئے بچوں کی پیاس بڑھتی رہی اور عباس خاموش یہاں تک کہ اب عصر عاشور حملہ ہو گیا۔ تو صفحہ کاغذ پر تو الفاظ آتے ہیں لب و لہجہ نہیں آتا حضور والا۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو فلسفے اور منطق سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ اصحاب سب

خیموں سے باہر ہیں۔ عزیز سب خیموں سے باہر ہیں مگر گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا پہلے زینب کے کانوں تک جاتی ہے۔ فضہ سے فرماتی ہیں جاؤ دیکھو ہمارے بھائی کیا کر رہے ہیں۔ فضہ نے آکر دیکھا اور کہا کہ پاس کوئی نہیں ہے۔ نماز ظہر کے بعد عمود خیمہ کے ساتھ تکیہ کر کے بیٹھ گئے ہیں نیند آگئی ہے۔ زینب آئیں قریب۔ کہا بھائی بھائی۔ آنکھ کھولئے حملہ ہو گیا۔ امام نے آنکھ کھولی بھائی بہن میں گفتگو ہوئی تب عباس آئے صفحۂ تاریخ پر یہ الفاظ ثبت ہیں کہ مولا حملہ ہو گیا۔ میں یہ کہتا ہوں کیا یہ بتلانے آئے ہیں کہ حملہ ہو گیا۔ اگر بتلانے آئے ہیں تو اتنی دیر میں آئے ہیں اور پھر محل کیا ہے یہاں تو بھائی بہن میں گفتگو ہی یہی ہو رہی ہے۔ بتلانے کا محل کیا ہے میں کہتا ہوں یہ بتلا نہیں رہے ہیں یہ اس دن کی بات کا حوالہ دیکر کہہ رہے ہیں کہ مولا حملہ ہو گیا یعنی اب تو آپ کے اصول کو صدمہ نہیں پہنچتا بے شک اس دن انداز حاکمانہ تھا میری شان نہیں ہے کہ میں جنگ میں ابتدا کر دوں۔ اب عباس نے جو یہ کہا ہے تو مولا کا انداز حاکمانہ نہیں ہے کیونکہ اب کوئی اصول سدِّ راہ نہیں ہے اب امام گویا اپنے ذوق کا واسطہ دیتے ہیں اور پھر حکمت امام اسکی متقاضی نہیں ہے کہ رات کو جنگ ہو جائے مگر بڑے مشکل کام کو بھیج رہے ہیں جو جنگ کے لئے بے چین ہے اُسے التوائے جنگ کی درخواست دے کر بھیج رہے ہیں خدا کی قسم یہ ہے عباس کی دفا۔ میں کہتا ہوں کہ مولا اس مقصد کے لئے حبیب ابن مظاہر کو بھیج دیجئے کسی سن رسیدہ فرد کو بھیج دیجئے عباس جیسے شیر کو اور اس مقصد کے لئے۔ دُنیا والے صرف غضب کے موقع پر پیش کرتے ہیں خدا کی قسم انہیں معرفت عباس نہیں ہے۔ وہ صرف جلال عباس کو دیکھتے ہیں۔ صبر عباس کو نہیں دیکھتے امام بھی جانتے ہیں کہ بڑا مشکل کام لینا ہے خود حسین جانتے ہیں کہ عباس سے بڑا مشکل کام لینا ہے اس لئے انداز گفتگو کیا ہے۔ خدا کی قسم

مجھے تو علی اکبر سے بھی گفتگو میں یہ لفظیں نہیں ملتیں ارے خود عباس سے گفتگو میں اس سے پہلے یہ لفظیں نہیں ملتیں۔ طبری کے صفحات پر ہے فرماتے ہیں بنفسی انت یا اخی۔ ارے میری جان تم پر قربان اے میرے بھائی میں کہتا ہوں۔ بس مولا اب جو چاہیے کام لے لیجئے عباس سے۔ دیکھئے اس وقت یہ مرحلہ کتنا مشکل ہے جو جنگ کے لئے تقاضے کو آیا ہو اسکا انداز طبیعت کیا ہوگا جو درخواست صلح لیکر جائے اسکا انداز کیا ہونا چاہیئے مگر الفاظ امام کے بعد عباس کو ایکدم اپنے کو بدلنا ہے اور بس۔ اب چلے جا رہے ہیں۔ دبی زبان سے بھی تو نہیں کہتے کہ مولا اس کام کے لئے کسی اور کو بھیج دیجئے۔ جی نہیں یہ تو حکم امام کی اطاعت کو واجب جانتے ہیں لہٰذا گئے میدان جنگ کی طرف اور وہاں جاکر کیا کیا سنا ایسی باتیں جو ہمارے ذہن کو کھولا دیں۔ کوئی کہتا ہے مہلت دی جائے کوئی کہتا ہے مہلت نہ دی جائے کوئی کہتا ہے کہ اگر کفار ترک و دیلم ہوتے وہ بھی مہلت مانگتے تو دینی چاہیئے تھی۔ یہ تو بہر حال مسلمان ہیں۔ یہ سب باتیں اور کوئی ایسا اقدام نہ ہو جو مصلحت امام کو نقصان پہنچائے۔ مجھے تو یہی لفظیں ملتی ہیں کہ یہ ہے ایک غیر معصوم فرد کی عصمت کردار۔ آخر میں کامیاب ہوئے اور کہا اچھا مہلت ہے ایک رات کی اور اب دیکھئے کہہ رہے ہیں میں نہیں جاؤں گا معاہدہ ہو رہا ہے دو جماعتوں کے درمیان اپنے دو نمایندے میرے ہمراہ کرو کہ وہ جاکر توثیق کریں اس التوائے جنگ کی۔ تب وہ معتبر ہوگا چنانچہ دو آدمی ادھر سے اپنے ساتھ لے کر حسین کے پاس آئے اور میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے خوش آئے جیسے فرات فتح کر کے آئے ہوں۔ رات کی مہلت مل گئی۔ دل بے چین تھا مگر اطمینان ہے کہ میں نے مہلت لی ہے ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ صبح ہو تو دیکھا جائے گا۔ صبح ہوئی اور لشکر مرتب ہوا۔ ایک مرتبہ مولا کہتے ہیں کہ لو یہ علم تم لو۔ اب یہ علم کا لینا نہ تھا۔

سمجھتے تھے کہ میرے پیروں میں زنجیریں پڑ رہی ہیں اب عباس کے دل میں نظر ڈال کر دیکھئے کہ قاسم کا لاشہ آجائے عون و محمد کے لاشے آجائیں اور عزیزوں کے لاشے آجائیں اور عباس خاموش کھڑے رہیں خدا کی قسم یہ سب قربانیاں ہیں جو علم کے احترام پر ہو رہی ہیں یہ نفسیاتی قربانیاں ہیں جو علم کے احترام پر ہو رہی ہیں اور پھر جب علم لے کر گئے تو کس طرح حفاظت کی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہاتھ نہیں رہے تب بھی عَلَم زمین پر گرنے نہیں پایا میں کہتا ہوں اگر اس وقت پکار لیا ہوتا مولا کو تو شاید سکینہ کو مشک پہنچ جاتی مگر نہیں ابھی عباس کی ہمت پست نہیں ہوئی ہے ایک ہاتھ نہیں رہا تو دُوسرے ہاتھ میں عَلَم بھی مشک بھی اور پھر بھی شمشیر زنی۔ اور پھر بھی رُخ خیموں کی طرف ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں۔ کیا جب سے عباس آئے ہیں بچے خیمے کے اندر بیٹھے ہیں یقیناً سب درِ خیمہ پر ہیں اور نگاہ علم پر ہے اور علم آ رہا ہے بچوں کا دل بڑھ رہا ہے اربابِ عزا ایک دفعہ عَلَم گرا حسین نے کمر تھام لی اور کہا اب میری کمر ٹوٹ گئی۔ سکینہ نے کہا ہائے میرا چچا ھائے میرا چچا۔

مجلس دہم

وسیلہ۔ توبہ اور میزان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ۔

ارشاد حضرت احدیت ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔ اِلَیْہِ ضمیر ہے اسکی طرف۔ وہ کون ہے۔ اللہ۔ اسکی جانب وسیلہ تلاش کرو۔ طلبگار رہو۔ وسیلہ کون شے ہوتی ہے۔ جو کسی کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہو۔ اس کام کا وسیلہ یہ ہے یعنی یہ کام اس ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔ اس شہر کا وسیلہ وہ سواری ہے جو اس شہر تک پہنچا سکے۔ کوئی پوچھے کہ وہاں پہنچنے کا کیا وسیلہ ہے تو آپ بتائینگے کہ وہاں تک یہ سواری جاسکتی ہے۔ یہ پہنچا دے گی۔ تو جو شے جس قسم کی ہو اس کا وسیلہ اسی قسم کا ہوسکتا ہے۔ اور پھر وہ وسیلہ کاہے کا ہوگا یہ اس شے سے جو چیز متعلق ہو اس کے حصول کا وسیلہ ہوگا۔ مثلاً منزل ہے اگر کوئی تو چونکہ وہ ایک ظرف مکان ہے ایک جگہ ہے تو وسیلہ اسکا کوئی جسمانی ہوگا جو اپنی جنبش اور حرکت کے ساتھ آپ کو اس جگہ تک پہنچا دے۔ کسی غذا کو پوچھے کہ اس غذا کا کیا وسیلہ ہے تو غذا سے متعلق کھانا ہوتا ہے مطلب یہ کہ کھانے کے لئے یہ کیونکر مل سکتی ہے۔ کوئی کام انجام پانا ہے یہاں کیا ہے خدا کی طرف وسیلہ۔ تو خدا نہ ظرف مکان میں مقیّد ہے نہ ظرف زمان میں مقیّد ہے۔ تو وسیلہ اسکا اب کوئی مرکب نہیں ہوسکتا۔ سواری جو اس تک پہنچا سکے۔

وہ تو اس وقت ہو جب وہ کسی محل میں کسی مکان میں ہو تو پھر مسافت طے کرنے کے لئے سواری درکار ہو گی کہ وہ اس تک پہنچا سکے۔ کعبہ تک پہنچنے کا ذریعہ تو سواریاں ہونگی مگر خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سواریاں تھوڑی ہونگی۔ ہزار دفعہ ممکن ہے کہ کعبے پہنچ جائیے۔ مگر خدا تک ایک دفعہ بھی نہ پہنچ سکے۔ صَلوٰۃ۔ اسی طرح سے فرض کیجئے غذا کا وسیلہ جو ہوگا اسکا مقصد کھانا ہوگا۔ تو اسکی طرف پہنچنے کے لئے نہ سواری کوئی ہو سکتی ہے جو لے جائے۔ پھر اللہ تک تو پہنچ کر ہمارا کام اسکی ذات سے کوئی متعلق ہو سکتا ہے۔ نہ وہ اوڑھنے کی چیز ہے نہ بچھانے کی چیز ہے۔ کوئی ہمارا مقصد اس سے وابستہ نہیں ہے کہ وہ مقصد ہمارا اس طرح سے حاصل ہو۔ تو اب اللہ کی طرف وسیلہ۔ یعنی اللہ سے متعلق کوئی چیز ماننی پڑے گی جسکا یہ وسیلہ ہو۔ مثلاً رضائے الٰہی کا وسیلہ۔ خود اسکی ذات کی طرف کیونکر رسائی ہوگی۔ تو اسکی طرف وسیلہ کا مطلب ہوا اسکی رضا کا وسیلہ۔ اسکے راضی رکھنے اور اپنے سے خوشنود بنانے کا وسیلہ کیا ہے۔ اگر ہم کہیں کہ اس کے قرب کا وسیلہ تو وہ جب کسی مسافت پر نہیں ہے تو قرب اسکا کیسا۔ وہاں ہمیں قربتہً الی اللہ کی تشریح کرنی پڑے گی کہ قربتہً الی اللہ کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف نزدیک ہونے کے۔ یعنی کیا ایک نماز سے پہلے ہم دس میل دُور تھے اور نماز کے بعد ایک میل اُدھر چلے جائیں گے یا وہ اپنے محل سے معاذ اللہ ایک میل ادھر آ جائے گا۔ تو قربتہً الی اللہ کیا چیز ہے اسکی تشریح کی ضرورت ہوگی۔ اب قربِ الٰہی کے وسیلہ کا کیا مطلب وہ بھی نتیجتہً وہی کہ رضائے الٰہی کا ذریعہ۔ اسی کو کہیں گے اسکی طرف کا وسیلہ۔ معلوم ہوا کہ بغیر وسیلہ کے اسکی رضا نہیں ملے گی۔ اگر اسکی تعبیر قرب سے کی جائے تو بغیر اس کے وسیلہ کے قرب نہیں ملے گا۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اسکی طرف وسیلہ اختیار کرو۔ تو جب ہم غور کرتے ہیں تو اصل وسیلہ تو وہ ہے کہ جسکو اس نے اپنی طرف سے اپنی رضا کا ذریعہ بتایا ہے۔ اور وہ ایمان و عمل ہے۔ ایمان اور

عمل صالح کے بارے میں اس نے کہا کہ جو ایسا کرتے ہیں میں ان سے راضی ہوتا ہوں میں انہیں اجر و ثواب دیتا ہوں۔ جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو کہیں ہمیں تنہا ایمان پر جنّت کا وعدہ نہیں ملتا۔ ہر جگہ ایمان اور عمل صالح۔ کبھی حرفِ عطف کے طور پر کہ الّذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت۔ جو ایمان لائے اور انہوں نے عملِ صالح کیا۔ اس عملِ صالح کی تعبیریں مختلف ہیں۔ کہیں اٰمنوا واتقوا ایمان لائیں اور پرہیزگار رہیں کہیں اٰمنوا واحسنوا ایمان لائیں۔ اس احسنوا پر ہمارے اردو داں طبقے کو بڑی دشواری ہوتی ہے اور وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض لفظیں اردو میں معنی بدل کر آگئی ہیں۔ عربی میں اسکے کچھ اور معنی ہیں۔ لیکن اردو میں لفظ وہی ہے اور اسکے معنی کچھ اور ہو گئے ہیں مثلاً یہ احسان کی لفظ ایسی ہے کہ ہم جب لفظ احسان کہتے ہیں تو اس سے وہ مفہوم نہیں نکلتا جو عربی میں لفظ احسان کا ہے۔ اس لئے جب ہم عربی میں لفظ احسان دیکھتے ہیں تو ہم اُسے اپنے مفہوم پر ڈھالتے ہیں۔ ہمارے ہاں احسان ایک بارِ منت کا ثبوت دیتا ہے یعنی کسی کے ساتھ بلا استحقاق کوئی سلوک کیا جائے تو اُسے ہم کہیں گے احسان۔ مثلاً کسی صاحب پر آپ کا قرضہ ہو اور وہ قرضہ۔ جو آپ کا مطالبہ تھا وہ لاکر آپ کو دیدیں۔ آپ کہیں گے آجکل مجھ کو بڑی ضرورت تھی آپ نے بڑا احسان کیا۔ وہ کہیں گے کہ احسان کیسا وہ تو آپ کا مطالبہ تھا میرے ذمّہ۔ تو انہوں نے یہ کیوں کہا کہ احسان کیسا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ احسان وہ ہے جو بلا حق ہو۔ جو فرض کا ادا کرنا ہو وہ احسان نہیں ہوتا۔ لیکن اب ہم ذاکرین سے ایک حدیث سنا کرتے ہیں اسکا ترجمہ بھی وہ لفظ احسان سے کر دیتے ہیں تو ہم غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ من بکی علی الحسین احسن بالنبی و فاطمہ میں تو اس ترجمے کو معاذ اللہ کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس نے گریہ کیا اس نے معاذ اللہ رسولؐ اور فاطمہ پر احسان کیا۔

کیا میرے کہنے کے بعد آپ کا ضمیر گوارہ کرتا ہے کہ احسان کریں گے ہم گریہ کریں عمر بھر اور اس سے بڑھ کر خون کے آنسو روئیں تو ان کا حق ہم سے ادا نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ہم یہ تصوّر کریں کہ ہم احسان کریں گے اسی طرح قرآن مجید میں ہے قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ تمہارے پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ عبادت تو اسکے سوا کسی اور کی نہ کرو مگر ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔ اب احسان کی لفظ سے وہی معنی پیدا ہو گئے کہ ان ماں باپ کے ساتھ جو کریں گے وہ ہمارا احسان ہو گا۔ حقیقت میں یہ ہماری اُردو زبان کے لفظ کی کوتاہی ہے۔ عربی زبان کے معنی میں احسان کے معنی ہیں حسنِ عمل۔ یعنی جو فرض ہے وہ ادا کرنا احسان ہے۔ صَلٰوۃ۔

اس لئے جو لفظ عملوا الصّٰلحٰت کے معنی ہیں وہی لفظ احسنوا کے معنی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اللہ نہیں ضائع کرتا اجر حسنِ عمل رکھنے والوں کا۔ لوگ ایسے جملے وہاں صرف کرتے ہیں جیسے چندہ کہیں مانگا جارہا ہو تو وہاں صرف کرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ درحقیقت ان کے ذہن میں وہی اُردو والا احسان ہوتا ہے۔ تو عربی میں احسان کے معنی ہیں حسن عمل سے کام لینا۔ تو کہیں پر امنوا واتقوا۔ کہیں پر اٰمَنُوْا وَاَحْسَنُوْا کہیں پر بطور قید کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو ایمان لائے اور حسن عمل کیا کہیں پر عمل صالح کے ساتھ ایمان کی قید کہیں پر ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی قید۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ جو بھی مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى مرد یا عورت ایمان لائے گا وھو محسنٌ دراں حالیکہ حسنِ عمل کرے گا من عمل صالحًا من ذکرٍ او انثٰی جو عمل صالح کرے مرد یا عورت وھو مومن۔ دراں حالیکہ وہ مومن ہو تو یہاں اصل سرنامہ اجر عملِ صالح اور ایمان بطور قید اور کہیں پر یوں کہ بلٰی من

اسلم وجهہ للہ وھو محسن ۔جو مسلمان ہو سر جھکائے ہوئے ہو اللہ کے سامنے۔ اپنے کو سپردِ خدا کئے ہوئے ہو۔ دینِ اسلام اختیار کئے ہوئے ہو وھو محسنٌ ۔ دراں حال کہ وہ حسنِ عمل رکھتا ہو۔ تو معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ساتھ حسنِ عمل۔ لیکن اب تلاش کر ڈالئے۔ کفروا کے ساتھ عملوا السیّئات نہیں ہے۔ اُدھر یہ نہیں کہا گیا کہ جو کفر کرے اور بد اعمال ہو پھر وہ دوزخ میں جائے گا۔ جہاں وعید ہے وہاں کُفر کے ساتھ اعمال کا ذکر نہیں ہے جہاں وعدہ ہے یعنی اجر کا اعلان ہے وہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کفر کے ساتھ تو اعمال پر نظر ہی نہیں ہوتی۔ جب ایمان ہو تو عمل کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ عمل صالح ہے یا نہیں ۔ صلوٰۃ

اب ایک اور حقیقت قرآنی ہے۔ جسے آپ قرآن مجید کا شروع سے آخر تک مطالعہ کرکے اور قرآن مجید کی آیتیں دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔ ایک رسالہ میرا ہے اسمیں سو آیتیں تقریباً اس سلسلہ کی درج کی ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ آخرت میں جو اجر کا اعلان ہوا ہے وہ ہمیشہ عمل پر ہوا ہے ایمان پر نہیں۔ جو ہم اعمال کریں گے اسکا اجر ملے گا۔ یہ نہیں ہے کہ ایمان کا اجر ملے گا۔ جو اعمال کئے ہیں اسکا اجر ہوگا۔ ایمان شرط حصول اجر ہے۔ اصل اجر ہے اعمال کا۔ صلوٰۃ۔

اگر ہم نے شرط پوری کی اور اعمال نہ کئے تو ایسا ہے جیسے وضو کر لیا اور نماز نہیں پڑھی۔ یہ جو اصطلاح ہے اصول دین اور فروع دین کی یہ درحقیقت اسی واقعیت کا اظہار ہے۔ لوگ اس فروع دین کی لفظ سے بھی غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ارے نماز وغیرہ تو فروعی چیزیں ہیں گویا فروعی کرکے اسکی اہمیّت کو کم کرتے ہیں حالانکہ پیغمبرِ خدا کے پاس جو کوئی مسلمان ہونے کے لئے آتا تھا تو آپ اسے یہ دو لفظوں میں بتاتے بھی نہیں تھے کہ یہ اصولِ دین ہیں یہ فروعِ دین ہیں

یہ ہم بچوّں کو سکھاتے ہیں کہ یہ اصُولِ دین ہیں یہ فروعِ دین ہیں۔ پیغمبرؐ کسی مسلمان کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ دیکھو اصُولِ دین ؐہیں انہیں یاد کرو اور فروع دین یہ ہیں، انہیں یاد کرو بلکہ آپؐ فرماتے تھے کہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لاؤ اور نماز پڑھو یعنی ایکدم پیغام توحید اور پیغامِ صَلوٰۃ۔ صَلوٰۃ

اس وقت اسکو یہ فرق سمجھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ یہ حقیقت میں علما کی قائم کی ہوئی اصطلاح ہے اصولِ دین اور فروعِ دین۔ نہ قرآن میں یہ امتیاز ہے نہ احادیث میں۔ یہ ایک حقیقت کے اظہار کے لئے ہے جسکو نظر انداز کر کے لوگ اہم اور غیراہم کے فرق میں اسکا استعمال کرتے ہیں کہ وہ اہم ہیں اصولِ دین اور یہ بیچارے فروعِ دین ہیں۔ یہ بیچارے پن کے لئے فروع دین کی اصطلاح نہیں تھی۔ یہ حقیقت کے اظہار کے لئے تھی۔ وہ اس لئے تھی کہ اصُولِ دین کے معنی دین کی جڑیں اور فروع دین۔ دین کی شاخیں۔ یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے کہ اصُول یعنی جڑیں نظروں کو دکھائی نہیں دیتیں وہ اندر اندر پھیلتی ہیں جو نظر آتی ہیں وہ شاخیں ہوتی ہیں اور وہ وابستہ ہوتی ہیں ان جڑوں سے اور ان جڑوں کے ذریعہ سے ان تک خونِ حیات پہنچتا ہے وہ سبب ہوتی ہیں اور شاخیں اثر ہوتی ہیں اور وہ سبب جو ہے وہ اندر اندر ہوتا ہے اور وہ شاخیں باہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح عقائد حق جو معیار ایمان ہیں وہ دل و دماغ کی تہوں کے اندر پھیلتے ہیں اور ان کے آثار ہیں جو اعمال کی صورت میں اعضا و جوارح سے نمودار ہوتے ہیں صَلوٰۃ

تو جڑیں اگر مضبوط ہیں اور زندہ ہیں تو پھر ممکن ہی نہیں ہے کہ شاخیں نہ ہوں وہ ان کا لازمی نتیجہ ہیں اور اگر شاخیں پژمُردہ ہیں اور خشک ہیں یا موجود ہی نہیں ہیں تو سمجھ لیجئے کہ جڑ مُردہ ہے جڑ میں زندگی نہیں ہے اب اسکا علاج کیا ہے شاخوں کو پانی میں ڈبونے سے کام نہیں چلے گا جڑوں میں پانی دینے کی ضرورت ہے صَلوٰۃ

اسی طرح سے اگر اعمال صالح مفقود ہیں یا ان کی طرف نظر تغافل ہے یا وہ کمزور نظر آتے ہیں تو سمجھنا پڑے گا کہ اصول مستحکم نہیں ہیں۔ دل و دماغ کے اندر وہ تصورات گویا سُنے سنائے بس زبان پر ہیں۔ ذہن کے اندر وہ تصوراتِ حقیقی واضح نہیں ہیں اگر واضح اور راسخ ہوتے تو ممکن ہی نہیں تھا کہ شاخیں برآمد نہ ہوں۔ شاخیں نظر نہ آئیں۔ اب جناب والا اگر جڑ مُردہ ہے اور زندگی اسمیں نہیں ہے تو شاخیں پژمُردہ ہونگی افسردہ ہونگی تو پھر ثمر کیا ملے گا۔ ثمر تو شاخوں ہی کے ذریعے سے ملتا ہے اور ان شاخوں کے ذریعہ سے ملتا ہے جو اصل سے وابستہ ہوں اور اگر اصل خشک ہے تو شاخوں سے ثمر نہیں ملتا۔ اگر جڑ بالکل نہیں ہے اور شاخیں ہیں بڑی دیدہ زیب تو وہ نمائشی ہونگی۔ فائدہ وقتی نمائشی شاخوں سے بھی حاصل ہوجائیگا رونق چمن ہوگی دیدہ زیبی ہوگی ممکن ہے کہ اگر گھنی شاخیں ہوں تو سایہ بھی ہوجائے کچھ چھاؤں آرام کا باعث بن جائے مگر ثمر نہیں ملے گا۔ ثمر انہی شاخوں سے ملے گا جو زندہ اصل سے متصل ہوں۔ اور ایک اور خاصہ ہوگا نمائشی شاخوں کا کہ کسی تیز ہوا کے جھکڑ کو برداشت نہیں کرسکیں گی۔ بس جب تک حالات پُرسکون ہیں تب تک شاخیں نظر آرہی ہیں اور ادھر کوئی وقت کے خطرہ کا تیز جھکڑ چلا تو بس تمام شیرازہ بکھر جائے گا کوئی شاخ کہیں ہوگی کوئی کہیں ہوگی۔ صلوٰۃ

اور اگر جڑ ہے کسی حالت میں خواہ مردہ ہو خواہ خشک ہو مگر شاخیں نہیں ہیں تو ثمر پھر بھی نہیں ملے گا مگر اُمید کی جاسکتی ہے کہ اس جڑ میں زندگی پیدا ہوجائے تو پھر شاخیں نکل آئیں اس لئے مایوسی انہی کو ہوگی جنکی جڑیں نہ ہوں یہی قرآن نے کہا ہے کہ لَا یَئْسُ من رحمۃ اللہ الکافرون اللہ کی رحمت سے انہی کو مایوس ہونا چاہیئے جو مانتے ہی نہیں ہیں کافرین ہیں جو حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرتے ہیں۔ جنکی اصل ہے ہی نہیں۔ اصل مایوس انہی کو ہونا چاہیئے اور جہاں جڑ

ہے چاہے کچھ بھی ہو مُردہ ہو بے جان ہوا نہیں بالکل بے آس نہیں ہونا چاہیئے انہیں اُمید ہونی چاہیئے کہ کسی صورت سے ممکن ہے کہ اسکی تلافی ہو جائے اور اللہ کریم ہے اس نے اسی اُمید کو طاقت دینے کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا ہے یہانتک کہ معصوم نے ارشاد فرمایا بعض باتیں ایسی ہیں کہ پوری اصل بات ایکدم سے کہہ دی جائے تو اسکی طرف نظر تغافل ہو جاتی ہے اس لئے حکمت کلام کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ حقیقت کو جرعہ جرعہ ایک ایک گھونٹ کر کے پہنچایا جائے تو شروع میں اگر ذہن اچاٹ بھی ہو جائے سُننے والے کا تو دُوسرے جملے میں شاید ذہن متوجہ ہو جائے تیسرے جملے میں اور متوجہ ہو جائے اس طرح اصل حقیقت بالکل رائگاں نہ ہو اس لئے اب معصوم کا کلام ہے فرماتے ہیں کہ مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِسَنَةٍ قُبِلَتْ تَوْبَتُهٗ۔ جو اپنی موت سے ایک سال پہلے توبہ کر لے اسکی توبہ قبول ہے۔ ایک سال سے شروع کیا۔ اب فرماتے ہیں مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِشَهْرٍ قُبِلَتْ تَوْبَتُهٗ۔ ارے سال بہت ہوتا ہے جو اپنی موت سے ایک مہینے پہلے توبہ کرے اسکی توبہ قبول ہے اس کے بعد فرماتے ہیں اَلَا اِنَّ الشَّهْرَ كَثِيْرٌ مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِاُسْبُوْعٍ قُبِلَتْ تَوْبَتُهٗ۔ ارے ایک مہینہ بھی زیادہ ہے جو اپنی موت سے ایک ہفتہ پہلے توبہ کر لے اسکی توبہ بھی قبول ہے اس کے بعد ارشاد ہوا۔ اَلَا اِنَّ اُسْبُوْعٌ كَثِيْرٌ ارے ہفتہ بھی بہت ہوتا ہے مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِيَوْمٍ قُبِلَتْ تَوْبَتُهٗ۔ جو اپنی موت سے ایک دن پہلے توبہ کرے۔ دیکھئے پہنچ گئی دن تک یہ بات۔ اب فرماتے ہیں اَلَا اِنَّ الْيَوْمَ كَثِيْرٌ ارے ایک دن بھی بہت ہے مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِسَاعَةٍ قُبِلَتْ تَوْبَتُهٗ۔ جو اپنی موت سے ایک ساعت پہلے توبہ کرے اسکی توبہ بھی قبول ہو جاتی ہے۔ اب ہمارے سامنے تو انتہا ہو گئی کیونکہ صاحبانِ علم جانتے ہیں کہ ساعت گھنٹے کے معنی میں نہیں ہے

تھوڑی سی مدّت ہے۔ قلیل مدّت زمانی کو ساعت کہتے ہیں۔ تو فرماتے ہیں کہ وہ ساعت بھی بہت ہے۔ بس جب موت بالکل قریب ہو اس سے پہلے توبہ کرلے تو توبہ قبول ہے۔ اتنی وسعت اس کریم نے توبہ کے بارے میں دی ہے۔ مگر پھر بھی سرمایہ اطمینان نہیں مل سکا اس لیئے کہ وہ آخری وقت نہیں بتایا کہ کب آئیگا۔ یہی حکمت تھی موت کے وقت کو پردے میں رکھنے کی اور اسکا کوئی معیار نہ ہونیکی کہ بوڑھے کو موت آئے گی یا جوان کو یا بچّے کو۔ اگر کوئی معیار ہوتا تو جوانی اطمینان سے گزارتے کہ بڑھاپا دُور ہے لہٰذا کھُل کر جتنی چاہیں بداعمالیاں کرلیں کیونکہ وُہ تو اُصول ہے کہ بُوڑھے کو موت آئے گی اور جو بچّے ہوتے وہ کہتے کہ ابھی ہمیں بہت منزلیں طے کرنی ہیں ابھی اوّل بلوغ ہے۔ اور اوّل بلوغ میں بھی بچّہ ہی کہلاتا ہے۔ چاہے پیشِ خدا بچّہ نہ رہے لیکن وہ بھی خود کو بچّہ سمجھتا ہے اور دُوسرے بھی اُسے بچّہ ہی سمجھتے ہیں۔ وہ بے چارہ روزہ رکھنا چاہتا ہے تو بزُرگ منع کرتے ہیں کہ ابھی تم بچّے ہو۔ روزہ رکھ کر کیا کروگے۔ یعنی اسکو اپنے ہاتھوں جنّت سے محروم کرتے ہیں درحقیقت جب معیار مقرر نہیں ہے تو یہی کیفیت ہوگی۔ اگر معیار مقرر ہوتا تو پروانۂ سکون ہوتا ان کے لیئے جنکی منزل دُور ہے۔ لہٰذا نہ وقت مقرر نہ عمر مقرّر۔ اس لیئے کہ ہر وقت اُمید بھی رہے ناامُیدی بھی۔ سکون درجا دونوں رہیں تاکہ قوّتِ عمل زندہ رہے اور اصلاحِ عمل کا جذبہ قائم رہے۔ اس بنا پر جبکہ آخری وقت مقرّر نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ نفس آخری نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اسکی وہ سانس آخری نہیں ہے۔ خصوصاً اب اس زمانے میں واقعات اس طرح کے بہت ہونے لگے۔ پہلے تو کبھی کبھی اچانک موت کی خبر سُننے میں آتی تھی اور اب تو میں کہا کرتا ہوں کہ رائج الوقت طریقہ موت یہی ہے۔ ایک صاحب ہمارے ہاں سے اک شادی میں جارہے تھے۔ متعلقین کو انہوں نے گاڑی میں

سوار کیا اور خود اس طرح کھڑے ہوئے کہ ایک پیر پائیدان کے اُوپر ہے اور ایک نیچے کہ گاڑی چلنے لگے تو سوار ہو جائیں لوگ انہیں رخصت کر رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے کہ ایکدم سے پیغام پہنچ گیا ٹکٹ کہاں کا لیا تھا اور کہاں پہنچ گئے ساتھ والے جو تھے وہ بھی اُتر پڑے اور انکی لاش لیکر گھر گئے۔ یہ میں نے ایک مثال عرض کی جو مرنے کی وجہ سے رونے کی ہے اور ندرت کی وجہ سے ہنسی آتی ہے کہ واقعی ٹکٹ کہاں کا لیا اور کہاں چلے گئے۔ ایک دُوسرا واقعہ۔ ہمارے ہاں ایک کمشنر تھے۔ اسمیں برُائی کوئی نہیں ہے مگر نام لینے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ غیبت کا کوئی پہلو ہو لہٰذا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ امرتسر کے باڈر پر سامان دکھلایا وہ پاس ہوگیا اور وہ بجائے اس سرحد کے دوسری سرحد کو پار کر گئے ان کے ہمراہ ان کی بیوی تھیں وہ لاش لیکر واپس گئیں۔ تو جب یہ مثالیں آنکھوں کے سامنے ہوں تو کون کہہ سکتا ہے کہ جو سانس آرہا ہے وہ آخری سانس نہیں ہے تو باوجود انتہائی وسعت کے توبہ کے وقت میں پھر بھی کمی ہے لاعلمی کی وجہ سے۔ تو اگر اصل نہیں ہے تو ثمر کی اُمید نہیں ہوسکتی اور اگر اصل موجود ہے تو ایمان ہے کہ کسی وقت پر اسکا اثر نمودار ہو جائے اور اس کے لئے وسعت پیدا کر دی جائے اور پھر وہی اُمید کو تازہ رکھنے کے لئے اس۔نے اپنی جانب سے اعلانات کئے نااُمید نہ ہونے کے لئے کیونکہ نااُمیدی قوّتِ عمل کو سلب کرتی ہے۔ جب طے ہے کہ دوزخ میں جانا ہے تو کیوں نہ نفسانی خواہشات پُوری کرلیں۔ یہ بھی اصلاحِ عمل کے لئے خطرہ ہے اس لئے شفاعت کے اعلانات ہیں۔ اس لئے اپنے فضل وکرم کے اعلانات ہیں۔ اس لئے یہ اعلانات ہیں کہ سوا کفر وشرک کے ہر چیز ایسی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ بخش دے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرِكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ اس سے کمتر کو

بخش دیتا ہے۔ اُمیدیں وسعت پیدا کی اور لمن یشاء کہکر۔ جس کو چاہتا ہے۔ خوف کا دھڑکا لگایا۔ اور کیا اسکا چاہنا بلا وجہ ہو گا۔ نہیں ہم جانتے ہیں حکیم علی الاطلاق ہے لہٰذا وہ بھی گویا حسنِ عمل میں حالات دیکھتا ہے۔ ماحول اور پس منظر دیکھتا ہے عمل کا۔ ہوسکتا ہے عمل قلیل ہو اور اجر اسکا عظیم ہو۔ اسی طرح سے بداعمالی میں بھی۔ اس کے حالات دیکھنے ہیں۔ اسکے کیفیات دیکھنے ہیں۔ اس کے نتائج دیکھنے ہیں۔ اس سب کو دیکھ کر اس نے اجر و ثواب کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھا ہے سزا کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو کاغذ پر نہیں آسکتی تھی کاغذ پر قانونی طور سے نیکیوں کے نام لکھے جا سکتے تھے اور بُرائیوں کے نام لکھے جاسکتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ فرشتے بھی نامۂ اعمال میں صرف کاموں کے نام لکھ سکتے ہیں۔ کاموں کے وزن کو نہیں لکھ سکتے۔ اس کے اظہار کا ذریعہ ہے جسکی تعبیر میزان سے کی گئی ہے کہ قیامت میں اعمال کا وزن ہوگا۔ ارے قانونی طور سے جرائم کے وزن کی کیا ضرورت۔ یہ وزن ہے اس کے پس منظر آثار و نتائج کو دیکھنے سے متعلق۔ صلوٰۃ

ہم تو لفظیں سُنتے ہیں۔ ان لفظوں سے بے دیکھے حقیقتیں تھوڑی سمجھ میں آتی ہیں۔ آخرت کی چیزیں جو ہیں وہ بس سچے کہنے والوں کی وجہ سے ہم نے ان کی لفظیں یاد کرلی ہیں کہ صراط ہوگا میزان ہوگی لیکن انکی حقیقت کیا کسی کی سمجھ میں آئی ہے۔ میزان کے معنی ترازو تو ہم ترازو جو دیکھتے ہیں اسمیں دو پلڑے ہوتے ہیں۔ اس سے ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ قیامت میں بھی ایسی ہی ڈنڈیاں ہوں گی اور ایسی ہی ترازو ہوگی۔ اور کوئی مَلَک انہیں لئے ہوئے ہوگا اور اعمال ڈھو ڈھو کر لائے جا رہے ہوں گے اور وہ پلڑے میں رکھے جائیں گے میں کہتا ہوں کہ یہ ترازو کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہر شے کی ترازو اس کے اعتبار سے

ہوتی ہے۔ حضور اجسام کی ترازو میں سب یکساں نہیں ذرا لکڑی کی ٹال پر جاکر ترازو کو دیکھئے اسکا قد و قامت ملاحظہ فرمایئے اور کسی عطار کی دوکان پر جاکر جس پر وہ بہت قیمتی دواؤں کو تولتا ہے اس ترازو کو دیکھئے اور جوہری کی دوکان پر جاکر دیکھئے۔ وہاں بھی ایک میزان ہے۔ مگر اس موتی کو لیجا کر ٹال کی ترازو پر رکھ دیجئے تو وزن معلوم بھی نہیں ہوگا اور اگر موتی تولنے والے کانٹے پر لکڑیوں کا ڈھیر رکھ دیجئے تو بیچارہ دب کر رہ جائے گا۔ ٹوٹ پھوٹ جائیگا۔ وہ بھی وزن نہیں بتا سکے گا معلوم ہوتا ہے کہ اجسام میں بھی سب یکساں نہیں جو جسم کثیف ہے اسکی ترازو اور، جو جسم لطیف ہے اسکی ترازو اور۔ یہ محاورہ تو ہر شاعر کو معلوم ہوگا کہ مصرع موزوں نہیں ہے یا یہ شعر موزوں ہے۔ موزوں کے معنی تول میں صحیح۔ جو صحیح ہے وہ موزوں، جو صحیح نہیں ہے وہ ناموزوں۔ تولنے کو کہتے ہیں وزن۔ وزن کے معنی تولنا۔ کیا ہوتا ہے۔ کوئی ان کے پاس ترازو رکھی ہوتی ہے کہ کاغذ پر شعر کو لکھ کر اسپر رکھ دیتے ہوں اس سے معلوم ہوتا ہو کہ وزن اسکا ہے یا نہیں ہے۔ کیوں میزان کے معنی تو ہیں ترازو۔ یہ اپنے پاس ترازو کیوں نہیں رکھتے اور پھر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ موزوں ہے اور یہ ناموزوں ہے۔ بات یہ ہے کہ شعر از قبیل اجسام نہیں ہے۔ شعر از قبیل الفاظ ہے اور چونکہ وہ الفاظ کی جنس کی چیز ہے لہٰذا کچھ الفاظ مقرر کئے ہیں۔ شعر ان الفاظ کی ترازو پر تولا جاتا ہے۔ جتنی بحریں ہیں عربی کی مجھے پندرہ معلوم ہیں فارسی والوں نے اور بڑھائی ہیں۔ اور اردو والوں نے فارسی والوں کا تتبع کیا ہے۔ اردو والوں نے اس میں کوئی ایجاد نہیں کی ہے۔ بالکل فارسی والوں کی بحروں کو لے لیا ہے تو جناب مجھے عربی کی بحریں یاد ہیں۔ ایک وقت میں پندرہ تھیں اور ایک نے اسمیں اضافہ کیا تو سولہ ہوگئیں طویل بسیط وافر کامل۔ اب میں اپنے حفظ کا امتحان تھوڑی دے

رہا ہوں۔ بحریں کتنے وزن ہوتے ہیں۔ یہ سب ایک مستقل فن ہے علم عروض۔ اسکی ایک بحر ہے جسکا وزن ان الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ۔ لطیفہ گوئی میرا شعار نہیں ہے مگر کبھی کبھی یاد آجاتا ہے کوئی لطیفہ۔ ہمارے ہاں لکھنؤ میں کسی نے مصرعہ طرح یہی کہدیا۔ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ۔ امتحان تھا شعرا کا کہ کیا کریں گے بامعنی مصرعہ تھا ہی نہیں۔ بس یہی مصرعہ طرح۔ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ۔ ایک صاحب نے اسپر مصرعہ لگایا کہ۔ کسی صاحب کا طوطا اڑ گیا ہے پڑھتا پھرتا ہے۔ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ۔ اسی طرح ایک بحر ہے فاعلاتُ فاعلاتُ فاعلاتُ۔ چونکہ شعر از جنس الفاظ ہے لہٰذا اسکی ترازو نہ لوہے کی ہوتی ہے نہ پیتل کی ہوتی ہے بلکہ از قبیل الفاظ ہوتی ہے اس پر تول کر دیکھا جاتا ہے اگر کوئی حرف گھٹتا ہے یا بڑھتا ہے تو وہ شعر ہے ناموزوں۔ وزن سے خارج اور اگر بالکل مطابق ہے۔ جہاں متحرک حرف ہونا چاہیئے وہاں متحرک ہے جہاں ساکن ہونا چاہیئے۔ وہاں ساکن ہے تو وہ شعر موزوں ہے۔ منطق کو بھی علم المیزان کہتے ہیں۔ ارسطو نے جو منطق ایجاد کی ہے اسکا دوسرا نام ہے علم المیزان یعنی ترازو کا علم۔ کونسی ترازو ہے یہاں۔ یہاں الفاظ نہیں ہیں بلکہ حقائق کو تولنا ہے کہ کون صحیح ہے کون غلط۔ یہاں معنی ہیں جنکو تولنا ہے کہ یہ صحیح ہے یہ غلط تو اسکی ترازو از قبیل الفاظ نہیں ہوسکتی بلکہ اسکی ترازو از قبیل مطالب و معانی ہوگی۔ اس کے لیئے ارسطو نے قیاسات کی ترازو ایجاد کی۔ اشکال اربعہ وغیرہ کی ترازو۔ صغریٰ اور کبریٰ مرتب کرکے اس سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ ارسطو کی منطق میں چار شکلیں ہیں۔ شکل اوّل شکل دوم شکل سوم اور شکل چہارم۔ سب سے زیادہ حقیقت سے قریب شکل اوّل اور باقی جتنی شکلیں ہیں پیچیدہ ہیں۔ تو آپ نے دیکھا کہ

اجسام کی ترازو ان کی قسم سے وہ بھی جیسا جسم ہو۔ اس کے تناسب سے ترازو۔ اور الفاظ کی ترازو شعر میں از قبیل الفاظ۔ اور معنی کی ترازو از قبیل معنی۔ تو اصول یہ ثابت ہوا کہ جیسی جنس ہو ویسی اسکی ترازو۔ ایسی ہی ایک چیز کی طرف آپ کے ذہن کو منتقل کر دوں کہ نبوّت کا وزن کون محسوس کرے گا۔ اور جسم نبی کا وزن نہیں ہے نبوّت کا وزن ہے تو نبوّت کا وزن کون محسوس کر سکتا ہے یوں جسکا دل چاہے رسولؐ کو اُٹھا لے۔ یہ اُٹھانا خود دلیل ہے کہ وہ وزن محسوس نہیں کر رہا۔ نبوّت کا وزن وہی محسوس کریگا کہ جو ہم جنسِ نبوّت کوئی وزن رکھتا ہو۔ صَلوٰۃ۔

کعبہ گواہ ہے کہ نبوّت کا وزن کس نے محسوس کیا آپ کے ذہن کو بہت دُور منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ مَیں کہتا ہوں کہ انہوں نے انکی رسالت کا وزن محسوس کیا اس وزن کا احساس اتنا تھا کہ اُسے برداشت نہ کر سکے اور قدم تھر تھرانے لگے بظاہر یہ قدم کا تھر تھرانا عاجزی ہے مگر کمال معرفت کی دلیل ہے۔ شعور کی دلیل ہے انہوں نے انکی رسالت کا وزن محسوس کیا اور انہوں نے انکی ایک ضرب کا وزن ایسا محسوس کیا کہ تول کر بتا دیا۔ صَلوٰۃ

تو جناب قیامت میں جو میزان نصب ہوگی اس میزان پر کیا چیز تولی جائے گی۔ سب کو معلوم ہے کہ اعمال تولے جائیں گے اور میں نے کہا کہ ہر شے کی میزان ہم جنس شے ہوتی ہے۔ جسم کی میزان از قبیل اجسام۔ الفاظ کی میزان از قبیل الفاظ۔ معنی کی میزان از قبیل معنی۔ تو جب اعمال تولے جا رہے ہیں تو اعمال تولنے کے لئے نہ وہ ٹال کی ترازو کام دے گی۔ نہ عطار کے ہاں کا کانٹا کام دے گا۔ نہ وہ شعرائے کرام کے بحروں کے ناپنے کے اوزان کام دیں گے نہ ارسطو کی صغریٰ کبریٰ کام دے گی۔ یہاں کچھ انسان کامل چاہئیں جنکا عمل ترازو بن سکے۔ یہ حقیقت ہے جسے ہمیں زیارت کے ایک جملے میں سکھایا گیا ہے۔ اَلسَّلاَمُ عَلَیْکُمْ یَا مَوَازِیْنَ

الْاَعْمَالْ - اے اعمال کی میزانوں آپ پر ہمارا سلام ہو۔ صَلوٰۃ۔

یہ اعمال جو تولے جارہے ہیں دراصل یہ دیکھا جارہا ہے کہ ان مثالی اعمال سے کون کتنا قریب ہے۔ جتنا ان کے قریب ہے وہ میزان میں گراں ہے اور جتنا ان سے دُور ہے اتنا میزان میں سبک ہے۔ وہ میزان میں ناقص ہے۔ عمل تولے جارہے ہیں تو اگر ہم بداعمال ہوئے تو ترازو میں کیا چیز آئے گی۔ اعمال ہی نہیں تو کیا دیکھا جائے گا۔ شروع سے لیکر آخر تک اگر سب کچھ مخالف ہی ہے۔ سچے کی اُمّت میں ہیں اور جھوٹ پر فخر ہے۔ امین کی اُمّت میں ہیں اور بے ایمانی کو عقلمندی سمجھتے ہیں ایمانداروں کو بے وقوف سمجھتے ہیں تو بتایئے اگر امین اور صادق کو معاذ اللہ آپنے کم عقل سمجھ لیا تو اپنے قول میں ان مشرکین کے ہم نوا ہوئے جو انہیں عقل سے محروم سمجھتے تھے یا مومنین کی صف میں داخل ہوئے؟

اگر ہم ان کے گروہ میں شامل ہیں جنکی شیعیت کو ہم سرمایہ نجات سمجھتے ہیں تو شیعہ کے معنیٰ ہیں کسی کی ٹولی کسی کا گروہ۔ تو پھر وہی بات کہ سچوں کا گروہ جھوٹے نہیں ہوسکتے نمازیوں کے گروہ میں بے نمازی نہیں ہوسکتے ہم ان کے تابعین ہیں امام کے۔ تو معنی ہی یہی ہیں کہ جنکی اقتدا کی جائے۔ یہ تھوڑی دیر کا امام جو جماعت کا ہے اسکی بھی جب نیت اقتدا کی تو متابعت واجب۔ رکوع اپنی جگہ عبادت لیکن امام سے پہلے ہوگیا تو نماز باطل۔ سجدہ اپنی جگہ عبادت لیکن امام سے پہلے ہوگیا تو نماز باطل۔ یہ نہیں کہ جماعت کا ثواب اسمیں سے منہا کرلیا جائے جی نہیں اصل عمل گیا اصل عمل برباد ہوا اس وقتی امام کی اطاعت اور اتباع تو صحت عمل کے لئے فرض ہے اور جو دین و دنیا کے امام ہوں جو امام مطلق ہوں ان کے نام کو حفظ کرکے اور کسی کو سُنا کر ہم یہ سمجھیں کہ کام ہوگیا متابعت کی ضرورت ہی نہ ہو۔ پیروی کی ضرورت ہی نہ ہو۔ پھر تو حقیقت میں وابتغوا الیہ الوسیلہ کا

اصل مفہوم اگر دیکھا جائے تو وسیلہ سے مُراد لینا اپنا ایمان اور اپنا عمل ہے۔ صَلوٰۃ
نا اُمید نہ ہونے کے لئے ذرائع کا اعلان کیا گیا ہے۔ مغفرت الٰہی ہے یَغۡفِرُ
لِمَنۡ یَّشَاۗءُ۔ جسکو چاہے گا بخش دے گا۔ جسکو چاہے گا۔ یہ چاہنا بلا وجہ نہیں ہے
خود میں وہ صلاحیت رکھیں کہ وہ چاہے۔ صَلوٰۃ

اسی طرح شفاعت کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ شفاعت ہے اور شفیع بھی ایک
نہیں ہے جتنی فردیں ہیں کوئی مانے یا نہ مانے۔ میں تو مانتا ہوں کہ وہ سب شفاعت
کرنے والے ہیں۔ ان کا کیا ذکر ہر مومن کو بقدر ایمان حق شفاعت حاصل ہے۔ ہر
وہ مومن جو اس لائق ہے کہ شفاعت کر سکے وہ شفاعت کریگا یہ شفاعت اس
لئے ہے کہ نا اُمید نہ ہوں۔ اسمیں بھی مراتبِ عمل ہیں۔ کوئی غلطی ایسی ہوتی ہے کہ
ممتحن کہتا ہے کہ چلو نمبر دیدو۔ اسکی نظر میں قابلِ اعتراض ہے مگر نمبر نہیں کاٹتا۔
باوجودیکہ کمی کا احساس اُسے ہے۔ یہ تو ہے یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَاۗءُ جسکو چاہتا ہے
معاف کر دیتا ہے پھر دوسرا درجہ ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے نمبر تو ہم ضرور کاٹیں گے
لیکن اگر کوشش ہوگی تو بڑھا دیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی مراتب کمزوری عمل ہیں
کہ کسی کو بغیر شفاعت خود ہی معاف کر دیا۔ کسی کو گویا ذرا اُلجھاوے میں ڈال کر شفاعت
کرا دی اور شفاعت کرنے والے بھی شفاعت چشم و ابرو دیکھ کر کرتے ہیں۔ وہ
مرضی دیکھ کر شفاعت کرنے والے ہیں۔ بغیر اسکی شفاعت کے اذن کے شفاعت
بھی نہیں کرتے۔ حکمت یہ ہے کہ میں خود تو نہ معاف کروں۔ ان کے کہنے سے
معاف کر دوں۔ اسطرح جسکو معاف کیا جا رہا ہے اسکی بداعمالی کا ایک یہ درجہ
ہے۔ بس اپنے اعمال کم از کم اتنے ہونے چاہئیں کہ شفاعت کرنے والوں سے
کہتے ہوئے شرم نہ آئے اور شفاعت کرنے والوں سے التجا کی گنجائش ہو اور
شفاعت کرنے والے بھی مناسب محسوس کریں کہ ہاں اسکی شفاعت کر دی جائے

اور اللہ کی رضا بھی انکو شفاعت کرنے کے لئے حاصل ہو۔ لہٰذا نااُمید کبھی نہیں ہونا چاہیئے۔ جتنے وقت پر بھی اصلاح عمل کر سکے کرے۔ میں کہتا ہوں اسے بھی کربلا نے ہمارے سامنے پیش کیا حُرؑ کی شکل میں کہ دیکھو کتنے سنگین جرائم۔ یعنی ہم بہر حال بھول تو نہیں سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ غور فرمایئے۔ وہ سب کچھ۔ اس نے راستہ روکا۔ وہ بندش آب کا واحد ذمّہ دار ہے یعنی اگر نہر کے پاس خیمے ہوتے تو پانی بند ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ادھر سے جو حکم تھا کہ ایسی جگہ ٹھہراو جہاں نہ پانی موجود ہو نہ گھاس موجود ہو۔ یہ حکم ہی درحقیقت بندش آب کی تمہید تھا۔ پانی بند کرنا نہ ہوتا تو یہ حکم بھی نہ ہوتا۔ پانی نہ موجود ہو تاکہ سوار پیاسے رہیں اور گھاس نہ موجود ہو تاکہ گھوڑے بھوکے مریں عرب تھے جانتے تھے کہ گھوڑا میدانِ جنگ میں برابر کا سپاہی ہوتا ہے میدانِ جنگ میں اپنے سوار کا مددگار ہوتا ہے۔ میدان کے گھوڑے دشمن کو زد پر لاتے ہیں اور دشمن کے وار سے اپنے سوار کو بچاتے ہیں۔ پس مقصد یہ تھا کہ گھوڑوں کی طاقتیں سلب ہوں اور سواروں کی طاقتیں سلب ہوں لہٰذا ایسی جگہ ٹھہراؤ جہاں نہ پانی ہو نہ گھاس ہو۔ یہ حُرؑ ہی تھا جس نے اس حکم کی تعمیل کی اور خیمے نصب نہ ہونے دیتے۔ میں جرم کی سنگینی دکھا رہا ہوں کہ سکینہ کی العطش کی ہر آواز حُرؑ کے اس اقدام کی یاد دلاتی تھی کہ اُسی نے خیمے نصب نہ ہونے دیئے ایک دن پہلے تک اسی راستہ پر رہا۔
ایک دن پہلے تک اسی فوج میں شامل رہا مگر صلاحیت ظرف موجود تھی ابھی ہمّت اتنی نہ تھی کہ دُنیا کو بالکل ٹھکرا دے مگر سمجھ رہا تھا کہ غلط راستے پر ہے اسی احساس نے منزلِ حق کے قریب کر دیا۔ خود روداد بعد میں سُنائی ورنہ دنیا اس کے واردات قلب کو کیا جانتی کہ راستے بھر اس کے کیا تصوّرات رہے ادھر سے شرائط صلح امام نے پیش کئے حُرؑ غور سے دیکھتا رہا اور شرطیں ایسی تھیں جو اُمید افزا تھیں۔ ادھر سے سردار فوج عمر ابن سعد نے خط لکھا کہ اب بنائیے جنگ کوئی نہیں رہی۔

اس لیئے کہ امام حُسین یہاں تک تیار ہیں کہ میں ملک چھوڑ دوں گا دُور دراز کسی طرف چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد جنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلا تاثر ابن زیاد کا بھی یہی تھا اس نے اپنے دربار میں کہہ دیا اس خط کو پڑھ کے کہ یہ خط بالکل خیر خواہی کا ہے جنگ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت دربار میں شمر لعین موجود تھا اس نے ایسی مفسد تقریر کی کہ خود ابن سعد کی وفاداری کو مشکوک بنا دیا۔ اس میں عہدہ کی رقابت کا بھی بڑا دخل تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے تو خبریں سُنی ہیں کہ وہ جا کر حسین سے مل گیا ہے اور آدھی آدھی رات تک آپس میں گفتگو ہوا کرتی ہے۔ ایک دفعہ کی گفتگو کو اس نے اس طرح پیش کیا کہ آدھی آدھی رات تک گفتگو ہوا کرتی ہے اور یہ بالکل دھوکہ دینا ہے۔ مزید کہا کہ اگر اس وقت حسین قبضہ سے نکل گئے تو وہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آئیں گے۔ ایسی فساد انگیز تقریر تھی کہ خود عمر سعد کے خلاف زبردست غصّہ پیدا ہو گیا کہ وہ سبکو بے وقوف بنا رہا ہے اور اسی غصّہ میں خط لکھا کہ ہم نے تم کو صلح کی گفتگو کے لیئے نہیں بھیجا ہے نہ اس لیئے بھیجا ہے کہ تم انکی سفارش ہمارے پاس کرو۔ ہم نے تو تم کو اس لیئے بھیجا ہے کہ بس یہ مطالبہ پیش کرو کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور غیر مشروط طور پر اطاعت کر لیں۔ یا پھر جنگ کرو۔ اور اگر تم تعمیل نہ کر سکو تو میں نے شمر کو ہدایت کر دی ہے۔ شمر کو ہدایت یہ تھی کہ اگر وہ تعمیل نہ کرے تو تم سردارِ لشکر ہو اور عمر سعد کا سر قلم کر کے بھیج دینا۔ یہ خط و کتابت نو محرّم کی سہ پہر تک جاری تھی اور حرُ برابر اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور اُمید کرتا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو طے ہو ہی جائے گا۔ بس یہ خط لیئے ہوئے شمر نو محرّم کی سہ پہر کو پہنچا۔ شام کے وقت وہ خط لیئے ہوئے ابن سعد کے پاس آیا تو ابن سعد خط کو پڑھ کر صورتِ واقعہ کو بالکل سمجھ گیا اس نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تم نے وہ کام خراب کر دیا جو بن رہا تھا ایک بڑا تاریخی جملہ اس نے کہا ہے

کہ بخدا حسینؑ بیعت تو نہیں کریں گے غیر مشروط طور سے اطاعت کا اقرار نہیں کریں گے طبری کے دو نسخے ہیں عام نسخہ جو چھپا ہوا اس وقت ہے وہ تو یہ ہے کہ اِنَّ نَفْسَ اَبِیَّۃً بین جنبیہ۔ ایک ذلت سے انکار کرنے والا نفس ان کے پہلو میں ہے ذلت سے انکار کرنے والا اِبا کرنے والا۔ یہ تو انکی عزت کا اقرار ہے یعنی وہ سمجھتا ہے کہ یزید کی بیعت کرنا عزتِ نفس کے خلاف ہے۔ ایک طبری کے اور نسخے میں ہے وہ نسخہ چھپے گا اور لفظیں چونکہ قریب ہیں اس لئے بہت قرینِ قیاس ہے کہ لفظ "اب" تھی جو بدل گئی ہے اِنَّ نَفْسَ اَبِیْہِ۔ اس وقت نقطے نہیں ہوتے تھے۔ حقیقتاً تحریر یہ تھی کہ اِنَّ نَفْسَ اَبِیْہِ بَیْنَ جَنْبَیْہِ۔ اس نے کہا وہ بیعت نہیں کریں گے ان کے باپ کا دل ان کے سینے میں ہے۔ میں نے عرض کیا ہم اسے غیر کے سامنے پیش نہیں کر سکتے کیونکہ چھپے ہوئے نسخوں میں نہیں ہے لیکن ہے بڑی قیمتی بات کہ بڑی دُور کی بحث کا فیصلہ ہو جاتا۔ میں کہتا ہوں اس ایک جملے سے۔ بیعت نہیں کریں گے اس لئے کہ ان کے سینے میں ان کے باپ کا دل ہے یعنی نہ ان کے باپ نے کبھی بیعت کی نہ یہ بیعت کریں گے۔ شمر نے کہا ان باتوں سے فائدہ کیا یہ بتاؤ تعمیل حکم کرنا ہے یا نہیں۔ جانتا تھا کہ نتیجہ کیا ہے کہا نہیں۔ تعمیل تو اس پر میں ہی کروں گا۔ جانتا ہے کہ موقف حسینؑ کا صحیح ہے لیکن کہہ رہا ہے کہ تعمیلِ حکم تو میں ہی کروں گا اب اگر وہ اس پہلو پر عمل کرتا تو پھر وقت صرف ہوتا دو تین دن۔ پھر وہ پیغام بھیجتا کہ بیعت کیجئے اور پھر آپ انکار فرماتے اور انکار یقیناً فرماتے لیکن چونکہ اس نے طے کر لیا کہ یہ پیغام بھیجنا حماقت ہے۔ غلط ہے کوئی فائدہ حاصل نہیں۔ لہٰذا اب اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے عاجلانہ قدم اُٹھانا تھا اس لئے بغیر اعلان ایکدم حملہ کر دیا۔ صلح کی گفتگو جاری تھی اس پس منظر میں ایکدم سے حملہ ہو گیا۔ امام نے جناب ابوالفضل العباس

سے فرمایا کہ ان کے پاس جاؤ اور ایک رات کی مُہلت لے لو۔ اس کی مصلحت امام نے یہ فرمائی کہ ایک رات میں عبادت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ اتنی عبادتوں کے بعد بھی ان کا دل بھرا نہیں ہے گویا اپنی عمر بھر کی عبادتوں کو کم سمجھ رہے ہیں کہ اس آخری رات بھی عبادت کر لیں۔ جو جو کام انجام دیئے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ جو نتیجے برآمد ہوئے وہ ہمارے سامنے ہیں اور ہماری نظر پر اس طلبِ مہلت کی قیمت ظاہر ہوئی۔ آپ غور فرمایئے کہ یہ رات اگر نہ ہوتی تو حرُ کہاں ہوتا۔ یہ رات مولا نے صرف اختیار کے لئے دیدی دوست اور دشمن کو۔ ورنہ ظالمین بہت سے بعد میں کہتے کہ ہنگامی طور پر جنگ شروع ہوگئی ورنہ ہم اس جرُم میں کبھی شریک نہ ہوتے، اور اصحاب امام کے بارے میں غلط فہمی رہ جاتی کہ ایک دم جنگ شروع ہوگئی سب پھنس گئے ورنہ موقع ملتا تو کتنے چلے جاتے۔ ایسے موقعہ پر کوئی ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہ ساتھ والوں کی وفاداری نمایاں ہوتی۔ نہ ادھر والوں کا ظلم نمایاں ہوتا۔ اس کے ساتھ اُدھر والوں نے تو اس رات سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا ممکن ہے آپ نے منبر پر سُنا ہو مگر جہاں تک میرا تاریخ کا مطالعہ ہے۔ جن کو جانا تھا وُہ جناب مسلم کی شہادت کی خبر سُن کر چلے گئے تھے۔ اب کربلا میں جتنے تھے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے ساتھ چھوڑ کر جانا گوارہ کیا ہو اُدھر والوں میں سے کسی نے فائدہ نہیں اُٹھایا مگر اِدھر اس رات کی پوری قیمت حرُ کی شکل میں آگئی۔ میں کہتا ہوں کہ حقانیت امام پر کتنی بڑی مہر تصدیق ثبت کردی کہ جتنے ہمت شکن اسباب ہوسکتے ہیں وہ سب ادھر تھے اور جتنے ہمت بڑھانے والے اسباب ہوسکتے ہیں وُہ سب اُدھر تھے مگر کوئی جھوٹی روایت نہیں کہ ادھر کا کوئی ٹوٹ کر اُدھر گیا ہو مگر اُدھر کا کوئی معمولی شخص نہیں ایک حصہ فوج کا سردار اِدھر آگیا یہی اس رات کا ماحصل ہے جو حرُ کی شکل میں ادھر آگیا حرُ کو پہلے یقین

نہیں تھا کہ جنگ ہوگی۔ اس نے ابن سعد سے گفتگو کی تو اس نے کہا کہ جنگ ضرور ہوگی اب وہ چلا ارادہ کر کے مگر چاہتا تھا کہ نمایاں نہ ہو ورنہ یہیں گرفتار ہو جاؤنگا۔ منزل پر نہ پہنچ پاؤں گا لہٰذا ابھی اس نے اپنے مقصد کو چھپایا گویا اتنی بصیرت ایمانی پیدا ہو گئی ہے کہ تقیّہ سے کام لے رہا ہے چاہتا ہے کہ مقصد پورا ہو جائے بیکار جان نہیں دینا ہے۔ وہاں پہنچ جاؤں پھر جان دینا ہے مگر بیکار جان تھوڑی دینا ہے جان کو اکارت نہیں کرنا ہے۔ لہٰذا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے مرّہ ابن قیس اسکا ہم قبیلہ اور بہت بے تکلّف دوست تھا اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔ گویا حُر کے اطمینان اور سکون میں ایک ہلچل مچ گئی حُر نے کہا وہ تم نے اپنے گھوڑوں کو پانی پلایا ہے تو اس نے کہا نہیں حُر نے کہا جاتے کیوں نہیں پلاتے کیوں نہیں۔ اس طرح اُسے ہٹایا میں کہتا ہوں یہ کہتے کہتے پیاس تو یاد آگئی ہوگی جسکا خود ذمّہ دار تھا۔ آہستہ آہستہ اور آگے بڑھا اور سمجھا کہ اب مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا مگر کسی نے کہہ دیا کہ حُر تمہارا کیا عالم ہے۔ اپنے حدود لشکر سے آگے بڑھ چکا تھا۔ کیا حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔ یعنی ابھی فوج تو بڑھ نہیں رہی ہے تم کیسے آگے بڑھ رہے ہو۔ کیا حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔ بس امام پر حملے کے تصوّر نے اس کے جسم میں تھرتھری ڈال دی غیر ارادی عمل تھا جو خلاف تقیّہ تھا اس نے کہا کہ حُرّ اگر مجھ سے کوئی پوچھتا کہ عرب میں سب سے بہادر کون ہے تو میں تمہارا نام لیتا مگر یہ کیا۔ میں تمہارا عجیب عالم دیکھ رہا ہوں۔ اب پردہ داری ممکن نہ رہی۔ حُر نے جواب دیا کہ کیا میں موت کے خوف سے لرز رہا ہوں۔ ارے میرے سامنے تو ایک طرف بہشت ہے اور ایک طرف دوزخ ہے اور مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ بہشت کی طرف جانے کا امکان ہوتے ہوئے دوزخ کی طرف جاؤں یہ کہہ کر گھوڑے کو ایسا دوڑایا کہ حدود لشکر سے نکل گیا اور امام کے قریب پہنچ گیا۔ میرے سامنے ایک واقعہ ہے کہ اس فوج

کا ایک آدمی دو دن پہلے ابن سعد کی طرف سے پیغام لیکر آیا تھا اسوقت ابو ثمامہ آگے بڑھے اور کہا کیا مطلب ہے تو اس نے اپنے لفظوں میں کہا کہ امام کے پاس جانا چاہتا ہوں انہوں نے کہا کہ امام کے پاس جانا چاہتے ہو تو تلوار مجھے دیدو اس نے کہا سپاہی اپنی تلوار کسی دوسرے کو نہیں دیتا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تلوار تمہاری ہے قبضہ پر میرا ہاتھ ہوگا۔ اس نے نہیں مانا تو واپس چلا گیا اس کی جگہ پر ایک دوسرا آدمی بھیجا گیا جس نے ان شرطوں کو مانا اور پیغام پہنچایا۔ اصحاب حسینؑ ایسے وفادار تھے۔ اور یہ نمایاں فرد جس نے راستہ روکا تھا وہ بلا مزاحمت پہنچ گئے اور اتنی قریب کہ قدموں پر سر ڈال دیا بہت دفعہ کہا کرتا ہوں کہ ہر بات راویوں نے تھوڑی بتائی ہے درایتاً غور کیجئے کہ یہ کیسے پہنچ گیا میں محسوس کرتا ہوں کہ ادھر وہ حد نظر کے سامنے آیا اور امام نے فرمادیا کہ روکنا نہیں۔ دوست ہے دشمن نہیں ہے۔ ورنہ کسی اور کا کیا ذکر حضرت عباس کے ہوتے ہوئے بلا کسی رکاوٹ کے حسین کے قدموں تک پہنچ پاتا۔ بس یہ مولا کا ظرف عالی ہے کہ۔ روایت میں یہ ہے کہ اس نے آکر ڈھال آگے لے لی۔ کچھ علما نے لکھا ہے کہ عرب میں علامت تھی کہ اگر کوئی جنگ کے لئے آتا تو تلوار ہاتھ میں لیتا تھا اور اگر سپر سامنے لے لی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ طالب امان ہے یا کوئی پیغام لے کر آیا ہے سپر سامنے لے لی اور میں کہتا ہوں کہ چہرے کو چھپا لیا تھا کہ کیا منہ دکھاؤں۔ غرض آیا اور قدموں پر سر رکھ دیا میں نے یقین کے ساتھ کہا کہ امام نے بتا دیا تھا کہ دوست آرہا ہے اور اب یہ ظرف کریم ہے کہ اس کی شرمندگی کم کرنے کے لئے فرماتے ہیں سر تو اٹھاؤ تم ہو کون جیسے پہچان ہی نہیں رہے ہیں کہ یہ کون ہے اور اب وہ اپنا تعارف کرا رہا ہے اور میں کہتا ہوں کہ خود قرار داد جرم سنا رہا ہے کہ کیا پوچھتے ہیں کہ کون ہوں وہی ہوں جو تمام مظالم کا ذمہ دار ہے وہی ہوں جس نے راستہ روکا وہی ہوں جس نے واپس نہیں جانے دیا وہی ہوں

جس نے نہر سے خیمے اُٹھوائے کیا اس کے بعد بھی میرا گناہ معاف ہوسکتا ہے اور امام نے بغیر کسی تمہید کے فرمادیا کہ ہاں ہم نے معاف کیا اللہ بھی معاف کرے۔ گویا ضمانت ہے اللہ کی طرف سے۔ میں کہتا ہوں کہ مولا نے ایک دفعہ تو فرمایا اچھا تھوڑی دیر ٹھہرو اس نے کہا حضور سب سے پہلے روکنے آیا تھا تو اب سب سے پہلے جانا چاہتا ہوں بس امام نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ذرا ٹھہرو لیکن اس نے جب یہ کہا کہ میری تمنا یہ بھی کہ پہلے آیا تھا تو پہلے جاؤں انہوں نے نہیں روکا۔ میں کہتا ہوں امام کیا روکتے انہیں احساس تھا کہ جب دشمن فوج کا سردار ہوکر آیا تھا تب تو پانی پلا دیا اور اب اپنا مہمان ہوکر آیا ہے تو ایک جرعہ آب نہیں ہے جو مہمان کی ضیافت ہوسکے تو اگر پانی نہیں پلا سکتے تو پیاسا بھی کیوں رکھیں لہٰذا امام کا مقصد بھی یہی تھا کہ ابھی آیا ہے تو ابھی جائے اور اس سے اصُول طے ہوا کہ جسے پہلے سیراب کرانا ہے اُسے پہلے بھیجتے ہیں۔ خاص الخاص اصحاب حبیب ابن مظاہر وغیرہ دوپہر تک ہیں اور جب تک اصحاب میں سے ایک بھی ہے عزیز کوئی نہ جائے یہ نہ بھیجنے کا سبب کیا ہے مولا نے حکماً جیسے روکا ہے کہ خبردار جب تک اصحاب میں سے ایک بھی ہے تب تک عزیز کوئی نہ جائے مطلب یہ ہے کہ علی اکبر تمہیں کیا حق ہے کہ کوثر پر جاکر سیراب ہوجاؤ اور میرا حبیب پیاسا رہے قاسم تم کم سن سہی مگر میرا بوڑھا مجاہد مسلم ابن عوسجہ تشنہ لب رہے اور تم جاکر سیراب ہوجاؤ۔ اسکا سبب کیا ہے ارباب عزا جب سب اصحاب چلے گئے اور پھر عزیز۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ بہتّر سب پیاسے ہیں مگر بنی ہاشم کی پیاس سب سے زیادہ۔ بنی ہاشم میں بھی جو پہلے چلا گیا اس کی پیاس بجھ گئی۔ علی اکبر کو ذرا دِل پہ داغ تھا کہ بابا کو میری پیاس کا خیال ہے اس لئے یہ روایت عموماً پڑھتے نہیں ہیں کہ جب یہ گھوڑے سے گرے تو دل پر اثر تھا کہ بابا کو میری پیاس کا احساس ہے تو انہوں نے سلام کیا اور

سلام بھی انوکھا تمام اصحاب کی آوازوں سے الگ تمام عزیزوں کی آوازوں سے الگ مجھے معلوم ہے کہ کون کیا کہتا تھا اصحاب کہتے تھے یا مولاہ ادرکنی۔ آقا میری خبر لیجیۓ۔ عزیز جسکا جو رشتہ تھا وہ کہتا تھا بھتیجے کہتے تھے یا عماہ ادرکنی یا ابتاہ ادرکنی اے بابا میری خبر لیجیۓ مگر انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اے بابا میری خبر لیجیۓ۔ انہوں نے کیا کہا۔ ابھی عرض کروں گا۔ میں کہتا ہوں انہوں نے کیوں نہیں کہا اے بابا خبر لیجیۓ۔ میں کہتا ہوں کہ ایک تو ننگ شجاعت محسوس ہوا کہ جوان بیٹا بوڑھے باپ کو مدد کے لیئے بلائے اور پھر یہ بھی احساس ہوگا کہ جو پکارتا تھا بابا جاتے تھے اور کم سے کم میں ساتھ ہوتا تھا اب میں پکاروں تو کون ہے جو باپ کے ساتھ آئے اس لئے انہوں نے کیا کہا یا ابتاہ علیک منی السلام اے بابا میرا سلام قبول کر لیجیۓ مطلب کیا ہوا کہ بابا زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس میں نے اپنا فرض ادا کیا جان قربان کر دی بس اب میرا سلام لے لیجیۓ مگر ممکن کہاں تھا کہ جو جون غلام ابی ذر کی لاش تک پر گیا ہو وہ اب شبیہہ پیغمبر کی لاش پر نہ جائے اس لئے امام چلے۔ علی اکبر کو جو اپنی پیاس کے احساس کا صدمہ تھا کہ باپ کو میری پیاس سے تکلیف ہے تو اس کے ساتھ یہ کہتے ہیں یا ابتاہ علیک منی السلام اے بابا میرا سلام لیجیۓ ھذا جدی سقانی بکاس اوفی۔ یہ میرے دادا علی کھڑے ہوئے ہیں ان کے ہاتھ میں دو جام ہیں ایک جام مجھے دیدیا ہے اور ایسا پانی پلایا ہے کہ جس سے پیاس بالکل بجھ گئی اور اے بابا ایک جام اور ہاتھ میں ہے فرماتے ہیں یہ میرے بچے حسینؑ کیلئے ہے وہ تین دن کا بھوکا پیاسا آرہا ہے۔

مجلس یازدہم

ثبوت شفاعت۔ ترکِ اولیٰ اور گناہ میں فرق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ۔

اللہ کی بارگاہ میں وسیلہ تلاش کرو کل اس پہلو کو عرض کیا کہ اسکی بارگاہ میں وسیلہ ایمان اور عملِ صالح ہے۔ اس وسیلہ کے بارے میں جو اکثریت ہے یا جو اقلیت ہے مسلمانوں کا کوئی بھی مکتبِ خیال ہے اسے اختلاف نہیں ہے لیکن اس وسیلہ کی لفظ سے ایک چیز ہے جسکا نام ہے توسل۔ اس توسل کے معنی ہوتے ہیں مثلاً پیغمبر خدا بلاتفریق فرقہ تمام مسلمانوں کے لئے متبرک ہیں اور پھر آلِ طاہرین ہمارے لئے۔ اور ایک طبقہ مسلمانوں ہی میں کا جو پیغمبرِ خدا سے توسّل کا قائل ہے۔ وہ خصوصیت کے ساتھ اس تصوّر کو نہ رکھتا ہو جو ہمارے آئمہ طاہرین کے بارے میں ہے مگر وہ دوسری لفظوں میں اولیاء اور مقربین بارگاہ الٰہی سے توسّل کا قائل ہے۔ اس عنوان کے تحت وہ ہمارے ساتھ آئمہ طاہرین کے بارے میں بھی توسّل کا قائل ہوجائیگا۔ اس منصب کے لحاظ سے نہیں جس کے ہم قائل ہیں لیکن اس عام عنوان کے تحت کہ مقرّبین بارگاہ الٰہی ایسی ہستیاں ہیں کہ اصطلاحی حیثیت سے کوئی اس عہدہ کا قائل ہو یا نہ ہو لیکن مقرّبِ الٰہی ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ صلوٰۃ

اس لئے جو پیغمبر خدا سے توسّل کا قائل ہو گا وہ لازماً اس نقطے پر بھی ہمارے

ساتھ شریک ہوگا مگر ایک طبقہ جس کا اصل مرکز نجد میں تھا اور اس کے بعد اس کے حدود بڑھ کر پورے حجاز پر چھائے اور بالواسطہ تمام دنیا پر دولت کی بنیاد پر اس کے اثرات پہنچ رہے ہیں وہ اس کا مخالف ہے۔ اسکا مسلک یہ ہے کہ توسّل کرنا ان معنی سے کہ دعامیں رسول کو واسطہ قرار دینا اور طلب حاجت میں ان کی بارگاہ میں جاکر یہ سمجھنا کہ (روضہ پر) پہنچنے سے اور دُعا کرنے سے ہماری حاجت پُوری ہوگی۔ یہ سب وہ کہتے ہیں کہ شرک ہے اور وہ ایسا شرک نہیں جو خفی ہو۔ ایک بلند معنی کے لحاظ سے ریاکاری بھی شرک کہلاتی ہے مگر وہ شرک خفی ہے۔ یہ شرک ان کے نزدیک ایسا شرک جلی ہے کہ اپنی جماعت کے سوا تمام دنیا کو واجب القتل سمجھتے ہیں چاہے بتقاضائے سیاست ان کی آواز میں دھیماپن پیدا ہوا ہو لیکن اصل مسلک ان کا یہی ہے کہ انکی جان بھی مباح یعنی جان کا بھی احترام کوئی نہیں اور تمام مسلمانان عالم کا جان ومال محترم نہیں ہے۔ ان کا قتل کرنا بھی جائز، مال لوٹنا بھی جائز۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں کو کنیز بنانا بھی جائز۔ یعنی جو مشرکین کے احکام ہیں وہی تمام دُنیا کے مُسلمانوں کے احکام ان کے نزدیک ہیں۔ اس بناپر کہ وہ توسل کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔ توسّل ان کے نزدیک ویسا ہی شرک ہے جیسا مشرکین مکہ لات ومنات کی پرستش کرتے تھے۔ چونکہ ان حضرات کے روضے توسّل کا مرکز ہیں اس لئے سب روضوں کو وہ اصنام سمجھتے ہیں بُت سمجھتے ہیں اور انکی زبان میں روضہ رسول سب سے بڑا بُت ہے۔ صنم اکبر۔ مگر اتنے طویل عرصے میں تقیّہ سے کام لے کر اسکو باقی رکھا ہے آج اس چیز کا بیان ہے جسے وہ شرک قرار دیتے ہیں اور اسے ہم عبادتِ الٰہی سمجھتے ہیں اسی توسّل کے تحت حقیقت میں مسئلہ شفاعت بھی ہے۔ بلا واسطہ اللہ سب کام کر دیتا ہے تو آخر کسی کو اُسے شفیع قرار دینے کی ضرورت کیا ہے

چنانچہ ایک رجحان یہ ہے کہ شفاعت کا تصوّر غلط ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید کی آیتیں پیش کی جاتی ہیں کہ لَیْسَ لَھُمْ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ۔ ان کے لئے نہ کوئی ولی ہے نہ کوئی شفیع ہے اور پھر روزِ قیامت کے ذکر میں قرآن مجید میں ہے کہ اس دن نہ تو فدیہ ہوگا نہ شفاعت ہوگی۔ ایک وقت میں ایک صاحب نے کتاب لکھی تھی ان کا نقطۂ نظر انکارِ شفاعت تھا۔ انہوں نے پورے قرآن سے چودہ آیتیں لکھی تھیں نفی شفاعت میں ایسی وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ۔ کہیں لَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ ہے۔

اس طرح چودہ آیتیں انہوں نے مسلسل لکھی تھیں۔ اسکی رد میں امامیہ مشن لکھنؤ سے رسالہ شائع ہوا تو اس میں میں نے بالکل صحیح حساب کے ساتھ ۲۸ آیتیں ثبوت شفاعت میں پیش کیں۔ علمِ غیب کے بارے میں ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر دس جگہ ہے کہ ایسا نہیں ہے اور ایک جگہ قرآن نے کہہ دیا کہ ایسا نہیں ہے سوا۔ تو ادھر ایک عدد سوا آیا ایک آیت میں ادھر یہ سوا ان سب آیتوں میں لگ جائے گا۔ کیونکہ اس نے بتا دیا کہ وہ حکم عام نہیں ہے اسمیں خصوصیت ہے۔ تو جب یہ خصوصیّت ہے تو جہاں جہاں وہ عام حکم ہے وہ اس خاص پر محمول ہوگا۔ کیونکہ خاص صریح ہوتا ہے اپنے مفہوم میں اور عام تو ایک اپنے الفاظ کی پیٹ میں لیتا ہے خاص جب حکم آجائے خصوصیّت کے ساتھ تو وہ ہر عام میں تخصیص پیدا کر دے گا۔ جہاں جہاں نفی شفاعت ہے (ان چودہ آیتوں کا انکار نہیں، مگر اٹھائیس آیتوں میں اِلَّا موجود ہے کوئی قید موجود ہے تو وہ اِلَّا اور وہ قید جاکر ان سب آیتوں کو مقیّد بنا دیگی تو وہ اٹھائیس آیتیں ثبوتِ شفاعت کی دلیل بن جائیں گی۔

اب قرآن مجید میں دیکھ لیجئے کہ کس کس طرح شفاعت کا اثبات ہوا ہے کہیں ایک جماعت کے بارے میں کہا گیا کہ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔ وہ لوگ

شفاعت نہیں کریں گے۔ وہ سے مُراد بعض فرشتوں کو قرار دیتے ہیں بعض ان افراد انسانی کو شفیع قرار دیتے ہیں. جو پیشِ خدا شفاعت کا حق رکھتے ہیں تو وہاں یہ جُملہ ہے کہ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔ وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اسکی جو اللہ کو پسند ہو تو اب شفاعت نہ کرنے کے ساتھ جب اِلَّا آگیا تو معلوم ہوا کہ کچھ ایسے ہیں جنکی شفاعت اللہ کو پسند ہو گی۔ صَلوٰۃ

ایک جگہ قرآن مجید میں ہے۔ میں قسمیں بیان کر رہا ہوں۔ نمونہ کے طور پر ایک ایک آیت ایسی جسمیں قید ہے پیش کرتا ہوں۔ یہاں دیکھئے کہ یہاں آیا کہ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔ اِلَّا آیا تو اس نے نفی میں انقلاب پیدا کر کے اسکو ثبوت بنایا۔ اس کے علاوہ آپ دوسری جگہ دیکھئے کہ وہاں کوئی شفیع نہیں ہے مَا مِنْ شَفِیْعٍ کوئی شفیع نہیں ہے ابھی تک نفی ہے۔ اِلَّا بِاِذْنِہٖ مگر اسکی اجازت سے تو اب جب اِلَّا بِاِذْنِہٖ آگیا تو کلّی نفی شفاعت کہاں ہوا۔ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ثبوت شفاعت کی دلیل بن گیا۔ ایک جگہ ہے کہ ما من حمیم ولا شفیع یُطَاعَ اس کے ہاں کوئی مددگار نہیں ہے اور کوئی شفاعت کرنے والا ایسا نہیں ہے جسکی وہ اطاعت کرے یعنی کوئی حکم شفاعت کرے ایسی کوئی بالادست طاقت نہیں ہے جو اس کو گویا مجبور کر سکے ایسا کوئی شفیع نہیں ہے۔ اسکو ایک مفسّر نے بڑے بلیغ انداز میں دو لفظوں میں کہا ہے کہ ایسے شفیع نہیں ہیں جنکی وہ اطاعت کرے ایسے شفیع ہیں جنکی دُعا کو وہ قبول کرے کہیں یہ کہدیا کہ شفاعت وہاں فائدہ نہیں دیگی مگر یہ کہ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَہٗ جس کے لئے اسکا اذن ہو تو اب جب اٹھائیس آیتیں اس قسم کی آگئیں کہ جس میں کہیں اِلَّا کہہ کر استثنا کیا گیا ہے اور کہیں شفیع میں قید لگا کر اس کے دائرے کو محدود بنایا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن نفی شفاعت کو نہیں ثبوتِ شفاعت کو بتاتا ہے۔ صَلوٰۃ۔

اب جو تصورات نفی شفاعت میں ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن میں ایک بات طے کرتا ہے کہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے۔ پھر وہ آیتیں تلاش کرتا ہے کہ اسکی تائید میں آیتیں کونسی ہیں اسی لئے ایسے شخص کو جو وہ آیتیں نظر آئیں اٹھائیں آیتیں نظر نہیں آئیں کیونکہ اس نے تو اپنی جگہ یہ طے کیا تھا کہ ہمکو نفی شفاعت کرنی ہے اس لئے وہ آیتیں مطلب کی نہ تھیں جن میں ثبوتِ شفاعت کا پتہ چلتا تھا۔ یہ آیتیں مطلب کی تھیں یہ دلیل ہے اسکی کہ ایسے لوگوں کو قرآن کا تابع نہیں ہونا ہے۔ بلکہ قرآن کو اپنا تابع بنانا ہے۔ کسی غرض کے تحت مطالعہ قرآن ہے اس لئے نہیں ہے کہ قرآن سے حقیقت سمجھیں یہی عموماً ہوا کرتا ہے کہ ہر ایک مناظر اپنے مطلب کی آیتیں سوچ کر پیش کرتا ہے اس لئے کہ مطلب تو اس کے ذہن میں قرآن کو دیکھے بغیر طے شدہ ہے۔ ہمیں ایک جماعت کو عادل سمجھنا ہے تو اب اس کیلئے تلاش ہے دلیلوں کی۔ بات تو ہم اپنی جگہ طے کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سے کسی کی فضیلت کا انکار کرنا ہے تو وہ انکار تو جذباتی طور پر ہے لیکن قرآن سے سند کوئی پیش کرنا ہے۔ یا یہ کہ طے تو یہ ہے کہ ہم کسی خاص حقدار کو وراثت نہیں دینگے اب اس کے لئے تلاش سے بھی آیت نہیں ملتی تو حدیث کا سہارا لیا جاتا ہے چاہے خلاف قرآن ہو۔ صلوٰۃ

تو اب اصل دلائل نفی شفاعت کے قرآن میں نہیں ہیں بلکہ ذہن میں ان کے پاس کچھ باتیں ہیں جسکی وجہ سے وہ شفاعت کا انکار کر رہے ہیں۔ تو دیکھا جائے کہ اصل باتیں کیا ہیں تو یہ کہ اگر وہ قابلِ معافی ہے تو خدا معاف کر ہی دے گا اور اگر وہ قابلِ معافی نہیں ہے تو کیا فائدہ ہوگا سفارش سے۔ تو کیا سفارش بے معنی چیز ہے ایک صورت میں بے ضرورت ہے ایک صورت میں بیکار ہے اگر وہ قابلِ مغفرت ہے تو وہ بے ضرورت ہے اور اگر قابلِ مغفرت نہیں

ہے تو بیکار ہے۔ لہٰذا شفاعت کیوں ہے۔ یہ دلیل بظاہر تو عقلی حیثیت سے بہت مضبوط نظر آتی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ شفاعت سے کہاں مخصوص ہے یہ تو ہر دعا کی قبولیت میں ہے کیونکہ وہ کام ہونا ہے تو دُعا بے ضرورت ہے اگر نہیں ہونا ہے تو دُعا بیکار ہے لہٰذا دعا کیوں مگر دُعا کا مُنکر کوئی نہیں اس لئے کہ قرآن حکم دے رہا ہے کہ فادعوانی اَسْتَجِبْلَکُمْ مجھ سے دُعا مانگو میں قبول کروں گا تو اب کوئی مسلمان رہتے ہوئے دُعا کا منکر کیونکر ہو۔ تو میں کہتا ہوں کہ شفاعت درحقیقت ایک قسم کی دُعا ہے جب وہ اصل دُعا کے منکر نہیں ہیں تو شفاعت کے کیونکر منکر ہوتے ہیں۔ جو مطلق دُعا کی صحت کا پہلو ہو سکتا ہے وہی شفاعت کا پہلو ہو سکتا ہے مگر کوئی کہے کہ یہ تو ہم پر مُسَلّے کا دباؤ ڈال کر منوالیا اچھا ہم کہتے ہیں کہ وہ دُعا ہی کیوں۔ مطلق دعا کیوں قرآن میں کیوں ہے۔ تو یہ حقیقت میں مسئلہ تقدیر سے متعلق چیز ہے اور تقدیر بڑی گہری بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مطلق فیصلہ ہو ہونیکا تو بے شک دعا بیکار اور بے ضرورت اور اگر مطلق فیصلہ ہو نہ ہونے کا تو دُعا بیکار۔ وہی بات اس صورت میں بے ضرورت اور اس صورت میں بیکار۔ وہاں طے شدہ ہے کہ یہ بات ہوگی دعا کریں یا نہ کریں تو دعا بے ضرورت۔ اور یہاں طے شدہ ہے کہ نہیں ہوگا تو دُعا بیکار۔ لیکن جب اس فاعل حکیم نے دُعا کا حکم دیا ہے تو یہ کیوں نہ سمجھئے کہ کچھ مقدرات کو اس نے مشروط کیا ہے ہماری دعا سے یعنی فیصلہ ازاوّل یہ ہے کہ اگر دُعا کریگا تو اس طرح ہوگا اور اگر دعا نہیں کریگا تو یہ کام نہیں ہوگا اب اگر ہم نے دُعا نہ کی تو اس محرومی کے ذمہ دار ہم ہوئے۔ اور پھر غور کیجئے تو وہ دُعا سے مخصوص نہیں وہ تصوّر جو ہے کہ ایک صورت میں بے ضرورت اور ایک صورت میں بیکار وہ جتنی تدابیر آپ کرتے ہیں ان سب میں ہے۔ ہر شخص اپنے مقصد کے لئے تدابیر کرتا ہے تو اگر وہ ہونے والی بات ہے

تو آپ کی تدابیر بنے ضرورت اور اگر ہونے والی بات نہیں ہے تو آپ کی تدبیر بیکار۔ جو بات دُعا کی تھی وہ آپ کی تدبیر میں بھی ہے اور پھر علاج ڈاکٹروں کو حکیموں کو سب کو نظر انداز کر دیجئے اس لئے کہ اچھا ہونے والا ہے تو دوا بے ضرورت اچھا نہیں ہونے والا تو دوا بیکار۔ اب بحمد اللہ وہ چیز ہمارے ہندوستان میں ختم ہوگئی۔ جب سے میں عراق سے آیا ہوں تو اس وقت پورے جاہ وجلال کے ساتھ ہمارے ملک میں اور خصوصاً یو پی میں بہت زیادہ تھا کہ لوگ کسبِ معاش میں یعنی تجارت وغیرہ کو ذلت سمجھتے تھے۔ شرفا فاقے کرتے تھے مگر یہ کہ محنت مزدوری یا تجارت نہیں کرتے تھے بھلا میر صاحب ہو کر دوکان کریں۔ یہ بہت شدّت کے ساتھ تھا۔ چنانچہ وہاں سے آکر میرے جو بیانات ہوئے۔ وہ تین دن مدرسۃ الواعظین میں تجارت اور اسلام کے موضوع پر ہوئے تھے اور وہ امامیہ مشن سے چھپے بھی تھے۔ "تجارت اور اسلام" تو وہ گویا افرادِ ملت میں ایک نئی چیز سمجھی گئی۔ تو اس میں میں نے عرض کیا تھا۔ اس میں دلائل جو تھے ترک تجارت اور ترک ذرائع معاش کے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کسی سے کہا ارے بھئی اس عالم میں ہو کچھ کرو انہوں نے کہا ہمارے مقدّر میں فاقے لکھے ہیں تو پھر کیا کریں۔ مقدّر میں فاقے ہیں پھر کیا کریں۔ اور ایک مسئلہ تھا کہ اللہ رزق کا ضامن ہے تو بہرحال وہ رزق تو ہمیں ملے گا۔ پھر محنت مزدوری کر کے کیا کریں۔ ایک تصوّر یہ اللہ کی رزاقیت کا تھا۔ ایک تصوّر وہی عزّت وشرافت کا تھا کہ ابھی میر صاحب کہلاتے ہیں اگر تجارت شروع کر دی تو اس چیز کا نام لیکر کہا جائے گا کہ پان والے بسکٹ والے اور مختلف چیزوں والے تو گویا عزّت خاندانی ختم ہو جائے گی۔ غرض یہ سب تصورات تھے جنکی بنا پر شرفا بھوکے مرتے تھے اور تجارت نہیں کرتے تھے۔ میرے جو بیانات ہوئے تو جناب اب ایک لہر جیسے دوڑی کہ نئی ایک بات سامنے آئی۔

لوگوں نے دوکانیں کھولنی شروع کیں تجارتیں شروع کیں اور اس کے اشتہار میں لکھا کہ انہوں نے یعنی میں نے ایسے بیانات دیئے تھے لہٰذا اسپر عمل کرنے کے لیئے ہم نے یہ کاروبار شروع کیا ہے۔ تب میں نے اک بیان میں کہا کہ اگر آپ کو تجارت کرنے کا ذوق ہوا ہے توفیق ملی ہے تو اُسے آپ ایک مصلحانہ شان سے کیوں کرتے ہیں آپ کہیئے کہ ہماری قومی ضرورت ہے۔ میرے بیان کا حوالہ دے کر گویا ایک خدمت قومی کے طور پر اُسے کرنا اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی جگہ اُسے ذلیل کام سمجھ رہے ہیں۔ اب اس تقدیر والی بات کو اس بیان میں مَیں نے کہا کہ جناب اگر آپ اس اُصول کے زندگی کے تمام شعبوں میں قائل ہوں تو میں چاہے اس اُصول کو غلط سمجھتا ہوں لیکن آپ کو بے اُصول نہیں سمجھوں گا یعنی وہی کہ بیمار ہو بچّہ لیکن آپ نہ جائیں ڈاکٹر کے ہاں اس لیئے کہ مقدّرات میں اگر ہے اچھا ہونا تو ہو جائے گا اور اس سے آگے یہ ہے کہ مقدمہ عدالت میں ہو لیکن پیروی نہ کیجیئے کہیئے کہ جائیداد اگر ملنی ہے تو مِل ہی جائے گی پیروی سے کیا فائدہ۔ ایک معمولی سی بات یہ ہے کہ میرا یہ بیان آپ کو سُننا تھا تو آپ اپنے گھر میں بیٹھے رہتے کہ مقدّر میں سُننا ہے تو سُن ہی لیں گے مگر آپ نے کب سے اپنے پروگراموں کو تبدیل کیا اس مجلس کی خاطر۔ اور کس طرح سے وقت مقررہ پر تیار ہوئے اور پھر ایک ایک قدم کی صورت میں کتنے مراحل طے کر کے اس بیان میں شرکت کی تو اگر یہ سب باتیں آپ نے خلافِ عقل نہیں کیں۔ تو طلبِ رزق کی کوشش کے لیئے تقدیر کی سپر استعمال کرنا کہاں تک معقولیّت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر کے آپ قائل نہیں ہیں بلکہ تقدیر کو اپنی بے عملی کا بہانہ بنا رہے ہیں وہی صورت یہاں ہے کہ جناب دوا کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ یہ بیکار ہے تو دُعا کرتے وقت کیوں سوچتے ہیں کہ یہ بیکار ہے۔ ہونے والا ہے تو ہو گا اور

اب میں مختصر الفاظ میں عرض کردوں کہ فلسفہ دُعا کا کیا ہے۔ فلسفہ اسکا یہ ہے کہ خالق کی مشیّت صرف ایک حاکم کی تو ہے نہیں کہ اس کو غرض تعلیم احکام سے ہو اس لئے وہ ایک فہرست احکام کی سُنا دے اور اس کے بعد مخالفت کروگے تو سزا دی جائے گی۔ اسکی حیثیت وہ بھی ہے جو ناقص درجہ پر ایک باپ کی اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے تو باپ کی یہ شان نہیں ہوگی کہ وہ بس آڈر دے دے اور پھر بے فکر ہوجائے کہ اگر خلاف کریگا تو سزا دیں گے جی نہیں وہ حکم بھی دیتا ہے اور جیسے اس کے دل کو لگی ہوتی ہے کہ یہ اس پر عمل کرے لہٰذا وہ محرکات عمل مہیا کرتا ہے اپنی طرف سے۔ ورنہ اگر یہ نہ ہوتا تو ثواب اور عذاب کے اعلانات بھی نہ ہوتے۔ خصوصاً ثواب کے اعلانات تو ہوتے ہی نہیں لیکن وہ تو چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے یہ اطاعت گزار رہیں۔ کیونکہ اولادیں بھی طبیعتیں الگ الگ ہوتی ہیں کوئی بچّہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر اسکو کہا جائے کہ یہ چیز تمکو دیں گے تو وہ چڑ جائیگا اس کی خود داری کے خلاف ہوگا۔ کوئی ایسا ہوگا کہ اس سے سزا کا ذکر کیجئے تو وہ بُرا مانے گا۔ اُسے کد ہو جائے گی۔ تو باپ اگر دانشمند ہے تو بچّوں کی طبیعت کے لحاظ سے جسے دیکھے گا کہ یہ طمع سے متاثر ہوگا اس کے لئے کچھ انعامات کا اعلان کرے گا جسے دیکھے گا کہ کڑے تیوروں سے متاثر ہوگا اس کے لئے سزا کا اعلان کرے گا کہ اگر تم نے یہ کیا تو مار کھاؤ گے جسے بلند نظر پائے گا اس کے لئے نہ ثواب کہے گا نہ عذاب کہے گا۔ کہے گا کہ ہم تم سے خوش ہوں گے تو وہ محرکات عمل بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ یادالٰہی اسکی اپنی غرض کے لئے تو ہے نہیں۔ ہم یاد کریں گے تو اسکا کیا فائدہ اور اگر ہم بھولے رہیں گے تو اسکا کیا نقصان۔ یہ یادِ الٰہی ہماری تعمیر حال و مستقبل کے لئے اکسیر ہے کہ اسکی وجہ سے ہم میں احساس فرائض پیدا ہوتا ہے اسکی وجہ سے ہم برائیوں سے بچتے ہیں تو یادِ الٰہی کا اس نے حکم

اپنے فائدہ کے لئے تھوڑی دیا ہے ہماری تعمیر حیات کے لئے دیا ہے۔ تو اب اس نے محرکات عمل پیدا کئے ہیں خدا کو یاد کرنے کے۔ لہٰذا اسکی ایک تجویز یہ تھی۔ ایک صورت یہ تھی۔ ایک ترکیب یہ تھی کہ دنیاوی ضرورتوں کو ہم اسکی دعا کیساتھ وابستہ کر دیں تاکہ اپنی دُنیا کی تعمیر کے لئے بھی ہمکو نہ بھُولے۔ صَلوٰۃ

کسی شاعر نے طنزیہ طور پر یہ کہا ہے۔ جناب امُید لکھنوی کا شعر ہے ایک طنز ہے عبادت گزاروں پر۔ اپنے اوُپر رکھ کر کہا ہے کہ ؏

گر پڑھی بھی کبھی ہم نے تو نمازِ حاجت
اپنے مطلب کے لئے یادِ خدا بھی آئی

ایک اور شعر یاد آگیا۔

گلشن دہر کی ہر شے سبب حسرت ہے
ہاتھ ملوانے کو دُنیا میں حنا بھی آئی
دردِ عصیاں جو تھا عارض تو دوا بھی آئی
قبر میں ساتھ میرے خاکِ شفا بھی آئی

انہوں نے تو طنزیہ طور پر یہ تحریر فرمایا مگر میں کہتا ہوں کہ درحقیقت اسی لئے تو دُعا کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنے مطلب کے لئے ہی سہی۔ ہماری یاد تو آئے۔ وہ تو ہمارے آئمہ نے تمثیلی طور پر اس کے لئے ایک واقعہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ایک بندہ کبھی سجدہ ہی نہیں کرتا تھا۔ ملائکہ اسکی بداعمالی پر گویا بارگاہِ الٰہی میں فریادی ہوئے کہ خداوندا یہ تیرا بندہ۔ تیری طرف سے برابر اسکو رزق مل رہا ہے اور یہ کبھی تجھے یاد نہیں کرتا تو ارشادِ قدرت ہوا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ مگر ایک جز ذرا اس کے نظامِ حیات کا بدل دو۔ ایک رگ کا نظام بدل دو۔ اب جو تکلیف ہوئی تو سر سجدہ میں رکھ کر اس نے کہا یا رب۔ تو صدائے قدرت آئی کہ ارے میں تو مدّت سے

منتظر تھا کہ تو مجھے پکارے۔ تو دُعا کا یہ فلسفہ ہے اور مقصدِ دُعا ایسا عظیم ہے کہ جس میں ذرا سا بھی کلام دو حرفی کلام بھی ہو تو وہ مبطل نماز ہو جائے اور دُعا ہر محل پر ہو سکتی ہے ایک تو جگہ مقرر کر دی گئی قنوت جو جمہور اُمّت کے ہاں نہیں ہے ہمارے ہاں ہے تو وہ قنوت دعا کا محل خاص ہے اور اس کے بعد کلیتہً کسی مقام پر بھی کلام کرنا ناجائز مگر یہ کہ دعا ہر محل پر جائز ہے۔ ہر جگہ پر دُعا صحیح ہے اور دُعا نہ کرنے والوں کی مذمّت میں قرآن میں کہا گیا ان الذین یستکبرون عن عبادتی۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبّر کرتے ہیں گھمنڈ سے کام لیتے ہیں میری عبادت کے مقابلے میں۔ تو معصومین نے اسکی تفسیر میں کہا ہے کہ یہاں عبادت سے مُراد دُعا ہے کہ جیسے اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں اللہ کی بارگاہ میں التجا کرنے کو۔ تو ان کے لئے کہا گیا کہ ان کے لئے جہنّم ہے جو تکبّر کرتے ہیں میری عبادت سے۔ معصوم نے فرمایا ہے۔ الدعا افضل العبادۃ۔ دعا عبادات میں سب سے افضل ہے۔ اور ایک حاضر نے معصوم سے سوال کیا کہ دو شخص مسجد میں داخل ہوئے۔ ایک شخص نے کثرت کے ساتھ نمازیں پڑھیں ایک نے کثرت کے ساتھ دعائیں مانگیں تو اس میں سے کس کا عمل افضل ہے۔ حضرت نے پہلے مجملاً فرمایا کہ اس کا عمل بھی ٹھیک ہے اسکا عمل بھی ٹھیک ہے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہونے کو میں پہچانتا ہوں۔ میں تو افضل کو پوچھ رہا ہوں کہ ان میں افضل کون ہے تو حضرت نے فرمایا کہ وہ جس نے دعائیں زیادہ مانگیں۔ وہ خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ نماز بقدرِ ضرورت پڑھ لی واجب ادا کرنا تھا کر لیا۔ پھر دُعائیں مانگیں۔ تو اسکی فضیلت زیادہ ہے۔ تو اب جب دُعا کرنی ہی ہے بارگاہِ الٰہی میں تو اگر وہ ہستیاں کسی دُوسرے کی مغفرت کے لئے دُعا مانگیں تو اسی کا نام شفاعت ہے۔ صلوٰۃ

تو آپ کسی دُعا میں نہیں سوچتے کہ دُعا میں کیا فائدہ اور وہاں شفاعت

ہیں سوچ رہے ہیں کہ شفاعت کرنے سے کیا فائدہ۔ ایک صورت میں ضرورت کیا اور ایک صورت میں حاجت کیا۔ وہ جو ایک تصوّر تھا جسکو عرض کیا۔ دوسری بات یہ کہ ایک تصوّر ہے کہ شفیع کے معنی ہیں فرد۔ ایک اور شفع دو۔ اسی وجہ سے نمازِ شب میں آٹھ رکعتیں تو نمازِ شب کہلاتی ہیں اور دو رکعتیں جو ہوتی ہیں وہ شفع کہلاتی ہیں۔ تو شفع کے معنی دو۔ جیسے طاق اور جفت اور ایک وتر ہے یعنی اکیلی نماز اس کے بعد قرآن مجید میں والشفع والوتر میں قسم دو کی اور ایک کی۔ اب ایسی ہی چیزیں ہیں جہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافی ہے قرآن تو سمجھتے کہ دو کون ہے اور ایک کون ہے۔ صلوٰۃ

غرض اب تصوّر یہ ہے کہ اسے آپ کہہ رہے ہیں شفیع اور شفع کے معنی وہ جو دُوسرا ہوا اسکا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے مقابلے میں وہ گویا مدِّمقابل ہے اس لئے شرک ہے۔ اسمیں تصوّرِ شرک یوں پیدا ہوا کہ یہ خدا کا دوسرا ہے۔ تو جو اصل بنیاد ہے لغوی مفہوم کی وہ مُسلّم۔ بے شک شفع کے معنی دو ہوتے ہیں اور شفیع یعنی دوسرا۔ مگر ذرا عقل سے کام لیجئے۔ کسکا دوسرا ہے۔ حقیقت میں اس صاحبِ حاجت کا دوسرا ہے کہ ابھی تک وہ ایک کی حاجت تھی اب دو کی ہوگئی۔ اس لئے شفاعت شرک نہیں ہے بلکہ شرک شکن ہے۔ صَلوٰۃ

ان وجوہ کی بنا پر شفاعت کا انکار غلط۔ قرآن میں صراحتاً شفاعت کا ثبوت ہے اور شفیع المذنبین آپ کا ایک لقب ہے مستند احادیث کی رُو سے۔ لٰہذا کسی کے بارے میں وہ شفاعت کا انکار کریں مگر بربنائے احادیث صحاح پیغمبر کو شفیع مانیں۔ پھر یہ بھی ایک صورت ہے کہ وہ شفاعت کو شرک قرار نہیں دیتے بلکہ توسّل کو شرک قرار دیتے ہیں۔ وہاں بھی ذرا لفظی بحث کرتے ہیں کہ ان سے نہ کہو کہ آپ ہماری شفاعت کیجئے بلکہ اللہ سے کہو کہ ان کو ہمارا شفیع بنا دے یعنی

یوں ناک نہ پکڑو یوں پکڑو۔ ان سے نہ کہو کہ آپ شفاعت کیجئے اللہ سے کہو ان کو ہمارا شفیع بنا دے تو اگر شفاعت کرنا ان کا شرک ہے تو خدا سے کہنا کہ اپنا تو شریک قرار دیدے۔ یعنی اگر وہ غلط ہے تو یہ تمنا بھی غلط ہے۔ غرض یہ کہ شفاعت کے متعلق وہ منکر نہیں ہو سکتے۔ مجبوری ہے قرآن میں ہے۔ احادیث صحاح میں بھی ہے قرآن میں کچھ ترکیب ہو جاتی ہے لیکن صحاح کو کیا کیا جائے کہ بخاری اور مسلم میں شفاعت کا ذکر موجود ہے۔ اُوتیتُ الشفاعۃ مجھ کو شفاعت کا درجہ حاصل ہوا ہے قرآن مجید کی آیت ہے۔ اسکی بھی تفسیر شفاعت کے ساتھ ہے کہ وہ مقام محمود جس پر اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے آپ کو فائز کیا ہے وہ شفاعت کا درجہ ہے۔ تو اب یہ تو مجبوری ہے۔ شفاعت کا انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن توسّل کا انکار رہے یعنی ان کے ذریعہ سے دُعا مانگنا اور ان کو واسطہ قرار دینا۔ کہ تجھے واسطہ ہے محمدؐ و آلِ محمدؐ کا۔ اس طرح سے توسّل کرنا یا ان کے روضوں پر جاکر دُعا مانگنا۔ یہ سب جو ہے وہ شرک ہے۔ اور تمام دنیا کے مسلمان واجب القتل ہیں ان باتوں کی وجہ سے۔ لیکن اب میں کہتا ہوں کہ آپ کہتے ہیں کہ رسول کے پاس جاکر یا کسی روضہ پر جاکر دُعا کرنے کی کیا ضرورت ہے دُعا مانگنی ہے تو اللہ سے مانگ لو۔ تو اب قرآن مجید کی آیت پڑھتا ہوں۔ قرآن مجید کی آیت ہے جسمیں راوی کا کوئی سوال نہیں ہے قرآن کہہ رہا ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَہُمْ جبکہ انہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا۔ اصطلاح قرآنی میں اپنے نفس پر ظلم کرنا گناہوں کا ارتکاب کرنا ہے یعنی گناہ کر کے وہ کسی اور کا نقصان تھوڑی کرتا ہے۔ اپنا نقصان کرتا ہے تو اِذْ ظلموا انفسھم یعنی جنہوں نے گناہ کیے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ جاؤک فستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا الرحیما۔ اگر ایسا ہوتا کہ جب انہوں نے اپنے اُوپر ظلم کیا یعنی گناہوں کے مرتکب ہوئے تو آپ کے پاس آتے

قرآن کہہ رہا ہے میں نہیں کہہ رہا ہوں ۔ جَآؤُكَ ۔ آپ کے پاس آتے ۔ فَ ۔ ف ہوتا ہے ترتیب کے لئے ۔ پرانے زمانے میں اس ف کا ترجمہ پس ہوتا تھا ۔ آپ کے پاس آتے پس اللہ سے مغفرت کے طلبگار ہوتے ۔ اب ہماری اردو پس والی نہیں رہی ۔ اب ہم ترجمے میں اسکا مفہوم یوں ادا کرتے ہیں کہ آپ کے پاس آکر اللہ سے مغفرت کے طلبگار ہوتے یعنی اپنی جگہ پر مغفرت کے طلبگار ہونے سے کام نہیں چلے گا ۔ آپ کے پاس آتے ۔ آکر اللہ سے طالبِ مغفرت ہوتے پھر پیغمبر ان کے لئے استغفار کرتے لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۔ تو اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحیم پاتے ۔ یعنی بجائے خود تو ہے ہی توّاب ۔ بجائے خود تو ہے ہی رحیم ۔ مگر ان کے لئے اُس صفت توابیّت و رحیمیّت کا مظاہرہ موقوف ہے کہ وہ پیغمبر کی خدمت میں آکر ان سے توسل کریں اور ان کے پاس آکر استغفار کریں اور پھر رسول بھی ان کے لئے استغفار کریں ۔ صرف اللہ کی طرف رجوع کر کے آپ کے سامنے کہنا کافی نہیں ہو گا بلکہ خود رسولؐ سے بھی کہیں کہ آپ ہمارے واسطے استغفار کیجئے ۔ تو پائیں گے اللہ کو توّاب و رحیم ۔ ہے تو وہ مگر یہ اس وقت پائیں گے توّاب بھی اور رحیم بھی ۔ تو اگر توسّل کوئی چیز نہ ہوتا تو رسولؐ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی ۔ اور یہ توسّل کوئی نئی چیز نہ تھا جو قرآن نے کہا ہو ۔ اس توسّل کا انبیائے سلف کے دَور میں بھی تصوّر موجود تھا ۔ قرآن کو دیکھئے سورہ یوسف میں ۔ کہ فرزندان یعقوب کیوں ان سے آکر کہتے ۔ يَآ اَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ۔ اے باپ ہمارے گناہوں کے لئے ۔ جرائم کے لئے استغفار کر دیجئے اور وہ اس پر بجائے اس کے کہ تنبیہہ کریں کہ استغفار کرنا ہے تو خود کرو ۔ میں کیوں کروں ۔ وہ وعدہ کئے لیتے ہیں کہ سوف استغفر لکم ربی ۔ مَیں اپنے پروردگار سے عنقریب تمہارے لئے استغفار کروں گا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ توسّل پر انبیائے سلف کا اجماع قائم تھا صلوٰۃ

قرآن کہہ رہا ہے کہ آپ کے پاس آتے اور آپ ان کے لیئے طالب مغفرت ہوتے تب وہ اللہ کو تواب اور رحیم پاتے یعنی رحمت الٰہی کی توجہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ آپ ان کے لیئے استغفار کریں۔ اب جو توسل کے شواہد ہیں وہ انشاءاللہ کل عرض کروں گا۔ پس ایک آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بعد اس کے معیار پر حدیثیں منتخب کر کے۔ حاکم ایک اپنے وقت کے امام فنِ حدیث تھے۔ انہوں نے مستدرک لکھی یعنی جو باتیں ان صحاح میں رہ گئی ہیں۔ اسی معیار پر اس کے لیئے انہوں نے مستدرک لکھی۔ وہ مستدرک حاکم کہلاتی ہے۔ اسمیں ایک حدیث ہے کہ جب جنابِ آدم سے ترکِ اولیٰ ہوا۔ کوئی مجرم کیا روئے گا اپنے جُرم پر جیسے انبیا ترکِ اولیٰ پر روتے تھے اور گڑگڑاتے تھے۔ اور بارگاہِ الٰہی میں مثلِ بید کانپتے تھے۔ تو وہ گناہ ہوتا تو نظرِ رحمت پھر جاتی۔ مگر وہ گناہ تو ہوتا نہیں۔ وہ انکی بلندی منزل کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ جس پر خدا تنبیہہ کرتا تھا کہ تم نے بہت بُرا کیا اور اسپر یہ ایسے لرزتے تھے جیسے کوئی ملزم بھی نہ لرزے گا۔ تو نظرِ توجہ سلب نہیں ہوتی ہے۔ اور اب اس کے لیئے میں نے کہا کہ دلیل اسکی کہ وہ گناہ نہیں تھا۔ جو بھی ہوا آدم سے نوح سے ابراہیم سے کسی سے بھی کوئی اس قسم کا فعل جسکو ہم ترکِ اولیٰ کہتے ہیں اور دُنیا اس کو خلافِ عصمت کہتی ہے۔ ہم عجیب ہیں کو ہمیں اللہ کی طرف سے بھی صفائی پیش کرنی ہے اور انبیا کی طرف سے آدم سے لیکر خاتم تک سب کی وکالت بھی ہمیں کرنی ہے۔ تو جناب اب ہم کہتے ہیں کہ ترکِ اولیٰ گناہ نہیں ہے۔ میں بس ایک مختصر سا معیار پیش کرتا ہوں کہ اگر اس عمل پر جس پر سخت سے سخت تنبیہہ ہوئی ہے عہدہ سلب ہوگیا ہو تو گناہ ہے اور اگر عہدہ برقرار رہا تو سمجھیئے کہ یہ سب ان کے مزید کمالِ نفس کے لیئے محرک کے طور پر تھا۔ یہ سب عتاب جو تھا۔ وہ محرک کے طور پر تھا ورنہ

سزا یافتہ کو پھر عہدہ نہیں دیا جاتا اسی معیار پر آدم کو دیکھئے کہ ترکِ اولیٰ تھا یا نہیں انہیں پھر زمین پر بھیجا گیا۔ آپ اسے کہتے ہیں کہ جنّت سے نکالا جانا سزا تھا میں کہتا ہوں سزا اس وقت مانوں گا کہ جب زمین پر بھیجے گئے تو وہ منصب سلب کر لیا جاتا۔ زمین پر آئے تو اُسی منصب پر آئے تو اس لئے اسے سزا تو کہا نہیں جا سکتا۔ خاصیت اُس عمل کی کہا جا سکتا ہے کہ مزید شاید جنت میں رہتے اس عمل کی وجہ سے جلدی جانا پڑا۔ مگر آئے وہ جہاں کے لئے تھے جہاں کے صاحب منصب تھے۔ اعلان یہی ہوا تھا کہ انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ۔ جنّت کے لئے پیدا ہوئے ہی نہیں تھے زمین کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ صلوٰۃ

اب حدیث جو پڑھوں گا وہ درحقیقت تفسیر قرآن ہے کہ اب اس منزل پر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر گناہ ہوتا اور یہ سب بطور سزا ہو رہا ہوتا تو خالق کو کیا ضرورت کہ ترکیب بتائے معافی کی مگر معلوم ہوتا ہے کہ نظر رحمت مڑی نہیں ہے۔ یہ تڑپ رہے ہیں اس تنبیہہ کی بنا پر رو رہے ہیں کہ میری خطا معاف کر دے میری خطا معاف کر دے قرآن کہہ رہا ہے فتلقیٰ ادم من ربہ کلمات فتاب علیہ۔ آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے یعنی خدا نے سکھایا کہ یوں کہو تو تمہاری توبہ قبول ہوگی۔ ارے تم بے چین ہو کہ تم مجرم ہو تو میں تمہیں ترکیب بتائے دیتا ہوں تاکہ تمہاری خطا معاف ہو جائے۔ میں تمہیں سکھاتا ہوں۔ ارے معاف کرنا تھا یونہی معاف کر دیتا۔ مگر نہیں۔ ان کے زخم دل پر پھایا رکھنے کے لئے خود ترکیب بتاتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ کچھ کلمات اللہ نے سکھائے جب ہی تو انہوں نے سیکھے وہ نہ سکھاتا تو کیونکر سیکھتے۔ تلقیٰ ادم آدم نے سیکھے من ربہ اپنے رب سے کچھ کلمات یعنی اُستاد نے ابھی نظر توجہ ہٹائی نہیں ہے۔ انہوں نے سیکھے۔ اپنے اللہ سے اپنے معلّم سے۔ اپنے مرکز فیض سے کچھ کلمات۔ فتاب علیہ

وہ کلمات سیکھے تو اللہ نے توبہ قبول کی۔ یعنی کلمات اپنی زبان پر جاری نہ کرتے تو وہ نتیجہ مرتب نہ ہوتا۔ یہ کلمات اسی نے سکھائے پھر یہ کلمات زبان پر جاری ہوئے تو اس نے توبہ قبول کی۔ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْم ۔ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ہے توبہ قبول کرنے والا ابھی تو اس نے بتائی یہ ترکیب خود ہی ترکیب بتائی۔ اب وہ ترکیب کیا تھی۔ قرآن کو کافی کہنے والے وہ ترکیب بتائیں کہ کیا تھی۔ صلوٰۃ

اور جب نہیں بتا سکتے تو کہیں کہ نہیں بتا سکتے پھر ہم بتائیں گے کہ وہ کلمات کیا تھے۔ تو اس مستدرک حاکم کی حدیث میں ہے جو معیار صحیحین پر پوری اُترتی ہے کہ جناب وہ کلمات جو تھے وہ یہ تھے کہ بارگاہ الٰہی میں انہوں نے عرض کیا اللّٰھم انی اسئلک بحق محمدٍ ان تغفرلی ذنبی اے میرے پروردگار میں تجھ سے سوال کرتا ہوں محمد کے حق کا واسطہ میری توبہ قبول فرما۔ یہ الفاظ تھے جو جاری کیے۔ میں کہتا ہوں کہ ان الفاظ کو توبہ کا ذریعہ قبول کیوں قرار دیا۔ میں کہتا ہوں جسکا واسطہ دلوانا تھا اس کے درجہ کو نمایاں کرنے کے لئے۔ تو آدم ابوالبشر کے وقت سے سنّت توسّل قائم ہوئی اور انہوں نے ان کے وسیلے سے دعا کی۔ اور اب ایک بہت ہی نازک بات عرض کر رہا ہوں جسے کوئی بہت ہی حد سے بڑھا ہوا سمجھ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ رسول کے معنی کیا ہیں اور رسول کی ضرورت کیا ہے۔ رسول کی ضرورت یہ ہے کہ براہِ راست خدا ہدایت نہیں کر سکتا اپنے کمال ذات کی وجہ سے۔ لہٰذا رسولؐ کی ضرورت ہوئی۔ حضور کوئی کام براہِ راست ہم نہ کر سکیں اس میں کسی سے ذریعہ طلب کرنا ہوتا ہے۔ ذریعہ کے معنی وسیلہ کے ہیں۔ خالق نے انکو اپنے اور ہمارے درمیان واسطہ بنایا۔ بغیر اس کے کام نہیں چلتا تھا۔ بس میں ایک دم کہہ دوں جو کہنا ہے کہ جب اللہ نے انکو اپنے مطلب کا وسیلہ بنایا

توہم انہیں اپنے مطلب کا وسیلہ کیوں نہ بنائیں۔ صلوٰۃ

بس ایک جملہ کہدوں کہ وہ اپنے کمال کی وجہ سے ہم تک نہیں پہنچ سکتا تھا ہم اپنے نقص کی بنا پر اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے لہٰذا اُسے بتقاضائے کمال وسیلہ کی ضرورت ہوئی اور ہمیں بتقاضائے نقص وسیلہ کی ضرورت ہے اور پھر انہوں نے ہمیں دوسرے وسیلے بتائے۔ اگر دُوسرے وسیلے بتانا نہ ہوتے تو کیوں کہتے انی تارکٌ فیکم الثقلین۔ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑتا ہوں ایک کتاب اللہ اور ایک میری عترت جو میرے اہلبیت ہیں۔ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ۔ جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وا نهما لن یفترقا حتی یَرِدَا علیّ الحوض۔ یہ کبھی ایک دُوسرے سے جُدا نہیں ہوں گے۔ میں کہتا ہوں دنیا کے سامنے دو چیزیں رکھیں کہ یہ دو چیزیں چھوڑتا ہوں اور ان کے لئے کہا کہ ان سے تمسک رکھو۔ مگر اب میں کیا کہوں اُمّت مسلّمہ کے کردار کو کہ مقام ہدایت میں جیسے وہ ایک دوسرے سے جُدا نہ تھے اسی طرح مقام مظالم میں بھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں رہے۔ اور یہ مظالم کرنے کے لئے دُنیا کی کوئی غیر قوم تھوڑی آئی۔ میں نے کہا تھا۔ انہی کے ہاتھوں قرآن بھی مورد مظالم بنا اور اہل بیت بھی مورد مظالم بنے۔ ایک ظلم تو واقعی حقیقتاً دونوں پر ہے کہ جس میں پناہ بخدا ہم بھی داخل ہیں۔ ایک تو قرآن پر ظلم یہ ہے کہ اس کو اپنی کتاب کہنے والے اس پر عمل نہ کریں تو اس ظلم میں کہیں ہم نہ شریک ہوں کہ ان کو اپنا امام کہنے والے انکی تعلیمات پر عمل نہ کریں۔ تو وہ اگر قرآن پر ظلم ہے تو یہ اہل بیت پر ظلم ہے اس کے بعد جو ظاہری مظالم ہوتے ہیں ان میں بھی قرآن اہلبیت کے ساتھ ہے اور اہلبیت قرآن کے ساتھ شریک ہیں۔ اب دو تین باتیں مسلّمات تاریخی ہیں کہ قرآن جلایا بھی گیا نیّت سے بحث نہیں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ قرآن

جلایا گیا تو اب جو قرآن کے ساتھ تھے اس میں خانہ سیدہ پر جمع شدہ لکڑیاں دیکھئے خواہ کربلا میں بلند ہوتے ہوئے شعلے دیکھئے۔ ہاں ارباب عزا قرآن پر تیر بھی برسائے گئے ہیں۔ سلسلہ بنی امیّہ کا ایک حکمران ولید ابن عبدالملک۔ اس نے قرآن سے فال دیکھی اور فال میں یہ آیت نکلی کہ وَیْلٌ لِّکُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ۔ وائے ہو ہر جبار سرکش کے لئے۔ تو بس قرآن پر غصّہ آگیا۔ قرآن کو سامنے رکھ کر اپنے ہاتھ میں تیر کمان لیکر تیر چلائے گئے جس سے اوراق قرآن پارہ پارہ ہوکر منتشر ہوگئے اس کے بعد کچھ اشعار کہے۔ یہ مسلمان صاحب اقتدار ہے جو ایک مقدس نام کے ساتھ حکومت کر رہا ہے۔ پیغمبر کی طرف نسبت دیکر حکومت کر رہا ہے اور وہ یہ اشعار پڑھتا ہے جسمیں خدا پر بھی طنز ہے۔ اور قیامت پر بھی طنز ہے سب کا انکار ان میں مضمر ہے۔ وہ قرآن سے مخاطب ہوکر کہتا ہے۔

اَتُوْعِدُ کُلَّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ فَہَا اَنَا ذَاکَ جَبَّارٌ عَنِیْدٌ
اِذَا مَا جِئْتَ رَبَّکَ یَوْمَ حَشْرٍ فَقُلْ یَا رَبِّ مَزَّقَنِیْ الْوَلِیْدُ

نام بھی اپنا درج ہے کہ سند رہے۔ تو دھمکایا کرتا ہے ہر جبّار و سرکش کو تو لے یہ میں جبّار و سرکش ہوں۔ جب اپنے پروردگار کے پاس حشر کے دن آنا تو کہدینا کہ مجھے ولید نے پارہ پارہ کیا تھا۔ دیدہ دلیری دیکھ رہے ہیں مسلمان مجرم کی۔ تو معلوم ہوا کہ تیر باراں ہوا قرآن پر۔ اب میں کہتا ہوں کہ جو قرآن کے ساتھی تھے ان کے لئے تیروں کو تلاش کرنا ہے۔ چاہے جنازہ حسینؑ پر تیروں کی بارش دیکھ لیجئے اور چاہے کربلا میں تیروں کو دیکھ لیجئے۔ مجھے مصائب میں آگے بڑھنا ہے ورنہ وہ تیر یاد دلاتا جو عاشور کے دن کے تھے۔ وہ سب آپ کے پیش نظر ہیں۔ اب تیسرا پہلو پیش کرتا ہوں کہ قرآن نیزوں پر بھی بلند کیا گیا اور ہر غیر جانبدار صاحبِ نظر منصف مؤرخ سے میرا سوال ہے کہ کیا یہ ہنگامی ایک

ترکیب تھی۔ وقتی جو اس وقت سُوجھ گئی۔ جناب پہلے سے منصوبہ بنا ہوا تھا۔ ورنہ مسجد جامع دمشق کا وہ قرآن جسکو ایک آدمی اکیلا اٹھا نہیں سکتا تھا۔ اس کو میدانِ جنگ میں ساتھ لانے کی ضرورت کیا تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے یہ روز بد پیش نظر تھا کہ جب ہماری جنگ کی تمام ترکیبیں ختم ہو جائیں گی تو آخر میں قرآن سے کام لیں گے ورنہ اسکو ساتھ لینا خلافِ فطرت ہے۔ کہاں شام اور کہاں میدان صفین۔ جو عراق کی حدود میں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے طے شدہ منصوبہ تھا۔ اس کے لئے بڑا قرآن ساتھ لایا گیا تھا تو اب میدانِ صفین کا ایک منظر ہے اور شاید مستقبل کا ایک منظر بھی بغیر میرے بیان کئے ہوئے آپ کے ذہن میں آجائے دھندلکا تھا اسوقت پوری روشنی نہیں ہوئی تھی اس دن یقین شکست تھا کہ آج میدان میں ہماری فوج نہیں رک سکتی شکست ہوگی۔ ایسا وقت کہ ابھی چیزیں صاف طور پر نظر بھی نہیں آرہی تھیں۔ پوری طرح صبح نہیں ہوئی تھی۔ اندھیرا تھا کہ اس اندھیرے میں یہ منظر نظر آیا کہ بہت سے قرآن مختلف قدوقامت کے نیزوں پر بلند ہیں اور سب سے آگے ایک قرآن اعظم جسکو ایک آدمی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ وہ جامع دمشق کا قرآن تھا۔ اُسے کئی آدمی مل کر اٹھائے ہوئے ہیں وہ سب سے آگے ہے۔ میں کہتا ہوں کوئی منظر آپ کے سامنے آیا کہ کوفہ و دمشق کا راستہ ہے اور مختلف نیزوں پر میں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ مختلف قدوقامت کے قرآن۔ کوئی جوان کا سر ہے کوئی نوجوان کا سر ہے اور کوئی بچے کا سر ہے۔ مختلف قد و قامت کے قرآن نیزوں پر بلند ہیں اور ایک نیزہ طویل پر قرآن اعظم وہ ہے جسکو سب سے آگے رکھا ہے۔ بالکل صفین کا مُرقع ہے جو آج کھنچا ہوا ہے! ربابِ عزا انھوں نے کوفہ کے بازار میں نیزے پر بھی ثابت کر دیا اپنے نانا کے ارشاد کی سچائی کو کہ دیکھو ہم سے قرآن کبھی جُدا نہیں ہوتا۔ سر اور گردن الگ ہو گئے

لیکن ہم سے قرآن الگ نہیں ہوا اس کے گواہ ہیں صحابی رسول زید ابن ارقم جنہوں نے اپنے بالاخانے پر سے جو سر راہ تھا یہ سُنا کہ قرآن مجید کی آواز آرہی ہے اور یہ آیت ہے کہ اَمْ حَسِبْتُمْ ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من اٰیٰتِنَا عجبًا۔ تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف کا واقعہ کوئی عجیب ہے تو فوراً ان کی زبان پر آیا کہ نہیں آپ کا واقعہ اس سے زیادہ عجیب ہے۔ تو یہ نیزہ پر سر ہے اور زبان پر تلاوتِ قرآن ہے۔ دیکھے دُنیا کہ قرآن جُدا نہیں ہوا۔ سر و گردن علیحدہ علیحدہ ہو گئے اور اب میں کہتا ہوں کہ وہ سجدہ آخر تھا جو عصر کو ہوا تھا اور یہ اس کے تعقیبات ہیں جو نیزے پر ادا ہو رہے ہیں۔ بہرحال انہوں نے ثابت کر دیا کہ قرآن ہم سے جدا نہیں ہوتا۔

مجلس دوازدہم

توسّل کا جواز

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۵
وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ ۔

کل سے توسّل کا بیان ہو رہا ہے جسکا ایک طبقہ منکر ہے بلکہ اُسے شرک قرار دیتا ہے ۔جب اُصول طے ہوجائے تو اس کے متعلقہ تمام اُمور طے ہوجاتے ہیں ۔ توسّل کو پیغمبر خدا کے ساتھ مرکزی حیثیت حاصل ہے جب آپ کے ساتھ توسّل شواہد سے ثابت ہوجائے گا تو پھر جتنے بھی توسل ہوں ان ہستیوں سے جو ہمارے نزدیک آپ کے اجزا ہیں وہ خود بخود ثابت ہوجائیں گے ۔ لہٰذا بس آج بھی دو چار شواہد گنجائش کے مطابق پیغمبر خدا کے ساتھ توسّل کے سلسلہ میں عرض کئے جائیں گے ۔ میں نے کل ابوالبشر کے توسّل کو بیان کیا کہ حضرت آدمؑ نے ہمارے پیغمبر سے توسّل کیا ۔ یہ مستدرک حاکم میں درج ہے جو صحیحین کے معیار پر احادیث کا صحیح مجموعہ ہے ۔ کل تھا ابوالبشر کا توسّل اور آج میں اپنی زبان میں یہ کہتا ہوں کہ میں ابو الائمہ کا توسّل پیش کر رہا ہوں ۔ آپ حضرات کے ذہن میں ابو الائمہ کے لفظ سے امیر المومنین کی ذات آئی ہوگی اور عموماً ابو الائمہ کی لفظ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے لئے ہی بولی جاتی ہے مگر آپ تو خود آئمہ میں داخل ہیں تو ابو الائمہ کون ہوا جناب ابوطالبؑ ۔ اس واقعہ کے پیش کرنے سے قبل ایک غلط آماجگاہ

بحث جوان کے ایمان کے بارے میں مدتوں سے قائم ہے اسکا ذکر کرنا مقصود ہے جب ماننا نہ ہو تو چاہے کتنے ہی دلائل پیش ہوں مرکز بحث ٹوٹتا تو ہے نہیں۔ اگر دلائل سے کوئی لاجواب ہوجایا کرتا اور قائل ہوجایا کرتا تو مباہلے کی ضرورت کیوں پڑتی۔ نہ ماننے والے کو خدا و رسول بھی نہیں منوا سکتے۔ صلوٰۃ

میں کہتا ہوں کہ مباہلے کے بعد بھی باوجودیکہ احساس حقانیت کی وجہ سے مقابلہ نہیں کیا مگر پھر بھی مانا نہیں۔ ہتھیار ڈالدیئے۔ صلوٰۃ

یہ الفاظ جو میں نے ان کے بارے میں کہے یہ امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے لئے ارشاد فرمائے۔ جو آپ سے برسرِ پیکار تھے کہ ما اسلموا ولکن استسلموا۔ یہ اسلام تھوڑی لائے تھے، انہوں نے تو اسلام کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ یہ اتنا خطرناک نہیں تھا کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی رہے کافر ہی۔ یہ ہتھیار ڈالنا زیادہ خطرناک تھا کہ ہتھیار ڈال کر منافقت کا لباس اختیار کیا۔ بنام اسلام استسلام ہوا۔ غرض یہ کہ مرکز بحث تو رہیگا قائم لیکن اس پر روشنی ڈالنا تو ضروری ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اس ذات سے مخصوص نہیں جس کے بارے میں ذکر ہو رہا ہے بلکہ ان کے آباؤ اجداد کے بارے میں بھی یہی سوال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کے لئے بھی دیکھئے کہ جس وقت ابرہہ آیا ہے جسکا تذکرہ سورہ فیل میں بطور یادگار موجود ہے۔ وہ کعبہ کو ڈھانے کے لئے آیا تھا۔ درمیان میں بہت سے لوگوں نے مقابلہ کیا۔ یہ نہیں ہے کہ لاوارث چھوڑ دیا ہو کعبے کو۔ مگر ہر ایک شکست کھا رہا تھا۔ اُس کے پاس سامان حرب اتنا تھا کہ یہ عرب اس سے مقابلہ کرہی نہیں سکتے تھے وہ لڑتا ہوا مکہ معظمہ کے قریب پہنچ گیا تھا شکست دیتا ہوا۔ بہت جگہ مزاحمت ہوئی مگر کوئی مزاحمت کامیاب نہیں ہوسکی۔ وہ پہنچ گیا کعبے کے قریب تک اور یہاں سردار

مکّہ حضرت ابوطالب کے والد بزرگوار سیّد البطحا حضرت عبدالمطلب تھے جن سے سیادت کا سلسلہ چلا اور انہی کی اولاد سادات کہلائی۔ جناب عبدالمطلب میں اس وقت کوئی اضطراب نہیں تھا۔ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ کوئی مجلسِ شوریٰ بھی مرتب نہیں کرتے کہ یہ سخت وقت پڑا ہے کیا کیا جائے۔ گویا تدبیر سوچے ہوتے ہیں کسی دوسرے سے رائے نہیں لے رہے ہیں مادّی مقابلہ کرنا ہو تو رائے لیں جب روحانی مقابلہ کرنا ہے تو جس سے لو لگانا ہے اہلِ شوریٰ اُس سے بیگانہ ہیں تو پھر مشورہ کس سے کریں لہٰذا چپکے بیٹھے ہیں لوگ آ آ کر فریاد کر رہے ہوں گے۔ اور آپس میں چرچا کر رہے ہوں گے کہ دیکھئے صاحب ان کو کوئی فکر ہی نہیں ہے یہ مطمئن بیٹھے ہیں۔ یہاں تک کہ گرد و پیش میں جب فوج آتی ہے تو لوٹ مار بھی کرتی ہے۔ کوئی جنگ بھی نہیں کر رہے ہیں مگر مالِ غنیمت لٹنا شروع ہو گیا۔ اسی میں ان کے گوسفند جو چرتے تھے وہ اسکی فوج والے لے گئے۔ انہیں خبر ہوئی اور یہ گئے اس کے پاس وہ یہ سمجھا کہ یہ مجھ سے کعبہ کی خاطر التجا کرنے آئے ہیں۔ مقابلہ تو کر نہیں سکتے میرے پاس گویا التجا لیکر آئے ہیں۔ وہ ان کے نام سے واقف تھا ان کے منصب سے واقف تھا کہ سردار قریش ہیں اور مکہ کے سردار ہیں اس نے حاجب اور دربان سے کہا کہ آنے کی اجازت دو وہ آئے تو اعزاز کیا احترام کیا۔ کافر تھا لیکن شرافت رکھتا تھا۔ دربار میں بلاتا تھا تو صاحبِ عزت کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے۔ ان کی جلالت اور وجاہت سے وہ متاثر بھی ہوا۔ ان کی شکل و شمائل اور نورانیت کا کچھ اثر اس کے دل پر پڑا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے۔ کہا کہ تمہاری فوج والے میرے مویشی لے آئے ہیں۔ میں نے کیا قصور کیا ہے۔ میری تم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ آخر میرے مویشی تم نے کیوں لے لئے۔ اس نے کہا

کہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو میرے دل پر آپ کی بزرگی کا بہت اثر قائم ہوا تھا لیکن یہ جو آپ نے مجھ سے بات کہی اسکی وجہ سے تو آپ کی وقعت میری نظر میں کم ہوگئی۔ انہوں نے کہا وہ کیوں۔ اس نے کہا کہ اتنے سے مویشیوں کے لئے آپ میرے پاس آئے ہیں اور یہ جو آپ کے آباؤ اجداد کی عزت کا باعث ہے اور آپ کی قومی عزت جس سے وابستہ ہے اس کے لئے آپ ایک حرف نہیں کہہ رہے ہیں۔ بس اب جو جواب دیا ہے انہوں نے اس سے ان کے ایمان بالغیب کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے اس سے کہا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہ مویشی میرے ہیں اس لئے مجھے انکی فکر ہوئی۔ کعبہ کا بھی ایک مالک ہے اُسے بچانا ہوگا تو بچالے گا۔ صلوٰۃ

اب دُنیا دیکھے کہ مشرکین کے معبود کعبہ میں موجود تھے یہ نہیں ہے کہ بعد میں لاکر رکھے گئے ہوں مگر عبدالمطلب نے کسی طرف جاکر التجا نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن سب کے معبود تھے مگر اِن کا معبود وہی تھا جو پردہ غیب میں ہے۔ صلوٰۃ

جو دُنیا جناب عبدالمطلب کے ایمان کو تسلیم نہیں کرتی وہ بیٹے کے ایمان کو بھی تسلیم نہیں کرتی یعنی جناب ابوطالب کے ایمان کو۔ اور اس کے لئے اپنی کتب سے جنکو انتہائی مستند تسلیم کر رکھا ہے حکایتیں پیش کر دیتے ہیں کہ ان سے رسول نے مرض الموت کے وقت کہا تھا کہ کلمہ پڑھئے لیکن انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا۔ اس پر میں نے تاریخِ اسلام میں بھی تبصرہ کیا ہے کہ بعثت سے لیکر وفات ابوطالب تک گیارہ بارہ برس ہیں۔ اس عرصہ میں رسولؐ نے کبھی انکو دعوتِ حق نہیں دی کوئی انہی صحاح میں سے غلط روایت پیش کر دی جائے جو خود ان لوگوں کی نگاہ میں غلط ہو اور صحاح میں اسکا وجود دلیلِ صحت بنایا جائے کوئی کسی کارخانے کی گھڑی ہوئی روایت پیش کر دی جائے کہ اس گیارہ بارہ برس کے طویل عرصہ میں کبھی پیغمبرؐ نے ان سے عرض کیا ہو۔ کہا ہو۔ چونکہ چچا تھے اسلئے

بطور عرض ان سے کہا ہو کہ چچا کلمہ پڑھ لیجئے۔ گیارہ بارہ برس تک میدانِ حدیث ویران ہے دنیائے اخبار سنسان ہے کوئی روایت نہیں بتاتی کہ کسی وقت رسول نے یہ کہا ہو۔ کیا ہمارے پیغمبر خدا دُنیا کے غلط معیار والے سیاست دان قسم کے آدمی تھے اور کمزور قوت ارادی والے کہ گیارہ بارہ برس دھڑکا رہا کہ کہوں گا کہ کلمہ پڑھ لیجئے تو کہیں بگڑ نہ جائیں تو جو مدد مل رہی ہے وہ موقوف ہو جائے۔ یعنی اس مدد کے خیال سے بارہ برس دعوت حق کا فرض انجام نہیں دیا جاتا۔ دُنیا بتائے کہ کیا یہ رسُول کی شان ہے گویہ سوچ رکھا ہے کہ ابھی جتنا کام نکل سکتا ہو اتنا تو نکالا جائے کہیں بھڑک نہ جائیں پریشان نہ ہو جائیں خفا نہ ہو جائیں لہٰذا کام جو نکل رہا ہے وہ بند نہ ہو جائے۔ رہی سہی جو جائے پناہ ہے کہیں وہ قابو سے نہ چلی جائے لہٰذا کام چلاتے رہو جب آخری وقت ہوگا اس وقت پیش کروں گا جبکہ معلوم ہو گا کہ اب کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اب اس کے بعد خفا بھی ہوں گے تو کیا کریں گے۔ وہ تو دُنیا سے جا رہے ہوں گے اس وقت کلمہ پڑھنے کی خواہش کروں گا اور ایک طبقہ کے ہاتھ میں ان کے عدم اسلام کی سند دیدوں گا۔ یہ صلہ ہوگا ان کی سب خدمات کا۔ کیا کسی مُسلمان کا ضمیر اپنے پیغمبر کے لئے ایسے کردار کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے اب یا کردار رسول کو بچایئے یا صحاح کی صحت کو بچایئے اور اب بات آگئی کلمہ پڑھوانے کی تو دو چار جملے اصولی اور عرض کروں کہ جناب یہ تمام مسلمانوں کا مجمع ہے کیا آپ سب کلمہ پڑھکر مسلمان ہوئے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کتنی تقریبیں ہیں جو مسلمانوں کے رواج میں داخل ہیں۔ جبو قت سے بچہ آتا ہے اس وقت سے قید رسوم میں گرفتار ہوتا ہے اور پھر قید ہستی سے رہا ہو جاتا ہے مگر قید رسوم سے پھر بھی رہا نہیں ہوتا۔ نہ جانے کتنی رسمیں مجھے معلوم ہیں۔ یہ شریعت ایسی ہے کہ ملکوں کے اختلاف سے کیا شہروں کے

اختلاف سے بدلتی ہے کہ کسی گھر میں کوئی رسم ہے کسی گھر میں نہیں۔ جو نام مجھے معلوم ہیں وہ عرض کرتا ہوں۔ جس وقت سے بچہ پیدا ہوتا ہے چھٹی ہے چلہ ہے عقیقہ ختنہ اس کے بعد کھیر چٹائی ہے اور نہ جانے کیا کیا۔ مگر مجھے کسی مسلمان کے ہاں علم نہیں ہے کہ کلمہ پڑھوائی کی رسم ہوتی ہو۔ اگر کلمہ پڑھنا اسلام کے لئے ایسی ضروری چیز ہے تو یہ مہمل رسمیں آپ اختیار کئے ہوئے ہیں اور جو جزوِ دین ہونا چاہیئے بنائے دین ہونا چاہیئے وہ بالکل نہیں ہے حالانکہ ایک اور تقریب جو مذہبی حیثیت رکھتی ہے اسکا نام رکھدیا ہے مسلمان ہونا مگر واقعی جسکا نام ہونا چاہیئے مسلمان ہونا اسکا تصور ہی نہیں ہے اور اب ایک بڑی نازک بات کہتا ہوں اپنے نقطہ نظر سے بھی۔ گویا اپنے قلبِ ایمانی پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ آخر باپ کے بارے میں یہ بحث ہے کوئی روایت بتایئے کہ کبھی بیٹے سے کلمہ پڑھوایا ہو جتنے بیٹے ہیں سب بے کلمہ پڑھے ہوئے مسلمان ہوئے ہیں جعفر بھی سابقین اسلام میں سے ہیں۔ سابق علی الاسلام نہ سہی لیکن سابقین علی الاسلام میں سے ہیں جناب جعفر طیار کے لئے بھی یہ نہیں کہ کلمہ پڑھا ہو بلکہ ان کے اسلام کی ابتدا مجھے معلوم ہے بے کلمہ پڑھے ہوئے۔ واقعہ سے ثابت کہ حضور نے نماز پڑھنا شروع کی۔ عالم ظاہر میں جیسے رسالت ظاہر ہوئی ویسے ہی نماز بے نقاب ہوئی سب سے پہلا شعار دینی بعد اسلام۔ اسکو مسلمان سنیں کہ بعثت کے بعد جس شعار دینی کا مظاہرہ ہوا ہے وہ نماز ہے۔ رسالت مآبؐ مبعوث ہوئے اور بس۔ کعبہ کے پاس آکر پہلی تبلیغ اسلام گویا یہی تھی۔ جیسے کہ مامور ہیں کہ زبان خاموش رہے کوئی تبلیغ نہ کریں مگر کعبہ کے سامنے آکر نماز شروع کر دی چنانچہ جتنی حالاتِ صحابہ میں کتابیں ہیں۔ علامہ عبدالبر حافظ ابن حجر وغیرہ کی کئی کئی ہزار صفحے کی کتابیں جو حالاتِ صحابہ میں ہیں ان سب میں یہ واقعہ درج ہے کہ عبداللہ ابن عفیف ایک شخص ہے جو

تجارت کے لیے مکہ معظمہ میں آیا کرتا تھا اور جناب عباس عمِ رسول بھی تجارت پیشہ تھے وہ بسلسلہ تجارت عباس کے پاس آیا ہے اور اس نے خود بعد میں یہ واقعہ بیان کیا ہے اور چونکہ اس نے بعد میں خود اسلام قبول کیا تو صحابہ کا جزو بنا اور اسی لیے صحابہ کے حالات کی کتاب میں اسکا تذکرہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں عباس کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک جوان آیا۔ چالیس برس کی عمر کا آدمی جوان ہی ہوتا ہے۔ دیکھنے والے کو جوان ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک جوان آیا کعبہ کے سامنے کھڑے ہوکر ایک عمل میں مصروف ہو گیا اس کے بعد ایک بچّہ آیا۔ بچے کو بوڑھا تو نہیں بتایا جا سکتا۔ بچّہ جو بھی ہے وہ بچّہ ہی ہے۔ وہ بچّہ آیا اور وہ اس جوان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ بالکل ملا ہوا تقریباً۔ کیونکہ جب ایک ماموم ہو تو وہ بالکل عقب میں نہیں ہوتا۔ یہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ وہ داہنی طرف کھڑا ہوتا ہے۔ جماعت ہو تو وہ پیچھے ہوتی ہے ابھی جماعت نہیں ہے فرد ہے۔ ہم تو فرد کے ماننے والے ہیں۔ تو جناب وہ بچّہ آکر تقریباً پہلو میں کھڑا ہو گیا اس کے بعد ایک خاتون آئی اور وہ ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی اس وقت یہ ترقی یافتہ دور نہیں تھا کہ وہ پہلو میں کھڑی ہوتی اس وقت کی خواتین اپنی توہین سمجھتی ہیں کہ پیچھے کھڑی ہوں۔ تو وہ خاتون معظمہ پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ وہ کبھی جھکے اور کبھی زمین سے متصل ہو گئے۔ میں غور سے دیکھتا رہا اور میں نے عباس سے کہا کہ میں اس وقت یہ عجیب منظر دیکھ رہا ہوں جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا تو جناب عباس نے کہا کہ وہ میرا بھتیجا ہے جو پہلے آیا اور وہ بچّہ میرا دوسرا بھتیجا ہے جو اس کے بعد آیا اور وہ میرے بھتیجے کی۔ اب میں اپنے ہاں کے محاورے کے حساب سے کہتا ہوں کہ دلہن ہے چونکہ چچا کہہ رہا ہے تو ہمارے ہاں کے محاورہ کے مطابق وہ یونہی کہے گا۔ عربی میں تو یہ محاورے نہیں ہیں۔ تو یہ اسکی زوجہ ہے جو عقب میں آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ اور میرے اس

بھتیجے کا دعویٰ ہے کہ میں خدا کی طرف سے اس منصب پر فائز ہوا ہوں جسکا نام نبوت ہے رسالت ہے اور ابھی تک ان دو کے سوا کسی نے اس کے پیغام کو قبول نہیں کیا ہے اب جو جو نام آئیں وہ سابقین میں سے نہیں ہو سکتے یہ متفق علیہ حدیث ہے جو عرض کر رہا ہوں کہ سوا ان دو کے کسی نے اس پیغام کو ابھی تک قبول نہیں کیا ہے اس کے بعد وہ کہہ رہے ہیں کہ اسکا دعویٰ یہ ہے کہ شرق و غرب عالم پر میرا پھریرا لہرائے گا اور تمام دُنیا اس نقشِ قدم پر آنے کے لئے تیار ہو گی میں کہتا ہوں کہ یہ تصور کہ میرا جھنڈا تمام دُنیا پر لہرائے گا ابھی تک مستحق انتظار ہے اب جسے توفیق ہو وہ انتظار کرے۔ صَلوٰۃ

ایک دوسری روایت تاریخ کی یہ ہے کہ چند روز جو گزرے اس پر۔ ادھر سے جناب ابو طالب کا گزر ہوا۔ ان کے ساتھ جعفر تھے۔ دوسرے بیٹے جناب امیر سے ۲۰ برس بڑے تھے۔ جناب جعفر ان کے ساتھ تھے۔ جناب طالب نے اسکو اجنبیت سے نہیں دیکھا۔ یعنی ان کو تو وہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی تھی لیکن جناب ابوطالب نے اسکو اجنبیت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ یہ جُملہ ہے تاریخ کا کہ جعفر سے فرمایا کہ اپنے چچا زاد بھائی کے دُوسرے پہلو میں تم جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھئے جو مبلّغِ اسلام ہے دنیا اس کے اسلام میں بحث کر رہی ہے۔ صَلوٰۃ

چنانچہ ان کے کہنے سے جعفر آ کر شریک ہو گئے۔ حالات صحابہ کی کتابوں میں جعفر کے حال میں دیکھئے کہ سابقین علی الایمان میں تھے۔ یہ وہی ایمان ہے جو بغیر کلمہ پڑھے ہوئے تھے اور متفق علیہ طور پر اسلام شرط صحت نماز ہے اور وہ بغیر کلمہ پڑھے ہوئے نماز میں شریک ہوئے اور پھر رسول نے نہیں کہا کہ کلمہ تو تم نے پڑھا ہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بے نیاز کلمہ تھے ان کا اسلام کلمہ پڑھ کر نہیں ہوا تھا وہ ان کا اسلام ہو گا جو رسمی طور پر اسلام لانے والے تھے۔

بس اب ان کا توسّل اس واقعہ کو پیش کر دوں جیسے میں نے وہاں کہا تھا کہ عبدالمطلب لات و ہُبل کے پاس نہیں گئے اور کسی دوسری طرف رُخ نہیں کیا ویسے ہی اس واقعہ میں دیکھ لیجئے کہ مکّہ معظمہ میں قحط پڑا ایسا کہ لوگ بھوک سے مرنے لگے اور غلّہ کی نایابی ہو گئی۔ بزرگ ہونا بڑی ذمّہ داری کا کام ہے سب سمٹ کر جناب ابو طالب کے پاس آئے کہ لوگ مر رہے ہیں کچھ کیجئے تو جناب ابو طالب نے کہا کہ اچھّا۔ گویا کہ تدبیر کرتا ہوں۔ تدبیر کیا تھی۔ معاذاللّٰہ لات و ہُبل کے پاس یہ بھی نہیں گئے اُدھر رُخ کر کے کوئی التجا نہیں کی بلکہ پیغمبر کا ہاتھ پکڑا اور ان کا ہاتھ پکڑ کے جو طریقہ استسقاء اسلام کی شریعت میں ہے کہ صحرا میں نکلو۔ نمازِ استسقاء کی ترکیب یہی ہے کہ صحرا میں نکلو۔ تو اپنے بھتیجے کا ہاتھ پکڑ کے صحرا میں لے جاتے ہیں۔ یہاں روایت کی کوتاہی ہے کہ ان کے الفاظ نقل نہیں کئے کہ انہوں نے الفاظ کیا کہے مگر یہ کہ اُدھر رُخ کر کے یعنی غیبی معبود کو پکار رہے ہیں۔ عالم مشاہدہ کے بنائے ہوئے معبودوں کو نہیں پکار رہے ورنہ جنگل میں جانے کی ضرورت نہیں تھی وہاں جا کر التجا کی۔ یقیناً واسطہ دیا لیکن چونکہ روایت میں نہیں ہے لہٰذا میں نہیں کہہ رہا ہوں کہ واسطہ دیا ساتھ کیوں لے گئے تھے۔ اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد ابر آیا۔ ابھی واپس نہیں آئے تھے کہ بادل سمٹ سمٹ کر آنے لگے۔ اور بارش ہونے لگی یہاں تک کہ روایت میں یہ ہے کہ سبزہ لہلہانے لگا اور اُونٹ جو دُبلے ہو گئے تھے وہ فربہ ہو گئے اتنا کافی غلّہ پیدا ہوا اب اس کے بعد جو انہوں نے اشعار نظم کئے ہیں وہ جزوِ تاریخ ہیں بلکہ جزوِ حدیث ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ کیا کہا ہوگا وہ اشعار یہ ہیں۔

وَاَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ثِمَالُ الْيَتَامٰى عِصْمَةٌ لِّلْاَرَامِلِ

يَلُوْذُ بِهِ الْهُلَّاكُ مِنْ اٰلِ هَاشِمٍ فَهُمْ عِنْدَهٗ فِيْ نِعْمَةٍ وَّفَوَاضِلِ

پہلی لفظ جو ہے اسکو میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ اس رشتہ کی ترجمان ہے۔ جو انہیں حاصل ہے یعنی یہ چچا ہیں اور وہ بھتیجے۔ یہ لفظ شاید کوئی دوسرا نہ کہتا کہ وابیض ارے وہ گورا چٹا۔ یہ چچا نے اپنی نگاہ سے دیکھا اور اسکو اپنی زبان میں کہا ہے کہ وہ گورا چٹا یُستَسقَی الغَمَامُ بِوجھِہِ۔ بوجھہ جس کے چہرے کے ذریعہ سے ابر سے پانی لیا جا سکے۔ وَاَبیَضُ یستسقی الغَمَام بوجھہِ۔ وہ گورا بچہ حسین کہ ابر سے طلب باراں کیا جائے۔ لفظوں میں یہ نہیں کہہ رہے کہ خدا سے طلب باراں کیا جائے۔ ابر سے طلب باراں کیا جائے جس کے چہرے کے ذریعہ سے شمال الیتامی وہ یتیموں کی جائے پناہ ہے بیواؤں کی حفاظت کا قلعہ ہے۔ یلوذبہ الحلاۃ من ال ہاشم بنی ہاشم کے وہ لوگ جو جاں کنی میں ہیں جب وقت پڑتا ہے تو اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اسی سے پناہ لیتے ہیں۔

______ تو جب اس کے پاس آجاتے ہیں تو نعمتوں میں ہو جاتے ہیں۔______ اب دیکھئے کہ یہ ابو طالب ہیں انہوں نے توسّل کیا ہے یا نہیں رسول کے ساتھ اور بھتیجے کو ان کے چہرہ سے وابستہ کیا ہے کہ ان کے چہرے کے ذریعہ سے طلب باراں ہوتا ہے۔ ابھی کوئی گستاخ جوان کے ایمان میں بحث کرے اسکو یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ ان کی کیا بات۔ ہم جسے شرک کہتے ہیں۔ وہ معاذ اللہ تھے ہی مشرک تو انہوں نے کہہ دیا کہ رسول کے ذریعہ سے طلب باراں ہوتا ہے یہ بھی ہمارے نقطہ نظر سے شرک ہی ہے مگر میں نے جو ایک لفظ بدلی تھی کہ جزو تاریخ نہیں جزوِ حدیث بھی ہے کہ اب ابو طالب دنیا سے اٹھ چکے ہیں اور پھر اتفاق سے مدینہ میں قحط پڑا اور مسلمان آئے اور انہوں نے عرض کیا کہ طلب باراں کیجئے اب رسولؐ نمازِ استسقا کے لئے جو شریعت کا جز ہے میدان میں گئے اور وہاں جا کر نماز کا جو طریقہ ہے

اس طرح دُعا کی اور پھر اسی طرح سے بادل آئے اور پھر اسی طرح سے بارش ہوئی اب لوگ آآ کر رسول کی خدمت میں مبارک بادیں دینے لگے۔ انکو کیوں مُبارک بادیں دے رہے ہیں۔ کیا یہ مبارک بادیں دینے والے سب مشرک ہیں۔ خدا کا کام ہے بارش بھیجنا۔ یہ رسول کو مبارک بادیں کیوں مل رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ رسول آپ کی بدولت جاتی ہوئی جان واپس آگئی آپ کی بدولت سب زندہ ہو گئے۔ یہ سب رسولؐ کے سر سہرا باندھ رہے ہیں ہم کوئی چیز ان سے طلب کریں تو دُنیا کہے شرک اور وہ سب اس نتیجے کو رسول سے وابستہ کر رہے ہیں اور آپ کو مبارک باد دے رہے ہیں اور رسول توحید۔ پیغمبرِ اسلام ان مبارک بادوں کو قبول کر رہے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے وہ شرک کی تائید کر رہے ہیں اور اب میں کہتا ہوں کہ پیغمبر فرماتے ہیں کہ ارے تم سب مُبارک باد دے رہے ہو کسی کو میرے چچا ابو طالب کے وہ شعر بھی یاد ہیں چونکہ خدا نے کہہ دیا تھا کہ ہم نے ان کو شعر گوئی نہیں سکھائی اس لئے وہ شعر آپ کو یاد تھے مگر اسے نبھانا تھا کہ پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ شعر گوئی سے الگ رکھنے میں شعر گوئی کی توہین نہیں تھی ورنہ آپ کے سامنے اشعار پڑھے جاتے تو آپ اسکی تائید کیوں کرتے اور شعرا کو انعامات کیوں دیتے۔ وہ شعر گوئی سے الگ رکھنا اس حکمت سے تھا جس لئے خط و کتابت سے الگ رکھے گئے تھے۔ نہ اس سے خط و کتابت کی توہین ہوتی ہے نہ اُس سے شعر گوئی کی توہین ہوتی ہے۔ تو غرض یہ کہ اشعار عموماً آپ نہیں پڑھتے تھے۔ فرمایا کوئی ہے جو وہ شعر پڑھے جیسے مشتاق ہیں ان اشعار کے۔ اور ایک فرد نے وہ اشعار پڑھے۔ یعنی اس وقت کے شعرا کے کلام سے اتنے مطمئن نہیں ہیں جتنے ابو طالب کے کلام سے مطمئن ہیں۔ اب کسی میں ہمّت ہے وہ کہے کہ چونکہ وہ مشرک تھے اب یہ رسول جو پڑھوا رہے ہیں۔ یہ کیا ہیں۔

پیغمبر توحید۔ ان اشعار کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ اب اسی کے بعد قبیلہ کنعانہ کا ایک شاعر کھڑا ہوتا ہے اس نے دیکھ لیا کہ رسول کو وہ اشعار بہت پسند ہیں تو اب وہ جو اشعار نظم کرتا ہے اس موقعہ پر اس میں حوالہ دیتا ہے ابو طالب کا۔ یہ رکے قافیہ میں اشعار تھے۔ درحقیقت پس منظر میں ابو طالب کا شعر ہے۔ بعض وقت شعر بتا دیتا ہے کہ کونسا شعر اس کے ذہن میں ہے اور کس کے تتبع میں اس نے کہا ہے انہوں نے چونکہ یہ شعر کہا تھا کہ وَاَبْیَضُ یُسْتَسْقَیْ الْغَمَامُ بِوَجْھِہٖ وہ گورا جس کے چہرے کی بدولت ابر سے بارش آتی ہے تو یہ جو شعر کہتا ہے مطلع ہی میں کہتا ہے بِوَجْھِہِ النَبِیِ سُقِینَا الْمَطَرَ۔ نبی کے چہرے کی بدولت ہمیں بارش نصیب ہوئی معلوم ہوا سبق لیا ہے ابو طالب سے۔ صلوٰۃ

اب یہ بات سنکر رسول کو فوراً ٹوکنا چاہیئے تھا کہ یہ میرے چہرے کو کیوں کہہ رہے ہو مگر نہیں رسول خاموش ہو گئے بعد میں اسے داد دی کہ بہت اچھے شعر تم نے کہے ہیں اور اس کے بعد تو وہ شاعر کھل گیا اس نے کہا وکان کما قال لہ عمہٗ۔ اور وہ ویسے ہی ثابت ہوا جیسا ان کے چچا نے کہا تھا اور چچا کی تصریح کر دی دوسرے مصرع میں ابو طالبٍ جو ان کے چچا ابو طالب نے کہا تھا ویسے ہی ثابت ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان کا عمل پیغمبر خدا کے دل میں گھر کئے ہوئے تھا اور ان کے اشعار آج تک آپ خود یاد کرتے تھے اور روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ آپ نے لوگوں سے کہا کہ پڑھو میرے چچا ابو طالب کے اشعار۔ پڑھو کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ تو اب کون ہے صحیح مسلمان کہ جو توسّل کا منکر ہو اور اُسے شرک قرار دے اور اب آخر کلام میں میں خود رسول کا توسّل پیش کرتا ہوں۔ رسول کس سے توسّل کریں۔ جیسے خدا کس کی تسبیح کرے تو خدا جب تسبیح کرے گا تو سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ کہکر خود اپنی

ہی تسبیح کرے گا ویسے ہی اب پیغمبر دُنیا کو یہ اُصول بتانے کے لئے کہ توسّل شرک نہیں ہوتا خود توسّل فرما رہے ہیں مگر یہ کس سے توسّل کریں۔ آدم ان سے توسّل کریں۔ یہ کس سے توسّل کریں۔ تو جیسے اللہ تسبیح پڑھتا ہے مگر اپنی۔ ویسے ہی یہ توسّل کرتے ہیں پہلے اپنا نام لیتے ہیں پھر سب انبیا کا اپنے ساتھ شریک کر کے نام لیتے ہیں۔ وہ کب کا واقعہ ہے میں نے جب ابو طالب کو ابوالائمہ کہہ دیا تو بالکل آسان ہے میرے لئے کہ ام الائمہ کی وفات کا وقت آیا یعنی جناب فاطمہ بنت اسد۔ ان کا سابق الاسلام ہونا دنیائے اسلام میں مرکز اجماع۔ کہ یہ سابقین اسلام میں سے ہیں۔ ابو طالب کے ایمان میں تو شک کرتے ہیں لیکن ان کے ایمان میں کوئی شک نہیں۔ حالانکہ رسول نے اسلام کے بعد اپنی بیٹیوں کے نکاح تڑوا دیئے۔ جو کافروں کے ساتھ تھے مگر ایک ہستی ہے کہ جو سابق علی الاسلام ہے اور وہ آخر حیات تک ابو طالب کے حبالہ عقد میں ہے۔ ان پر بس نہ تھا تو چچی سے کہہ سکتے تھے کہ اب آپ کے لئے الگ ہو جانا واجب ہے مگر جس ڈر سے کلمہ نہ پڑھوایا معاذ اللہ اسی ڈر سے یہ ہمت نہ ہوئی کہ گھر کے اندر تفرقہ ڈال دیں وہ آخر تک ابو طالب کے حبالہ عقد میں رہیں وہ مہاجرات میں سے بھی ہیں۔ یعنی ہجرت تک وہ زندہ تھیں۔ یعنی ابو طالب کی تو وفات ہو گئی تھی دو برس پہلے۔ مگر وہ ہجرت کے وقت زندہ تھیں اور حضرت علی ابن ابی طالب جب مکّے سے روانہ ہوئے رسولؐ کی حفاظت کا فرض ادا کر کے اور مشرکین کی امانتیں واپس کر کے جب آپ مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تو روایت میں یہ ہے کہ فواطم کو اپنے ساتھ لے لیا۔ ہمارے پنجتن پاک میں چار وہ ہیں کہ جن کے نام عرب میں اس سے پہلے نہیں ہوتے تھے۔ وہ صرف اللہ کے رکھے ہوئے نام تھے مگر فاطمہ اس سے پہلے بھی خواتین کا نام ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ لفظ ہے وہاں کہ فواطم کو

لے کر روانہ ہوئے۔ فاطماؤں کو لیکر روانہ ہوئے تو فاطمائیں کون ہیں۔ فاطمہ بنتِ اسد ہیں۔ فاطمہ بنت رسولؐ ہیں اور فاطمہ بنت زبیر ہیں۔ ان فواطم کو لے کر روانہ ہوئے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں آکر فاطمہ بنت اسد کی وفات ہوئی۔ امیرالمومنین نے آکر عرض کیا کہ میری ماں کی وفات ہوگئی ہے روایت میں ہے کہ رسول نے اسی وقت فرمایا کہ یہ نہ کہو کہ میری ماں۔ تم کیوں کہتے ہو میری ماں مجھ سے کہو آپ کی ماں۔ اس کے بعد جب لاش پر آئے تو اس وقت بھی آپنے فرمایا یہ جملہ یہ لفظیں متفق علیہ ہیں۔ یا اُمّی بعد امّی۔ اے میری ماں کے بعد میری ماں۔ ایک اور بحث ہے یاں اس کے لئے کہہ رہا ہوں کہ دیکھئے مردے سے خطاب کر رہے ہیں رسول اے میری ماں کے بعد میری ماں۔ اب کچھ آنسو بھی ٹپکے تجہیز و تکفین کا جو سامان فرمایا تو روایت میں ہے کہ قبر کھودنے میں خود شریک تھے مٹی نکال نکال کر خود الگ رکھ رہے تھے جب قبر تیار ہوگئی تو قبر کے اندر تشریف لے گئے خود لیٹے اس قبر کے اندر۔ اس کے بعد ان کو قبر میں لٹایا گیا اور دفن کیا گیا تو پیغمبر نے فرمایا اللہ الذی یحی ویمیت اے اللہ جو زندہ کرتا ہے اور موت عطا کرتا ہے وھو حیّ لا یموت اور وہ زندہ ہے جسکو موت نہیں ہے یہ اللہ کی طرف رُخ کر کے کہا اللّٰھم اغفر لامی فاطمہ بنت اسد۔ اے پرورگار میری ماں۔ اب ان کے کردار کا خدا کو گواہ بنا رہے ہیں کہ میری ماں فاطمہ بنت اسد کو بخش دے۔ اسپر اپنی رحمت نازل فرما بحق نبیؐ۔ دیکھئے خدا اپنی تسبیح پڑھتا ہے اور یہ اپنا واسطہ دیتے ہیں۔ صرف ہمیں یہ اُصول بتانے کے لئے کہ واسطہ دینا شرک نہیں ہے۔ توسّل شرک نہیں ہے بحق نبیٍ و انبیاء لک۔ نبی کے حق سے۔ یہ خود ہیں اور تمام اپنے انبیا کے حق سے میں کہتا ہوں پیغمبر توحید خود توسّل کر کے اُصول قائم کر رہے ہیں کہ اگر مرکز توجہ اللہ ہو

تو پھر واسطہ دینے میں توسّل کرنے میں شرک نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں یہ تو سب زندگی میں توسّل ہے رسولؐ سے ۔ اس سے ہمیں اختلاف نہیں مگر بعد رسول قبر رسول پر آکر توسّل شرک ہے ۔ یہ جتنے شواہد ہیں سب حیاتِ رسول سے متعلق ہیں ۔ اور سوال جو ہے ہمارا وہ بعد حیات رسول ہے ۔ مجملاً چند اصُولی باتیں عرض کرنا ہیں ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو بات شرک ہے وہ زندہ کے ساتھ ہو تو بھی شرک مُردہ کے ساتھ ہو تو بھی شرک ۔ کیا زندہ کو شریکِ خدا کرنا جائز ہے اور مُردہ کو شریک خدا کرنا ناجائز ہے جو شرک ہے وہ زندہ کے لئے ہو تو شرک مُردہ کے لئے ہو تو شرک ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ مُردہ مانتے ہیں تو اگر کوئی مُردہ کو پکار رہا ہے تو مہمل ہوگا فضول ہوگا مگر شرک کیونکر ہوگا ۔ یہ ایک اصُولی بات کہ شرک میں زندہ اور مُردہ کا کوئی فرق نہیں ۔ کیونکہ شرک شان خدا کے لحاظ سے ہے ۔ بندے میں حیات و موت کا فرق ہوتا ہے ۔ شان خدا میں حیات و موت کا فرق نہیں ہوتا لہٰذا جب اصُول ثابت ہو گیا کہ توسل شرک نہیں ہے تو بحالت حیات توسّل ہوگا تو شرک نہیں ہوگا بعد وفات زیادہ سے زیادہ بیکار ہوگا مگر شرک نہیں ہوسکتا ۔ یہ تو ایک اصُولی بات ہوئی ۔ دوسرے ایک شاہد پیش کردوں بعد وفات کا بھی ۔ اس کے بعد تیسری اصُولی بات کروں ۔ بعد وفات رسول قحط پڑا ۔ اب کیا کریں لوگ اسوقت تو رسول کے پاس آئے تھے ۔ بعد وفات رسول جو قحط پڑا تو یہاں آئے اس سے ظاہر ہے کہ آنے والے کس مسلک کے ہیں پہلے رسول کے پاس آتے تھے ۔ اب جناب امّ المومنین کے پاس آئے ۔ کسی اور کو نہیں مان رہے تھے ۔ جناب امّ المومنین کے پاس آئے اور کہا کہ لوگ مر رہے ہیں رسول تو اب رہے نہیں کیا کریں ۔ جناب ام المومنین نے ترکیب بتائی ۔ قرآن کی زبان میں تو جتنی فردیں ہیں سب ام المومنین ہیں مگر اس لفظ سے ذہن ایک

ہی قابلِ احترام فرد کی طرف جاتا ہے۔ یہ آئیے کہ کیا کیا جائے تو چونکہ فقیہ اُمّت بھی وہی تھیں۔ مرتبہ اجتہاد پر فائز بھی وہی تھیں۔ اس لیئے ان کے پاس آئے کہ کیا ترکیب ہے تو انہوں نے یہ ترکیب بتائی کہ مجھ سے ترکیب سنو۔ معلوم ہوتا ہے کچھ عمارت بن گئی تھی قبرِ رسولؐ بے حجاب نہ تھی۔ حجرے میں تھی۔ کہا کہ ایک روشن دان بناؤ کہ آسمان اور قبرِ رسولؐ کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے۔ یہ ترکیب ہے۔ دیکھا آپ نے کہ جس طرح رسول مرکزِ رحمت ہیں اسی طرح ان کے نزدیک قبرِ رسولؐ بھی مقناطیسِ رحمت ہے اور ابھی وہاں فقط رسول ہیں کوئی شریک نہیں ہے۔ کہا بس ایک روشن دان بنا دو کہ قبرِ رسول بے نقاب ہو جائے آسمان کے نیچے۔ ظاہر ہے نیّت تو اللہ جانتا ہے کہ یہ عمل کیوں کیا ہے۔ جو ترکیب بتائی اس پر عمل کیا اور ترکیب کامیاب ہوئی بارش ہوئی اور خوب ہوئی اور جو مقصد یا مطلب تھا وہ حاصل ہو گیا جناب یہ توسّل قبر کے ساتھ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اب کسی میں ہمّت ہو تو وہ جناب ام المومنین پر فتویٰ صادر کرے۔ یہ پہلے دَور کی بات ہے۔ دُوسرا دَور آگیا اور قحط پڑا۔ خالق کو بھی اُصول توسّل کو ہر نقطۂ نظر کے آدمی دکھانا ہے کہ پہلے دَور میں قحط پڑا تو اس ترکیب سے دُور ہوا دوسرے دَور میں پھر قحط پڑا اسو قت لوگ ام المومنین کے پاس آئے۔ اب خود زمام امور جن کے ہاتھ میں ہے ان کے پاس آئے اور کہا لوگ مر رہے ہیں کچھ کیجئے کوئی تدبیر کیجئے۔ رسول ہیں نہیں ان سے توسّل کیونکر کیا جائے۔ بغیر کسی اس طرف کی نسبت کے کوئی لائق توسّل نظر نہیں آتا۔ جن افراد کو ہم پہچانتے ہیں انہیں مرکزِ توسّل بنانا خلاف سیاست ہے۔ اسلیئے بہت غور کرنا پڑا اس کے بعد سیاست دانی تو مسلّم ہے کہ ترکیب سمجھ میں آگئی کہ جناب عباس عمِ نبیؐ کو ساتھ لیا اور ان کو لیکر میدان میں نکلے۔ گئے۔ کبھی مدد حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی مگر خدا کے ہاں کی بات

تھی تو بغیر انکی مدد کے کام نہیں چل سکتا۔ جناب عباس کو اپنے ساتھ لے کر گئے۔ نمازِ استسقا پڑھی اور ان الفاظ کے ساتھ دُعا کی کہ پروردگار! اس وقت ہم تیرے نبی کے ساتھ توسّل کیا کرتے تھے مگر اب رسول تو دنیا میں ہیں نہیں تو ہم تیرے رسول کے چچا کے ساتھ۔ ان کا نام نہیں لیا ورنہ مرکز توجہ نہ بنتا۔ رسول کی طرف نسبت دیکر دُعا کی حقیقت میں توسّل رسول ہی کے ساتھ تھا۔ نتوسّل الیك بعمّ نبینا۔ اپنے پیغمبر کے چچا کے ساتھ ہم توسّل کرتے ہیں تیری بارگاہ میں۔ بس اس رشتہ کو کہکر جب رسولؐ کا قدم بیچ میں لے آیا گیا تو پھر بادل جھوم کر اُٹھا اور پھر بارش ہوئی اور دُنیا نے مُبارک بادیں دیں۔ مابدولت کو نہیں دیں۔ جتنے آئے وہ سب جناب عباس کو مُبارک بادیں دیتے ہوئے ان الفاظ میں کہ مبارک ہو اے حرمین کو سیراب کرنے والے حنیئاً لك یا ساقی الحرمین۔ ان سے کہہ رہے ہیں سیراب کرنے والے تو کیا سب مشرک۔ کسی کا ضمیر گوارہ کرے ان سب کو مشرک قرار دینا تو اس عمل کو شرک قرار دے ورنہ پھر ماننا پڑے گا کہ اگر دل و دماغ کے اندر خدا کا تصوّر ہے تو کسی کو کہیئے کہ اس نے اولاد ہمیں دی کسی کو کہیئے کہ اس نے وسعتِ رزق ہمیں دی۔ کوئی بھی عمل بحیثیت وسیلہ منسوب کر دیجئے تو شرک نہیں ہوگا۔ صلوٰۃ

تیسرا اصُولی سوال ہے۔ یہ سوال اس وقت ہے جب ہم پیغمبر کو مُردہ مانیں یہ ایک طبقہ میں بہت معرکتہ الآرا مسئلہ ہے۔ حیات النبی اور موت النبی۔ یہ رسالے کی شکل میں امامیہ مشن لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے اس رسالے کا نام یہ ہے کہ واقعہ وفات رسول اور عقیدہ حیاۃ النبی۔ اگر ہم مُردہ مان لیں تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے مگر ہم اس معنی سے مُردہ مانتے نہیں۔ وہ طبعی موت ہے جسکا نام ہمارے نزدیک وفات ہے جس معنی سے ڈاکٹر اور حکیم تشخیص کرتے ہیں کہ یہ زندہ ہے یا مُردہ ہے۔ وہ وفات سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ جو حیاۃ النبی کا قائل ہے

وہ بھی کیا اس موت کا منکر ہے۔ اگر اس موت کا منکر ہوتا تو جانشینی کا مسئلہ ہی کیوں پیدا ہوتا اگر کوئی اس موت کا منکر ہوتا تو میراث کا مسئلہ ہی کیوں پیدا ہوتا اس موت کا کوئی منکر نہیں ہے جو تاریخ کی زبان میں موت ہے ان معنی سے کیا موت شہدا کے لئے نہیں ہے جو رسولؐ کو مُردہ سمجھتے ہیں وہ بھی قرآن کی مجبوری سے شہدا کو زندہ سمجھتے ہیں۔ تو کیا ویسی موت شہدا کے لئے نہیں ہے۔ اگر شہدا کے لئے ویسی موت نہ ہو تو کسی شہید کی بیوہ کو عقد ثانی کا حق نہیں ہونا چاہیئے اگر اس معنی کی موت نہ ہو تو شہید کی میراث تقسیم نہیں ہونی چاہیئے۔ اس معنی کی موت شہید کے لئے بھی یقینی مگر قرآن کہہ رہا ہے کہ زندہ ہیں لہٰذا کسی بھی ملک کے رہنے والے ہوں کسی بھی نقطۂ نظر کے افراد ہوں۔ وہ شہدا کو زندہ سمجھنے پر مجبور ہیں۔ شہدا کی حیات کی دو۲ آیتیں ہیں قرآن میں۔ کسی میں کلمہ حصر نہیں ہے۔ آیۂ تطہیر کی بدولت آپ کو کلمہ حصر معلوم ہو گیا ہے۔ اِنَّمَا یعنی کلمہ حصر نہیں ہے۔ کہ شہید ہی بس زندہ ہیں۔ نہ لا تقولوا والی آیت میں نہ لا تحسبن والی آیت میں کسی جگہ کلمہ حصر نہیں ہے۔ ثبوت حیات شہدا قرآن سے حاصل ہے لیکن شہدا کے علاوہ کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا یہ کسی ایک آیت قرآن سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ انحصار حیاتِ شہدا کے بارے میں کسی آیت قرآن سے اظہار نہیں ہوتا اور میں ایک سوال ضمیر ایمانی سے کرتا ہوں کہ شہادت ہے کیا چیز۔ بڑا بلند مرتبہ ہے شہادت کا مگر میں کہتا ہوں کہ شہادت رسول کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے۔ جس ہستی کی ایک تعلیم پر عمل کرنے سے حیاتِ جاودانی ملتی ہو دوسرے لفظوں میں یوں کہوں کہ جس کے دروازے سے حیاتِ جاودانی کی بھیک تقسیم ہو رہی ہو اسکو میں مُردہ مان لوں۔ ایک حقیقت قرآنی اور ایک اصولِ عقلی۔ وُہ یہ ہے کہ ہماری نیند بھی ایک قسم کی وفات ہے از روئے قرآن۔ قرآن

یں ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتہا۔خدا توفی کرتا ہے نفوس کا ان کی موت کے وقت اور جو نہیں مرے ہیں اِن کی نیند کے وقت۔یعنی اس معنی سے ہم روز مرتے ہیں روز جیتے ہیں۔ــــــــــــــــ قبض روح دونوں کا ہوتا ہے ایک مفہوم کے لحاظ سے۔ــــــــــــــــ ــــــــ جسکو کہ مختتم موت دیتا ہے اسکی رُوح کو روک لیا جاتا ہے اور جسے ابھی زندہ رکھنا ہے اسکی روح کو واپس کر دیا جاتا ہے اسکا نام بیداری ہے۔ تو ہر آدمی کی روز وفات ہوتی ہے۔یہ حقیقتِ قرآنی ہے۔اب ایک متفق علیہ حدیث۔معجزہ رسول بھی اس کے ضمن میں ہے۔پیغمبرِ خدا نے ارشاد فرمایا کہ میں سوتے میں بھی اس طرح دیکھتا ہوں جسطرح بیداری میں دیکھتا ہوں اور سوتے میں بھی اسطرح صدا سُنتا ہوں جسطرح بیداری میں سُنتا ہوں یہ متفق علیہ حدیث ہے۔بس ایک عقلی اصُول۔میں کہتا ہوں کہ جسکا خواب مثل بیداری ہوگا اسکی موت مثلِ حیات ہوگی۔صَلوٰۃ

اب کچھ اور حدیثیں عدم انحصار کے بارے میں۔کہ انحصار نہیں ہے شہدا میں۔یہ قرآن سے ثابت ہے۔متفق علیہ حدیث ہے۔امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں ڈیڑھ صفحے میں لکھا ہے جملوں کا وُہ پورا سلسلہ۔اسمیں کا ایک جملہ آپ سُنتے ہیں وہ ڈیڑھ صفحے کی حدیث کا جز ہے کہ من مات علی حب الِ محمد مات شہیدا۔جو محبّت آلِ رسول میں دنیا سے گیا وہ شہید گیا۔اب یہ ہر صاحب فہم سے سوال ہے کہ کیا پیغمبر یہاں کوئی واقعہ تاریخی بیان فرما رہے ہیں کہ جو مُحبِ اہل بیت ہے تو سمجھ لو کہ ضرور کوئی معرکہ ہوگا اور اس معرکہ میں ضرور وہ دُشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہوگا تو یہ بدیہی طور پر غلط ہے یہ واقعہ تاریخی مستقبل کا بیان نہیں ہے۔جب یہ نہیں ہے تو یقیناً یہ استعارہ ہے استعارے

کی بُنیاد تشبیہہ پر ہوتی ہے۔ تشبیہہ میں ایک شبہ ہوتا ہے ایک مشبہ بہ ہوتا ہے ایک وجہ شبہ ہوتی ہے۔ جب حرف تشبیہہ ہو تو اسکو تشبیہہ کہتے ہیں اور جب تشبیہہ کی بنیاد پر وہی لفظ صرف کر دی جائے تو اُسے استعارہ کہتے ہیں وہاں مشبہ مشبہ بہ اور وجہ تشبیہہ کہلاتا ہے یہاں مستعار اور مستعار منہ کہلاتا ہے۔ آدمی بہادر ہے اسکی تشبیہہ دیدی شیر کے ساتھ۔ مثل شیر کے۔ مثل زیچ سے نکال دیا۔ شیر کہہ دیا۔ نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے۔ یہ نہیں کہا کہ آدمی جو مثل ضیغم ہے اب وہ مثل و ثل کا جھگڑا جاتا رہا۔ ضیغم کہہ دیا تو یہ استعارہ ہو گیا۔ رسول بھی اگر کہتے کہ مثل شہدا ہے تو تشبیہہ ہوتی۔ چونکہ رسول نے بغیر حرف تشبیہہ کے کہہ دیا کہ جو محبتِ آلِ رسول میں گیا وہ شہید ہے تو یہ استعارہ ہے۔ جب استعارہ ہے تو اس میں کوئی بات جو اس میں ہو وہ ہونا چاہیئے تب استعارہ درست ہوگا اب وہ خصوصیت شہدا کی جواز رُوئے قرآن ہے وہ حیات جاودانی ہے مطلب یہ کہ جو آلِ رسولؐ کی محبت میں گیا اُسے بھی مُردہ نہ سمجھو۔ جس طرح شہدا زندہ جاوید ہیں۔ اسی طرح یہ بھی زندہ جاوید ہیں۔ اور اگر صحیح محبّت ہے تو یہ زندگی جاوید بھی ایک اُصول شرعی و عقلی کے مطابق ہے اور وہ رسولؐ کا ارشاد ہے کہ الاعمال بنیات۔ اعمال نیتوں کے ساتھ ہیں۔ اگر محبت آل رسولؐ صحیح رکھے گا تو نیّت ہوگی کہ جب وقت پڑے گا تو میں اس راہ میں جان بھی دوں گا۔ اس کے معنی ہیں کہ ہر وقت شہادت کے لئے تیار بھی رہیگا۔ اب قِسمت سے شہید نہ ہوا تو اجرِ شہادت نہ مِلنا ظلم ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اُصول جو میں نے عقلاً رسول کی حدیث کی بنیاد پر عرض کیا اور میں نے کہا کہ عقلاً یہی ہے مقتضائے عدلِ الٰہی بھی یہی ہے۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کا ارشاد بھی ہے نہج البلاغہ میں ہے۔ جب جنگِ جمل ختم ہوئی تو آپ کے گرد و پیش جو اصحاب تھے

ان میں سے ایک دوست کا نام لیکر کسی نے کہا کہ کاش وہ بھائی ہمارا اس معرکہ میں ہمارے ساتھ ہوتا اور اس فتح کی مسرت میں وہ بھی شریک ہوتا تو بظاہر حضرت امیر المومنین اس شخص سے متعارف نہیں تھے جس کا نام اس نے لیا کاش ہمارا وہ بھائی بھی ہوتا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس بھائی کا تم نام لے رہے ہو کیا اسکی محبّت ہمارے ساتھ ہے اس نے کہا بے شک وہ بھی آپ کے دوستوں میں سے ہے۔ جب یہ پوچھ لیا کہ اسکو واقعی محبّت ہمارے ساتھ ہے تو ارشاد فرمایا کہ یقین جانو کہ ہمارے ساتھ وہ اس معرکہ میں شریک ہے وہ غائب نہیں ہے وہ حاضر ہے۔ ارے وہ تو اس وقت موجود ہے اگر اس کے جذبات محبّت ہمارے ساتھ ہیں تو وہ ہمارے ساتھ شریک ہے اس معرکہ میں اور اسکا کیا ذکر ہمارے ساتھ اس معرکہ میں بہت مردان روزگار ہیں کہ جو ابھی اپنے آباؤ اجداد کے صلب میں ہیں اور اپنی ماؤں کے شکم میں ہیں جنکو زمانہ بعد میں نمایاں کرے گا اور ان کے ذریعہ سے ایمان کو قوت حاصل ہو گی۔ یہی ہم کو اُصول بتایا گیا تھا۔ اسی مقصد کا حاصل کرنا تھا کہ کہا گیا ہے کہ کہو یا لیتنا کنا معکم فنفوزَ فوزًا عظیمًا۔ جب واقعہ کربلا یاد آئے تو تم یہ کہو کہ کاش ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے اور اس عظیم کامیابی کو حاصل کرتے۔ یہ کاش ہم ہوتے اس کے معنی ہیں مقصد میں اظہار وحدت۔ کہ جو شہدائے کربلا کا مقصد تھا اس مقصد میں ہم شریک ہیں اس کے معنی ہیں اظہار عزم کہ ہم تھے نہیں اس وقت مگر ہوتے تو وہی کرتے جو مجاہدینِ کربلا نے کیا۔ تو اب ہمارے مولا علی ابن ابی طالب نے جنگ جمل کے موقع پر اصول بتا دیا۔ اس اُصول کے ماتحت کربلا میں وہی فقط بہتّر نہیں تھے بلکہ جو جو بعد میں جذبات نصرُت دین میں شریک ہوں ان کے ساتھ۔ قیامت تک جو بھی گویا صدائے ھل من ناصرٍ پر اپنے اپنے طرز پر لبیک کہتے رہے۔

وہ سب اجرِ شہادت میں ان کے ساتھ شریک تھے جو کربلا والے تھے اور یہی تمنائے بے قرار ہے جسکی بنیاد پر ہم اور آپ روتے ہیں لوگ کہتے ہیں یہ رونا تو بزدلی ہوتی ہے اس کے جواب میں مَیں یہ کہا کرتا ہوں کہ سمجھ کر بات کیجئے کسی معرکہ میں شریک ہونے پر وہاں موجود رہ کر رونا خلاف شجاعت ہے اور وہ بزدلی ہے لیکن کسی معرکے میں شریک نہ ہونے پر رونا یہ عین شجاعت ہے۔ ہم زیر رایت ابوالفضل العباس ہوتے تو نہ روتے۔ اگر کربلا میں ہوتے تو نہ روتے کربلا کے مجاہدین رو نہیں رہے تھے۔ ہمیں جو وہ دن نصیب نہیں ہوا تو یہ رونا ہے یہ رونا اس تمنا کا اظہار ہے کہ آج ہم آنسو بہا رہے ہیں اُس وقت ہوتے تو خون بہاتے اپنا۔ اپنا خوں اس راہ میں نثار کرتے۔ اب وہ سوال کہ اتنی مدت تک چودہ سو برس گزر گئے کہاں تک روؤگے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال سے تو میری رگِ دل کٹ جاتی ہے۔ اتنی مدت کے بعد اب تک کیوں رو رہے ہو۔ میں کہتا ہوں جنہیں بر وقت رونے کا حق تھا انہیں رو لینے دیا ہوتا تو شاید گریہ اب تک قائم نہ رہتا لیکن جنہیں رونے کا حق تھا انہیں رونے کب دیا۔ ہمارے امام کو رونے والوں کی کمی نہیں تھی۔ زینب اور اُمِ کلثوم ایسی بہنیں سکینہ اور فاطمہ ایسی بیٹیاں۔ لیلیٰ اور رباب ایسی بیویاں۔ سیّد سجاد ایسا فرزند۔ رونے والوں کی کوئی کمی تھوڑی تھی مگر رونے کا موقع کہاں ملا۔ ادھر وارث کی خبر آئی ادھر اشقیا آگ لیکر خیموں کے پاس آپہنچے۔ وہاں تو اپنے پردے کے سلسلہ میں جہاد ہونے لگا۔ رونے کا وقت کہاں تھا۔ کربلا میں پیاسے کون سب سے زیادہ تھے جو زیادہ وقت تک رہے وہ زیادہ پیاسے رہے اس لئے بہتّر سب پیاسے تھے مگر مرثیہ جب پڑھا گیا حسینؑ کی پیاس کا۔ زینب نے کہا تو یہ کہ میرا بھائی پیاسا تھا سیّد سجاد نے بھی کہا میرا باپ پیاسا رہا۔ رباب نے بھی یہی سوال

کیا کہ میرے وارث کو پانی بھی ملا۔ مگر مولا کی بھی حدّ عطش عصر عاشورہ۔ عصر عاشورہ کے بعد مولا کی عطش ختم ہو گئی۔ وہی جس کے بعد ہم لوگ فاقہ شکنی کر لیتے ہیں اور خدا کی قسم شرع کے دباؤ سے کرتے ہیں کیونکہ ان لوگوں نے منّتی روزے رکھے تھے اس لئے ہمیں تاکید کی گئی کہ اس وقت کچھ کھالو تاکہ ان کے عمل سے شباہت پیدا نہ ہو۔ ورنہ ہم کوئی خوشی سے کھاتے ہیں۔ اُسوقت کوئی خوشی سے پانی پیتے ہیں جب جانتے ہیں کہ اسوقت وہاں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ خدا کی قسم یہ ان کے عمل سے شباہت سے بچنے کے لئے کلیجے پر پتھر رکھ کر پانی پیتے ہیں۔ کلیجے پر پتھر رکھ کر کچھ غذا کھاتے ہیں۔ تو حضور مولا کی حدِّ عطش عصر عاشورہ لیکن اہلِ حرم کب تک پیاسے رہے۔ امام کی حدِ عطش میں نے بتا دی۔ زینب کی حدِ عطش کیا بتاؤں کہ زینب کب تک پیاسی رہی۔

البلاغ المبین حصہ اول معہ حصہ سوم

مصنفہ :- آغا محمد سلطان مرزا ایم-اے- ریٹائرڈ سیشن جج مرحوم و مغفور۔
مؤلف ممدوح نے اسمیں کئی جگہ اضافہ کیا ہے۔ نہایت دلچسپ کتاب ہے۔

نوٹ :- "کتاب البلاغ المبین حصہ اول معہ حصہ سوم" خریدتے وقت امامیہ کتب خانہ لاہور کی مطبوعہ خریدیں کیونکہ یہ ایڈیشن ہر لحاظ سے بہتر ہے آفسٹ چھپائی۔ کتابت بہترین سائز ۶½" × ۱۰" حجم ۸۸۰ صفحات۔ سفید کاغذ مجلد ولایتی ڈائی دار پائیدار روپے خرچہ ڈاک بذمہ خریدار ہو گا۔

مقام اہلبیت معہ اضافہ

مجموعہ تقاریر ثقۃ الاسلام علامہ الحاج محمد بشیر صاحب قبلہ انصاری

اس میں دس بصیرت افروز مجالس درج ہیں کتابت وطباعت و کاغذ سفید عمدہ رنگین سرورق۔ ہدیہ

عظمت اہلبیت معہ اضافہ

مجموعہ تقاریر ثقۃ الاسلام علامہ الحاج محمد بشیر صاحب قبلہ انصاری

اس میں دس بصیرت افروز مجالس درج ہیں۔ کتابت وطباعت و کاغذ سفید عمدہ۔ رنگین سرورق۔ ہدیہ

ملنے کا پتہ :- **امامیہ کتب خانہ۔ مغل حویلی۔ اندرون موچی دروازہ لاہور**